قومی اردو کونسل کا بین الاقوامی جریدہ

www.urducouncil.nic.in

فروری 2023 قیمت 15 ₹

ماہنامہ

اردو دنیا

نئی دہلی

Monthly **URDU DUNIYA**, New Delhi

عشق کتابوں سے

ادب اطفال کی دنیا میں اہم ترین سنگ میل

قومی اردو کونسل کی فخریہ پیش کش

ماہنامہ
بچوں کی دنیا
دہلی
Monthly BACCHON KI DUNIYA, New Delhi

پیاری پیاری نظمیں
دلچسپ کہانیاں
سائنس و ٹیکنالوجی

معلوماتی مضامین
صحتِ اطفال
بچوں کا کتب خانہ

ان کے علاوہ:

کہکشاں ◆ زبان شناسی
میرا بچپن ◆ بچوں کے بڑے ادیب
بچوں کی پینٹنگ ◆ ڈاک خانہ جیسے مستقل کالم

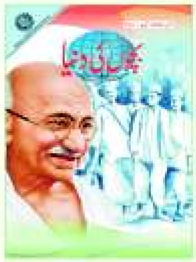

اور بہت کچھ

سب سے زیادہ چھپنے والا بچوں کا اردو رسالہ

قیمت فی شمارہ: 10 روپے   سالانہ: 100 روپے

سالانہ خریداری اور ایجنسی کے لیے رابطہ فرمائیں

زرِتعاون سالانہ 100 روپے بنام NCPUL اکاؤنٹ نمبر: 90092010045326 A/C: ، IFSC: CNRB0019009 میں جمع کریں۔

شعبۂ فروخت: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، ویسٹ بلاک 8، وِنگ 7، آر کے پورم، نئی دہلی-110066

فون: 011-26109746، فیکس: 011-26108159، E-mail: magazines@ncpul.in

شاخ: 110-7-22، تھرڈ فلور، ساجد یار جنگ کمپلیکس بلاک نمبر 5-1، پتھر گٹی، حیدرآباد-500002 فون: 040 - 24415194

ماہنامہ

اردو دنیا

دہلی

Monthly URDU DUNIYA, New Delhi

قومی اردو کونسل کا بین الاقوامی جریدہ

جلد:25، شمارہ:2، فروری 2023

مدیر : ڈاکٹر شیخ عقیل احمد

مشیر : حقانی القاسمی

معاونین : عبدالرشید اعظمی، نایاب حسن

ناشر اور طابع

ڈائرکٹر، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان

وزارتِ تعلیم، محکمۂ اعلیٰ تعلیم، حکومتِ ہند

مطبع:

ایس نارائن اینڈ سنز، بی۔88، اوکھلا انڈسٹریل ایریا

فیز-II، نئی دہلی-110020

مقامِ اشاعت: دفتر قومی اردو کونسل

کمپوزنگ: محمد اکرام

ڈیزائننگ: محمد زید

قیمت -/15 روپے سالانہ -/150 روپے

Total Pages:100

- اس شمارے کے قلم کاروں کی آرا سے قومی اردو کونسل NCPUL اور اس کے مدیر کا متفق ہونا ضروری نہیں
- ڈرافٹ NCPUL,New Delhi کے نام ارسال کریں

صدر دفتر

فروغ اردو بھون، ایف سی 33/9، انسٹی ٹیوشنل ایریا جسولہ، نئی دہلی-110025

فون:49539000 شعبۂ ادارت:49539009

ویب سائٹ

http://www.urducouncil.nic.in

E-mail: editor@ncpul.in

urduduniyancpul@yahoo.co.in

شعبۂ فروخت

ویسٹ بلاک-8، ونگ-7 آر کے پورم نئی دہلی۔110066

فون: 26109746، فیکس:26108159

ای میل: sales@ncpul.in

شاخ:110-7-22 تھرڈ فلور، ساجد یار جنگ کمپلکس

بلاک نمبر 5-1 پتھر گٹی، حیدر آباد۔500002

فون:040-24415194

مشمولات

اداریہ

ہماری بات 4

خطوط

ربط والتفات قارئین کے خطوط 5

جائزہ

2022 کا فکشن اور فکشن تنقید اسلم جمشید پوری 8

ادب: زاویے اور جہات

کلامِ غالب میں متعلق فعل/ تمیز کا استعمال سید یحییٰ نشیط 14

پریم چند کے انٹرویو: ایک مطالعہ منی بھوشن کمار 17

اردو میں تحشیہ و تعلیق: مسائل اور حل شاداب شمیم 23

اکبرالہ آبادی: رباعی گو درویش سعدیہ صدف 27

زبان اور زمینی صورت حال

وراثت کا تحفظ زندہ قوم کی شناخت ہے اعجاز رسول 30

یاد رفتگاں

ممتاز احمد خاں کا تنقیدی اختصاص افشاں بانو 32

سید الظفر چغتائی جعدیہ اجد 34

فکشن کے رنگ

مرزا رسوا کے ناول امراؤ جان ادا کے نسوانی کردار محمد توحید خان 38

ناول 'امراؤ جان ادا' ثقافتی بیانیہ کے تناظر میں جاوید احمد نجار 41

ناول میں کردار نگاری محمد طارق 43

اردو افسانوں میں ہجرت، تنہائی اور قدروں کی شکست و ریخت رضوان احمد 46

اردو اور سائنس

اردو میں سائنسی اور ساجی علوم کے فروغ کی روایت ابوبکر عباد 49

غیر مسلموں کی اردو سائنسی خدمات عبدالودود انصاری 52

لعل و گہر

فضل الرحمن: شخص اور شاعر رفیعہ سلیم 56

عبید صدیقی کی یاد میں محمد علم اللہ 60

شمائل شموئل

شموئل احمد کے افسانوں کا موضوعاتی حصار ریاض توحیدی 63

ایک نڈر افسانہ نگار شموئل احمد عبدالحی 65

شموئل احمد عظیم اللہ ہاشمی 67

کتابوں کی دنیا

تعارف و تبصرہ ادارہ 69

خبر نامہ

اردو دنیا کی خبریں ادارہ 79

ہماری بات

زبان یعنی قوت گویائی انسان اور حیوان کے درمیان ایک خط امتیاز ہے۔ انسان کو حیوانِ ناطق اس لیے کہا جاتا ہے کہ انسانوں کو اپنے جذبات، احساسات، مشاہدات اور تجربات کے اظہار کے لیے ایک زبان ودیعت کی گئی ہے اور یہ زبان بھی مختلف صورتوں اور شکلوں میں ہے۔ دنیا کے تمام ممالک کی زبان ایک جیسی نہیں ہے۔ زبانوں کا اختلاف دراصل الگ الگ اقوام کی شناخت کا ایک اہم جز ہے اور زبانوں کے تنوع کا اشاریہ بھی۔ اگر ایک جیسی زبان پوری دنیا میں بولی جاتی تو شاید لوگوں کو بھی زبان کی یک رنگی سے وحشت ہونے لگتی۔

دنیا کی پہلی زبان کون سی تھی اور زبان اب تک زندہ ہے یا نہیں۔ اس تعلق سے ماہرین لسانیات ہی کچھ کہہ سکتے ہیں، لیکن یہ حقیقت ہے کہ پہلی زبان ہی سے ساری زبانیں وجود میں آئیں۔ زبانوں نے تشکیلی اور ارتقائی مرحلے طے کیے اور مختلف صورتوں میں اب یہ زبانیں پوری دنیا میں موجود ہیں۔

قدیم زمانے میں جو زبانیں تھیں موجودہ عہد میں وہ زبانیں شاید کم استعمال میں آتی ہیں یا اب صرف تحقیق کا موضوع بن کر رہ گئی ہیں۔ لیکن یہ طے ہے کہ اگر یہ زبانیں نہ ہوتیں تو شاید ہمارے لیے تہذیب کا اتنا طویل سفر طے کرنا ممکن نہ ہوتا۔ زبانوں ہی کے ذریعے مختلف تہذیبوں اور ثقافتوں سے آشنائی کی صورت نکلی۔ یہی وجہ ہے کہ پرانے زمانے میں الگ الگ زبانوں کے علمی اور ادبی سرمایے کو اپنی اپنی زبانوں میں منتقل کرنے کی کوششیں کی گئیں اور اس طرح الگ الگ ممالک کے درمیان تہذیبی اور ثقافتی اشتراک، ترابط اور تفاہم کی ایک شکل سامنے آئی۔

مختلف قوموں کی الگ الگ زبانیں اور اظہار کے اسالیب ہیں اور ان زبانوں میں علوم وفنون کا قیمتی سرمایہ ہے۔ ہم ترجمے کے ذریعے ہی ان زبانوں کے ثقافتی و علمی سرمایے سے فیض حاصل کرپاتے ہیں۔ اگر صرف ایک ہی زبان ہوتی تو شاید ترجمے کا وجود نہ ہوتا اور مختلف اسالیب اور اظہارات وجود میں نہ آتے۔ زبانوں کی کثرت ہمارے لیے ایک نعمت ہے اور ہمیں اس نعمت کی قدر کرنی چاہیے اور دنیا کی تمام زبانوں کا احترام بھی کہ زبانیں مکالمے کا ذریعہ ہوتی ہیں۔ زبانوں کی بنیاد پر جنگیں بے معنی ہیں کیونکہ زبان صرف اظہار کا ایک ذریعہ ہے اور کوئی ضروری نہیں کہ ہر قوم اور ملک کا ذریعہ اظہار ایک ہی ہو۔ بہر حال زبان کوئی بھی ہو اس سے ہماری تہذیب وثقافت میں گراں قدر اضافہ ہوا ہے، خاص طور پر ترقی یافتہ عالمی زبانوں میں بیش بہا علمی اور ادبی سرمایہ ہے۔ اس لیے کسی بھی زبان کی اہمیت ومعنویت سے انکار نہیں کیا جانا چاہیے۔ تاہم ہماری تاریخ، تہذیب وثقافت جس زبان میں محفوظ ہے اس کی بقا اور تحفظ کے لیے بھی کوشاں رہنا چاہیے، چونکہ اپنی ثقافت، تاریخ اور تہذیب سے آشنائی کا ایک ذریعہ وہی زبان ہے جس میں ہم لکھتے، بولتے اور پڑھتے ہیں۔

آج کے عہد میں مادری زبان کی اہمیت یوں بھی بڑھ گئی ہے کہ ہم مادری زبان کے ذریعے ہی اپنے روشن ثقافتی، تہذیبی، تمدنی اور تاریخی آثار ونشانات اور علامات سے روشناس ہوپاتے ہیں۔ اگر ہم مادری زبان سے رشتہ نہیں رکھیں گے تو ہمارے لیے تفہیم واظہار کی بہت سی راہیں مسدود ہوجائیں گی، اسی لیے کہا جاتا ہے کہ مادری زبان میں سائنسی، طبی اور دیگر علوم کے تراجم کیے جائیں تاکہ ہماری راہ میں زبان کی دیوار حائل نہ ہو۔ حکومت بھی مادری زبان پر زیادہ توجہ اس لیے مرکوز کررہی ہے کہ علوم وفنون کی تحصیل میں جو رکاوٹیں ہیں وہ دور ہوجائیں۔ ہمیں اپنی مادری زبان کے تحفظ اور بقا کے لیے کوشاں رہنا چاہیے کیونکہ یہی زبان ہمیں زمین سے آسماں تک کی بلندی کا سفر طے کرانے میں مددگار ثابت ہوگی۔

شیخ عقیل احمد

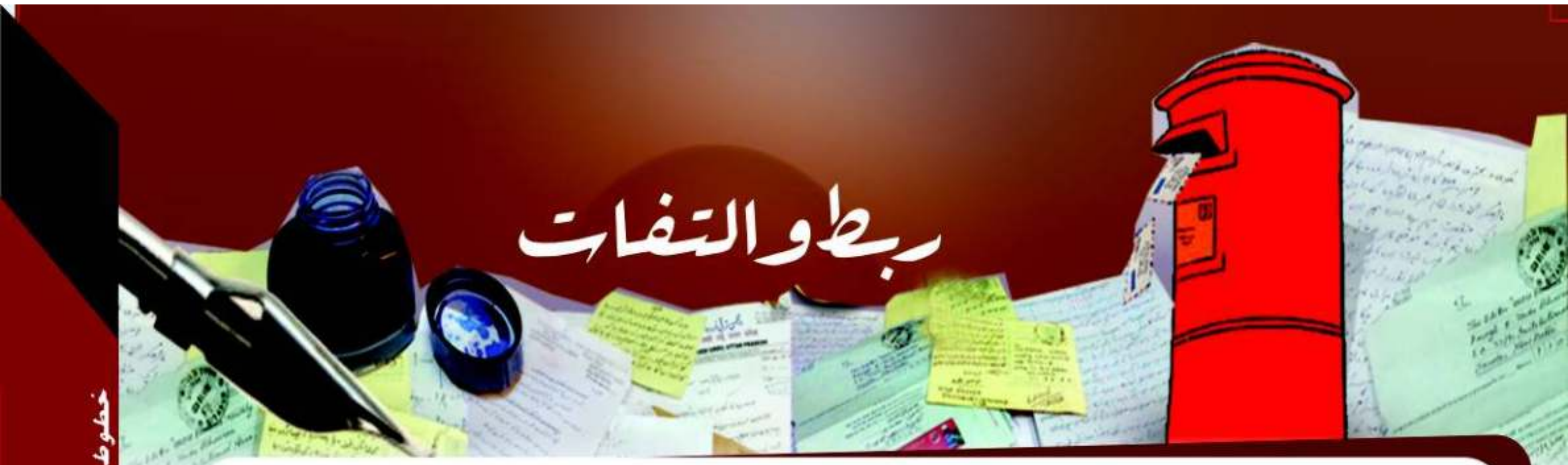

ربط والتفات

خطوط

ماهنامه 'اردو دنیا' میں 'ربط والتفات' کے تحت قارئین کے خطوط شائع کرنے کا مقصد یه نهیں هوتا که محض ستائشی اور تحسینی کلمات لکھے جائیں بلکه رسالے کے مشمولات کے حوالے سے نئے مباحث پر گفتگو کو آگے بڑھانا هوتا هے۔ ماضی میں مکتوبات بهت سے مضامین سے بهی زیاده بیش قیمت هوتے تھے که ان میں مشموله مضامین کے تعلق سے نئے نکات و مباحث کی نشاندهی کی جاتی تهی۔

قارئین سے گذارش هے که ماهنامه 'اردودنیا' کے مشمولات کے حوالے سے بحث انگیز خطوط ارسال کریں اور ان نئے موضوعات، عنوانات، شخصیات اور علاقوں کی نشاندهی کریں جنهیں نظرانداز کیا جاتا رها هے۔ آپ کے خطوط همارے لیے بهت اهمیت کے حامل هوتے هیں، ان سے همیں رسالے کو خوب سے خوب تر بنانے میں مدد ملتی هے۔ (اداره)

'اردو دنیا' کا شمارہ بروقت ہم دست ہوا، ہر ماہ کی 31-30 کو تازہ شمارہ مل جاتا ہے۔ بہت خوشی ہوتی ہے اس رسالے کو پڑھنے کے عادی ہوگئے ہیں۔ ذوق وشوق سے پڑھتے ہیں۔ سرورق پر وانمباڑی میں منعقد کتاب میلے کی نیوز ہے۔ تمل ناڈو کا وانمباڑی ادب شناس شہر ہے۔ داغ کا مصرعے ہندوستان میں دھوم ہماری زباں کی ہے ہونا بھی چاہیے کیونکہ اردو ہندوستان کی زبان ہے۔ 'ہماری بات' میں مدیر نے اردو زبان و ادب میں تجربوں کی بات کی ہے۔ ماضی میں تجربہ و تحریکات چلے، آج کل کوئی تحریک تجربہ نہیں ہورہا ہے۔ دراصل ذہن اختراعی ہونا چاہیے، تخلیقی ذہن میں فروغ و ارتقا ناگزیر ہے۔

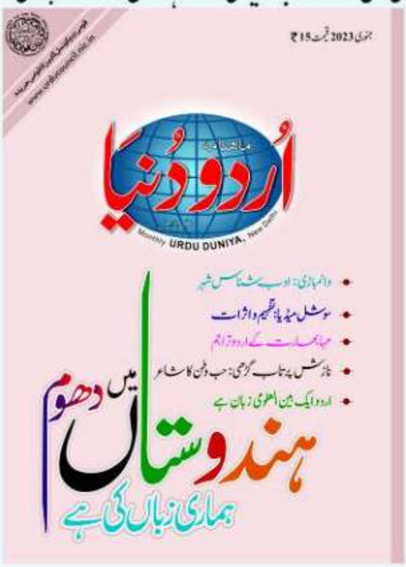

اس لیے نئی رجحانات نظریات ادب میں ناپید ہوگئے ہیں، ماضی میں ادبی نظریات نے مثبت قدریں عطا کی ہیں ان کے اشعار بیانات قول فیصل کی طرح معروف ہوئے لیکن 21ویں صدی کا اردو ادب اس سے مبرا ہے۔ ہر شمارے کے ذیلی عنوانات الگ الگ دیے جارہے ہیں یہ بھی ایک اختراعی قوت کا نام ہے۔ خطوط کا کالم مواد کے حسن وقبح کو پیش کرتا ہے اور مشمولات کے تعین قدر کا ذریعہ ہے۔ شاعری کیا ہے، سید نفیس دسنوی نے لکھا ہے جس میں شاعری کی تعریف وزن، اصول، تقاضوں کو اچھے انداز میں پیش کیا ہے۔ محمد اسلم پرویز 'شمس الرحمٰن فاروقی کی روایت پسندی' میں لکھتے ہیں ''شمس الرحمٰن فاروقی نے عروض آہنگ اور بیان میں کئی مقامات پر شعر کی خوبی اور خامی پر سیر حاصل بحث کی ہے اور قابل قدر نتائج برآمد کیے ہیں۔ مثلاً تکرار، تنافر، عجز بیان، تعقید اور اشکال وغیرہ سے متعلق انتہائی کارآمد مواد ان کتابوں میں موجود ہے۔'' راشد میاں نے 'برجستہ گوئی اور فن اصلاح شعر کا ماہر: سید محمود الحسن صولت کی غزلوں کا تنقیدی تجزیہ بہتر انداز میں کیا ہے۔ شاکر علی صدیقی کا مضمون 'میر غلام نازکی کی ایک غزل دو قرأت' عمدہ مضمون ہے۔ محمد حسین نے 'اردو شاعرات کی نظموں میں اساطیری کردار' کے حوالہ سے اچھی گفتگو کی ہے۔ ان کے علاوہ دیگر مضامین بھی پڑھنے سے تعلق رکھتے ہیں۔

ڈاکٹر محمد ناظم علی: مکان نمبر 335-7-17، برہمن واڑی، یاقوت پورہ، حیدرآباد، تلنگانہ

اردو دنیا کا ہر شمارہ کسی نہ کسی تھیم پر مبنی ہوتا ہے اس مرتبہ رسالہ جیسے ہی نظر سے گزرا تو پہلی نظر میں کسی تھیمیٹکل تصویر نہ ہونے سے کچھ عجیب سا لگا لیکن جلی حرفوں میں ہندوستان کی موجودگی نے سب کچھ ظاہر کردیا جو بہت ہی خوبصورت لگا، ساتھ ہی رسالے کے کلیدی مضامین کے عناوین کو سرورق میں خوبصورتی سے پیش کرنا بھی خوبصورت لگا۔ بعدہ اداریے پر نظر ڈالی تو اس میں سال گزشتہ کی روداد ادب اور مستقبل کے امکانات کی جانب اشارہ تھا جس میں جہاں زبان سمٹ رہی ہے وہاں پر حرکت میں لانے کی بات ہوئی تو اس کا اثر سامنے تھا کہ کونسل کے ذریعے اسی مہینے میں تمل ناڈو کے دور افتادہ شہر وانم باڑی میں کتاب میلے کا انعقاد کیا گیا۔ رسالے میں اس شہر کے علمی و ادبی ماحول پر بھی معلومات سے بھرپور مضمون پڑھنے کو ملا۔ ادب زاویے میں سید نفیس دسنوی کا مضمون 'شاعری کیا ہے؟' جب پڑھنا شروع کیا تو محسوس کیا کہ شاید فاروقی صاحب کی بحث کو آگے بڑھائیں گے اور حتمی طور پر شاعری کی ایک جامع و مانع تعریف سامنے آجائے گی لیکن آخر تک نظریات وخیالات کے دریا میں بہتے رہے اور بطور مثال ایک شعر بھی پڑھنے کو نہیں ملا۔ اردو دنیا کی نمایاں خصوصیات یہ ہیں کہ یہ اردو زبان کی ہمہ جہت نمائندگی کرتا ہے اور ہر فن پر عمدہ مضامین اور تحریریں پڑھنے کو مل جاتی ہیں اس کے لیے پوری ادارتی ٹیم کو مبارکباد۔

امیر حمزہ: نوادہ ہزاری باغ، جھارکھنڈ

✍ ’اُردو دنیا‘ برائے دسمبر 22 نظر نواز ہوا۔ پہلے کی طرح اس بار بھی سرورق نہایت متاثر کرنے والا ہے۔ ہر زبان میں حروف کی بڑی اہمیت ہے۔ اس طرح اسے ایک عمدہ انداز میں دکھا کر قارئین کو راغب کیا گیا جو ذہن میں فکر پیدا کرتا ہے۔ اداریہ بھی اچھا ہے اور زبان کی اہمیت کے ساتھ بہت کچھ کرنے کے لیے متوجہ کرتا ہے۔ اس زبان کے کئی میدانوں میں کچھ کرنے کا حوصلہ پیدا ہوتا ہے۔ اردو زبان ایک عالمی زبان ہے جو دن بہ دن عوام کے دلوں میں جگہ بناتی جا رہی ہے اور اپنی شیرینی سے اردو عوام کو راغب کرتی ہے۔ اس شمارے کا ایک مضمون جسے محمد موسیٰ رضا نے تحریر فرمایا ہے، کئی نقطۂ نظر سے اہمیت کا حامل ہے۔ اس مضمون میں عالمی شخصیت پروفیسر گوپی چند نارنگ کی شخصیت اور کارہائے نمایاں کو گہرائی کے ساتھ بیان کیا گیا ہے۔

جو تقریباً پانچ دہائی سے کچھ کم عرصے تک اردو زبان کو مقبول بنانے اور اس کے تخلیقی نکتوں کو نمایاں کرنے میں مصروف رہے ہیں۔ جہاں تک مجھے یاد آتا ہے، نارنگ صاحب سے میری پہلی ملاقات 1980 میں این سی ای آر ٹی کی ایک میٹنگ میں ہوئی تھی۔ اس وقت وہاں صابرین صاحب بطور کنوینز اردو نصابی کمیٹی میں تھے نارنگ صاحب اور شمیم حنفی صاحب بھی موجود تھے۔ اس وقت بھی اردو زبان کے نصابی کاموں کو وہ بڑی گہرائی سے کرتے تھے جو عمر کے آخر تک کرتے رہے۔ ان میں غصے کا اظہار بہت کم ہوتا تھا۔ یہاں مضمون میں موسیٰ رضا نے بڑے ہی متاثر کن انداز میں ان کی والہانہ محبت کو بڑے اچھے انداز میں بیان کیا ہے جسے پڑھنے کے بعد قاری کو اپنی زندگی میں بہت کچھ سیکھنے کا موقع ملتا ہے۔ ہندی کے معروف مصنف جناب کملیشور نے نارنگ کی 75 ویں سالگرہ کی تقریب میں کہا تھا ”بھارت کی تخلیقی اور ثقافتی آتما کو زندہ رکھنے کے لیے ہر زبان کو ایک ڈاکٹر نارنگ کی ضرورت ہے۔“ ان کا یہ جملہ تاریخی نوعیت کا حامل ہے۔ اس میں شک نہیں کہ موجودہ دور کے لکھنے والوں میں ان کا شمار اول صف میں ہوتا ہے۔ موسیٰ رضا لکھتے ہیں ”ان کا مطالعہ نہایت گہرا تھا، خدا نے ان کو بڑی صلاحیتوں سے نوازا تھا۔“ وہ کام کو بڑے قرینے سے کرتے تھے۔ عمر کے آخری دنوں میں بھی علمی مصروفیات کو ترجیح دی، اپنی رہنے کی کوٹھی بنوائی، یہ کام آسان نہ تھا۔ ان کی بیگم مسز منورما نارنگ بہت نیک دل اور خوش مزاج خاتون ہیں اور دہلی یونیورسٹی میں استاد رہی ہیں اور گھریلو خدمات بھی خوب نبھائی ہیں۔ نارنگ صاحب کی خوبیوں کا سارا اردو حلقہ خاص طور پر قائل تھا۔ وہ ایک اچھے مقرر تھے جس کو سننے کے لیے اردو قارئین کا مجمع پوری طرح خاموشی سے سنتا تھا۔“ اس مضمون میں موسیٰ رضا نے پروفیسر شمس الرحمٰن فاروقی اور پروفیسر شمیم حنفی سے ان کے رشتے کی وضاحت کی ہے۔ منورما جی نے یہ انکشاف کیا تھا کہ 80 کی دہائی میں فاروقی صاحب نارنگ صاحب کے گھر آیا کرتے تھے۔ ان کی دوستی مثالی تھی۔ اس کے بعد کچھ ادبی اختلافات نے ان کے درمیان دوری پیدا کردی۔ یہاں یہ ذکر بھی ضروری معلوم ہوتا ہے کہ فاروقی صاحب کو جب کووڈ ہوا تو روز ان کی خیریت معلوم کرنا نارنگ صاحب کا معمول بن گیا تھا پھر انتقال سے ان کو سخت صدمہ پہنچا۔ ان باتوں کو لوگوں نے مختلف انداز میں بیان کیا جب کہ حقیقت منورما جی نے بتائی۔ اس طرح یہ مضمون کئی باتوں کی نشاندہی کرتا ہے۔ نارنگ صاحب کی ایک عمر کو پہنچنے پر بھی دماغی یادداشت ہمیشہ تازہ رہی۔ وہ سمینار میں صدارت کر رہے ہیں لیکن ان کا دماغ اردو کے کسی نکتے کو سوچ رہا ہے، مجھے یاد آتا ہے کہ ساہتیہ اکادمی کے ایک اہم سمینار کے دوران اجلاس جاری تھا وہ بلند آواز میں بولے خلیل دیکھیے کیا حقانی آئے ہیں۔ میں نے برجستہ جواب دیا ڈاکٹر صاحب آئے ہیں پیچھے بیٹھے ہیں۔ ان کی مادری زبان اردو نہیں تھی لیکن وہ اردو سے بے حد محبت کرتے تھے، دنیا فانی ہے وہ ایسے سفر میں ہیں جہاں سے واپسی نہیں ہوتی لیکن ان کے کارہائے نمایاں ان کو ہمیشہ زندہ رکھیں گے۔ اس طرح موسیٰ رضا کا یہ مضمون ان کی خدمات، خلوص اور کئی غلط فہمیوں کی حقیقی تصویر پیش کرتا ہے جس کے لیے مضمون نگار کا مضمون اہمیت کا حامل قرار دیا جاسکتا ہے۔

✍ **محمد خلیل**: سابق مدیر ’سائنس کی دنیا‘، نئی دہلی

✍ دسمبر ماہ کا شمارہ اردو زبان کے حروف سے آراستہ سرورق نیز بلند پایہ مشمولات پر مبنی موصول ہوا ہے۔

اس میں خدائے سخن میر تقی میر کی شاعری پر جناب امام اعظم کا مضمون نہایت بلند ہے۔ اس میں میر کی محاورہ دانی (مثلاً ”دونوں ہاتھوں سے تھامیے دستار....“)، تشبیہات (’پنکھڑی اِک گلاب کی سی ہے‘)، انسان کی عظمت اور برتری (.....’تب خاک کے پردے سے انسان نکلتے ہیں‘) اور ہندوستان کی تاریخ کے ایک واقعے کی یاد دہانی کرانے (’ہنوز دلی دُور است‘) وغیرہ کے استعمال سے اردو شاعری کا ایک قابلِ تقلید پیمانہ پیش کیا گیا ہے۔ میر کی شاعری علامہ اقبال کے اس شعر پر بھی کاملاً اُترتی ہے۔ ”دل سے جو بات نکلتی ہے، اثر رکھتی ہے، پَر نہیں طاقتِ پرواز مگر رکھتی ہے‘ کلیاتِ اقبال، ص 199)۔ ص 12 پر ’فعل ’ڈوبا‘ کی بجائے فعل ’ڈوبے‘ لفظ کا تصرف درکار تھا۔

جناب محمد صالح انصاری نے عربی، فارسی اور اردو زبان کے تحت استادی و شاگردی کی قدیم روایت کو بخوبی نشان زد کیا ہے۔ اس میں اشعار کی فکری، فنی اور لسانی اصلاح کے ساتھ ہی شعری زبان کے اِن دونوں طریقوں کا مکمل تاریخی جائزہ لیا گیا ہے۔

ہندی زبان میں ایک صدی قبل بنارس کے معروف پبلشر بھارتیہ گیان پیٹھ سے شری ایودھیا پرساد گویلیئ کی کتاب ’استادانہ کمال‘ شائع ہو کر مقبول ہوئی تھی اور تاحال قابلِ مطالعہ رہی ہے۔ اس میں بھی استادوں کے ذریعے شاگردوں کی شعری زبان اور فنی اور لسانی اصلاح محاکمہ کرتے ہوئے اردو اشعار بھی درج کیے گئے تھے۔

اسی شمارے میں محترمہ درخشاں زریں کے مضمون ’گوپی چند نارنگ کا لسانی ولسانیاتی شعور‘ میں نارنگ صاحب کی تحقیقی و ادبی خدمات کا جائزہ لیا گیا ہے۔ محترمہ درخشاں زریں نے نارنگ صاحب کے مضمون ’اردو اور ہندی کا رشتہ‘ کے تحت ان کے یہ جذبات صحیح رقم کیے ہیں کہ ”صوتیاتی صرفی، نحوی اور ساختیاتی تمام سطحوں پر... ان دونوں کے ضمائر، امدادی افعال، حرفِ جار، گنتیاں اوقاتِ صبح و شام، رشتہ داریاں وغیرہ سب نوے فی صد ایک ہیں۔“

اس سے آگے نارنگ صاحب کے اس نتیجے سے یہ خاکسار قطعی متفق نہیں ہے کہ اردو زبان سنسکرت زبان کے بعد آنے والی پراکرتوں والی زبان سے اپنی لفظیات حاصل کرتی ہے۔“ دراصل، پراکرتوں سے ہندی زبان نے تو ضرور لفظیات حاصل کی ہے، لیکن اردو زبان سے ان زبانوں کا تعلق ہرگز نہیں رہا ہے، اگر زیادہ تعلق کی بات کریں تو فارسی اور عربی زبانوں کا اردو زبان سے بہت زیادہ تعلق رہا ہے۔

✍ **ڈاکٹر کرشن بھاؤک**: کوٹھی نمبر A-201، گورونانک نگر، گلی نمبر K-18، A-201، پٹیالہ (پنجاب)

ماہنامہ اردو دنیا کے کالم 'زبان اور زمینی صورت حال' کے لیے سوال نامہ

ماہنامہ 'اردو دنیا' میں مشاہیر ادب کے انٹرویوز شائع کیے جاتے تھے، یہ ایک مقبول کالم تھا۔ یہ کالم ہنوز جاری ہے۔ بس اس کی شکل وصورت ذرا سی تبدیل کر دی گئی ہے تاکہ اردو کے تعلق سے غیر ضروری مباحث کے بجائے قارئین اردو زبان کی حقیقی صورت حال سے آگاہ ہوسکیں۔

- زبانوں کی موت کی وجوہات کیا ہیں؟
- زبانوں کو زندہ رکھنے کے لیے کون سا طریقہ کار اختیار کیا جانا چاہیے؟
- زبان کا تہذیب وثقافت سے کیسا رشتہ ہے؟
- کیا زبانوں کی موت سے انسانی وراثت کے تحفظ کا مسئلہ بھی جڑا ہوا ہے؟
- کیا کسی زبان میں خواندگی، سائنسی، سماجی مواد کی کمی سے زبان پر منفی اثرات پڑتے ہیں؟
- موجودہ حالات میں اردو زبان کو کس طرح کے خطرات لاحق ہیں؟
- اردو کا مستقبل کیا ہے؟
- زبان کی سطح پر جو بگاڑ پیدا ہو رہا ہے اس کو روکنے کے لیے کون سی ترکیبیں استعمال کی جاسکتی ہیں؟
- کیا اردو کے ادارے، تنظیمیں، زبان سے زیادہ ادب پر توجہ دے رہے ہیں اور زبان سے متعلق کتابوں کی اشاعت تقریباً رک سی گئی ہے؟
- کیا کلاسیکیت، جدیدیت وغیرہ پر گفتگو سے زبان کو کوئی فائدہ پہنچ سکتا ہے؟
- آپ کے علاقے میں کتنے اردو میڈیم اسکول ہیں اور ان میں اساتذہ کی کتنی تعداد ہے؟
- آپ کے علاقے میں کتنی لائبریریاں ہیں اور وہاں کون سے اخبارات اور رسائل آتے ہیں؟
- آپ کے علاقے میں کتنی اردو تنظیمیں، ادارے اور انجمنیں ہیں اور وہ کس نہج پر اردو کے فروغ کے لیے کام کر رہے ہیں؟
- آپ کے علاقے میں اردو سے جڑی ہوئی کتنی شخصیات ہیں جن کی خدمات کا اعتراف علاقائی، قومی سطح پر نہیں کیا گیا ہے؟
- آپ مقامی سطح پر اردو کے فروغ کے لیے کیا کوششیں کر رہے ہیں؟
- آپ کے ذہن میں فروغ اردو کے لیے کیا تجاویز اور مشورے ہیں؟
- اردو رسم الخط کی بقا کے لیے کیا کوششیں کی جاسکتی ہیں؟
- دوسری علاقائی زبانوں میں اردو کے فروغ کی کیا صورتیں ہوسکتی ہیں؟
- کیا آپ کے اہل خانہ اردو زبان لکھنا پڑھنا اور بولنا جانتے ہیں؟
- آپ کے بعد کیا آپ کے گھر میں اردو زندہ رہے گی؟
- غیر اردو حلقے میں فروغ اردو کے لیے کیا حکمت عملی اختیار کی جانی چاہیے؟
- آپ کے علاقے میں کتنے کالجز یا یونیورسٹیز ہیں جن میں اردو کی تعلیم دی جاتی ہے اور وہاں اردو پڑھنے والوں کی تعداد کتنی ہے؟
- ملکی سطح پر غیر سرکاری تنظیموں سے اردو کی ترویج واشاعت کے سلسلے میں کس طرح سے مدد لی جاسکتی ہے؟
- سینٹرل اسکولوں اور نوودے ودیالیہ میں اردو کی تعلیم کا کوئی معقول انتظام ہے؟

ماہنامہ 'اردو دنیا' میں اسی سوالنامے کی روشنی میں ان لوگوں کے انٹرویوز شائع کیے جائیں گے جو اردو زبان وادب سے جڑے ہوئے ہیں اور اردو کی خدمت کا بے پناہ جذبہ رکھتے ہیں مگر انھیں اپنے خیالات کے اظہار کا موقع نہیں ملتا۔ یہ سوالنامہ ہر اس فرد کے لیے ہے جو اردو کاز اور مشن سے جڑا ہوا ہے۔ اس سوالنامے کے ذریعے ہمیں اردو زبان کے تعلق سے حقیقی صورت حال کا علم ہوگا اور اسی کی روشنی میں فروغ اردو کے لیے ایک روڈ میپ تیار کیا جائے گا۔ اپنے جوابات کے ساتھ سوانحی کوائف مع تصویر درج ذیل ای میل آئی ڈی پر بھیجیں: editor@ncpul.in ➢ urduduniyancpul@yahoo.co.in ➢

اسلم جمشید پوری

2022 کا فکشن اور فکشن تنقید

وقت کا بہتا دریا کبھی رکتا نہیں۔ وقت کے دریا کی ایک اور بوند 2022 زمانے کے بیکراں سمندر میں سما گئی۔ پانی میں مل کر پانی، پانی ہو گیا۔ اب زمانے نامی سمندر میں ایک بوند پانی کو الگ کرنا کتنا مشکل ہے۔ لیکن کچھ واقعات وحادثات اور ادبی سرگرمیاں ایسی ہوتی ہیں، جن سے اس برس کی پہچان بہ آسانی ہو جاتی ہے۔ 2022 کی ادبی سرگرمیوں سے الگ شناخت قائم ہوتی ہے۔ اس برس کیسا فکشن شائع ہوا۔ یعنی کون کون سے نئے ناول منظر عام پر آئے۔ کن افسانوی مجموعوں نے دھوم مچائی۔ افسانچے، ڈرامانے کیا گل کھلائے۔ ناول، افسانے، افسانچے، ڈرامے کی تنقید نے کیا کیا رنگ دکھائے۔ کن سمیناروں اور ایوارڈز نے اپنے اثرات قائم کیے۔ کون سے ادیب، شاعر، صحافی ہم سے ہمیشہ کے لیے رخصت ہوئے۔ 2022 کا ایک مختصر عالمی جائزہ پیش ہے۔

نصف صدی کا قصہ: سید محمد اشرف کے افسانوں کا کلیات ہے، جسے کافی اہتمام سے عرشیہ پبلی کیشنز نے شائع کیا ہے۔ تقریباً 700 صفحات پر مشتمل اس کتاب میں سید محمد اشرف کے تمام افسانے شامل ہیں۔ سید محمد اشرف ہمارے عہد کے ان فکشن نگاروں میں ہیں، جنھوں نے اپنی تخلیقات سے اپنی الگ شناخت قائم کی ہے۔ 70 کے بعد کی نسل سے تعلق رکھنے والے سید محمد اشرف نے تہذیبی زوال اور مثبت قدروں کی پامالی کو بہتر طور پر اپنے افسانوں اور ناولوں میں پیش کیا ہے۔ انھوں نے اسلامی تہذیب کے نقوش، ماحولیات اور علامتوں کا ایسا نظام پیش کیا ہے جس کی تفہیم وترسیل آسانی سے عام قاری تک ہو جاتی ہے۔ پروفیسر نارنگ ان کی تحریر کے تعلق سے لکھتے ہیں:

”مجھے اپنی روح سے شرمندگی ہوگی اگر میں اس بات کا اعتراف واقرار نہ کروں کہ:

سید محمد اشرف کے پہلے افسانوی مجموعے 'ڈار سے بچھڑے' سے اردو افسانے کا ایک نیا پڑاؤ شروع ہوتا ہے۔ سید محمد اشرف کے یہاں واقعیت اور علامت کا ایسا امتزاج ملتا ہے، جس کی مثال نہیں ملتی۔ جب میں ان کی کہانیوں کو بار بار پڑھتا ہوں تو ان کا اسلوب، نثر، ساخت اور تھیم دیکھ کر معلوم ہوتا ہے کہ بات کہاں سے کہاں پہنچ رہی ہے۔“ (فلیپ کور، نصف صدی کا قصہ، سید محمد اشرف)

اس کتاب میں سید محمد اشرف کے 36 افسانے شامل ہیں، جو ان کے افسانوں کی کل کائنات ہے۔ یہ کتاب سید محمد اشرف پر کام کرنے والوں کے ساتھ ساتھ 70 کے بعد کے افسانے کے مزاج، علامتوں کے نظام اور بیانیہ کا افسانے میں استعمال پر تحقیقی کام کرنے والوں کے لیے اس کتاب کا مطالعہ ضرور کرنا چاہیے۔

معصوم خواهش: اشفاق برادر کے افسانوں کا تازہ مجموعہ ہے۔ اس سے قبل ان کے دو افسانوی مجموعے 'مٹی کی مہک' اور 'احساس میں پگھلتی برف' شائع ہو چکے ہیں۔ اشفاق برادر کے افسانے آج کے ماحول کے عکاس ہوتے ہیں۔ آس پاس کا ان کی نظر کافی باریک بینی سے جائزہ لیتی ہے۔ وہ معمولی اور سادہ سے واقعے سے بھی سنجیدہ کہانی بننے کے ہنر سے واقف ہیں۔ وہ لفظوں سے کھیلنا جانتے ہیں۔ اسی لیے ان کے افسانے ایک خاص قسم کا درد رکھتے ہیں۔

معصوم خواہش، اشفاق برادر کے 41 افسانوں کا مجموعہ ہے۔ اس میں ان کے کئی ایسے افسانے بھی شامل ہیں، جو بے حد جذباتی ہیں، جو ہماری دکھتی رگ پر ہاتھ رکھتے ہیں۔ ان کے منفرد افسانوں میں اشتہار، کرکس، مرہم کی تلاش، ہے بھگوان، شجر کے نام، انسان، درخت اور بستی، کالے چہرے، چاند میں دھبے، دن کا اجالا، معصوم خواہش، موم، قبریں، فاتح، شاید، میرا فیصلہ، حدیں نہیں توڑنا، گتھی، چمن، سیاست، خواب اور میں، وغیرہ کا شمار ہوتا ہے۔

تشبیه میں تقلیب کا بیانیه: نورین علی حق کا پہلا افسانوی مجموعہ ہے۔ نورین نوجوان افسانہ نگار ہیں اور ان کی نظر نئے معاملات پر بڑی گہری ہے۔ وہ صحافی بھی ہیں۔ ان کے پیروں میں چکر ہیں۔ وہ سماج کو بہت قریب سے دیکھتے ہیں۔ ایسے نوجوان کو اگر لکھنے کا سلیقہ آتا ہو، اسلوب میں تازگی ہو اور اس کے پاس حساس دل ہو تو وہ اچھے افسانے لکھ سکتا ہے اور یہ تمام خوبیاں نورین علی حق میں جمع ہو گئی ہیں۔ اسی باعث ان کے افسانوں میں ایک الگ قسم کا سوز وگداز ہے۔ ایک انفرادیت ہے جو انھیں ان کے معاصرین سے الگ کرتی ہے۔ ان کے ایک افسانے کا

اقتباس دیکھیں:

''فضا میں روحانیت کے ساتھ تپش کا احساس بھی ہو رہا ہے۔ بہت غور کرنے پر صرف 'لا' کی صدا سمجھ میں آرہی ہے۔ 'لا' کی صوتی تفہیم کے بعد منظر نامہ بدلتا جا رہا ہے۔ لیکن 'لا' کی تعبیر ممکن نہیں۔ 'لا' کے مسلسل اقرار سے شاید دنیا کے انکار کا امکان روشن ہو رہا ہے۔ اس کی ضربوں کی رفتار بڑھتی جارہی ہے۔ دل کی کیفیت بھی بدل رہی ہے''
(افسانہ، تشبیہ میں تقلیب کا بیانیہ، مجموعہ، تشبیہ میں تقلیب کا بیانیہ، نورین علی حق، ص 155)

آپ نے دیکھا افسانہ نگار نے کہانی کے بیان کے لیے، کیسا اسلوب اختیار کیا۔ یہ کتاب کا ٹائٹل افسانہ ہے۔ اس میں ایک مجذوب فقیر اور ہرن کا قصہ ہے۔ یہاں عرفانِ الٰہی کی بات ہے۔ تصوف کا بیان ہے۔ بہت دنوں بعد ایسی کہانی پڑھنے کو ملی ہے۔

نورین علی حق کے بہت سے افسانے گہرائی اور توجہ سے مطالعے کے متقاضی ہیں۔ ان افسانوں کا گہرا مطالعہ قاری پر بہت سے جہان روشن کرے گا۔ ان افسانوں میں ظاہر کے ساتھ ساتھ فرد کے باطن کا بھی علم ہوتا ہے۔ یہ افسانے جہاں سماج میں آرہی تبدیلیوں کو اپنے دامن میں سمیٹے ہوئے ہیں، وہیں انسان کی نفسیات کا بھی پتہ دیتے ہیں۔ قسطوں میں مرنے والے کا نوحہ، بوسیدہ حویلی میں رقص، بای ذنب قتلت، پنجرے میں قید نیند، ایک سہا ہوا آدمی، حسرتوں کے چراغ، شکار سے دو قدم آگے، سپیدیِ سحر نورین علی حق کے ایسے ہی افسانے ہیں، جو ہمیں غور و فکر کی دعوت دیتے ہیں۔

یہ سسکتے لوگ: ساوتری گوسوامی کا چوتھا افسانوی مجموعہ ہے۔ ساوتری گوسوامی آسٹریلیا میں تھیں۔ یہ سبھی مجموعے ان کے انتقال کے بعد نذیر فتح پوری نے اسباق پبلی کیشنز سے شائع کیے۔ ساوتری گوسوامی ساری زندگی اردو میں افسانے لکھتی رہیں۔

ساوتری گوسوامی کے افسانے معاشرتی افسانے ہیں۔ ان میں ہندوستان کے ماحول، پیار نفرت، بغض و عداوت، فرقہ پرستی کے ساتھ عورت کے ساتھ سماج کے سلوک کو پیش کیا گیا ہے۔ آسٹریلیا میں عورت کی آزادی، وہاں کا ماحول، تنہائی، اکیلاپن، بزرگوں کی حالت کو ساوتری گوسوامی نے سیدھے سادے انداز میں بیان کیا ہے۔ ان کے اچھے افسانوں میں ان کہی، ہار جیت، پیاس، زرد پتے، بیلن وین، انوکھا لاڈلا کا شمار ہونا چاہیے۔

میں اور میرے خواب: نذیر فتح پوری کے مختلف خواب پارے ہیں، جو افسانے کی شکل میں بیان ہوئے ہیں۔ نذیر فتح پوری اردو میں مناظر عاشق ہرگانوی کے بعد سب سے زیادہ لکھنے اور چھپنے والے ادیب و شاعر ہیں۔ اردو کی شاید ہی کوئی صنف ایسی ہو، جس میں انھوں نے طبع آزمائی نہ کی ہو۔ ان کے کئی ناول، ناولٹ، افسانچوں کے مجموعے اور کئی افسانوی مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔ کورونا جیسی مہلک بیماری کے وقت جہاں دنیا میں سونا پن، تنہائی، سناٹا، اکیلے پن نے سب کو گھیر رکھا تھا۔ سیکڑوں لوگ لقمۂ اجل ہو گئے تھے۔ نذیر فتح پوری کا قلم مستعدی سے چلتا رہا اور انھوں نے لاک ڈاؤن میں بیس کہانیاں لکھ ڈالیں۔ کورونا کے حالات سے پر یہ کہانیاں پچھلے سال 'کورونا کی بیس کہانیاں' کے نام سے شائع ہوئیں۔

'میں اور میرے خواب' میں نذیر فتح پوری نے ایک تجربہ کیا ہے کہ ان میں موضوعات کی مماثلت کو انداز بیان سے مختلف و منفرد بنانے کی کامیاب کوشش کی ہے۔ اس کتاب میں نذیر فتح پوری نے تقریباً 65 خوابوں کا بیان کیا ہے۔ اس میں کچھ خواب تو بہت متاثر کرتے ہیں۔ مگر بعض خواب تو بھرتی کے لگتے ہیں۔ چند خواب ایسے ہیں جو بعض زندہ شخصیات کے بارے میں ہیں۔ نذیر فتح پوری کا اندازِ بیان خوابوں کو قصے کہانیوں میں ڈھال دیتا ہے۔

یادوں کے جھروکے: ڈاکٹر نگار عظیم کے زیر ترتیب شائع ہوئی ہے۔ یہ 'بنات' کی پہلی کتاب ہے۔ اس میں تقریباً چار درجن کہانیاں ہیں، جو یادوں پر مشتمل ہیں۔ ان کا انداز اور بیان افسانے جیسا ہی ہے۔ اس کتاب میں بنات کی ممبران کی ہی تخلیقات شامل ہیں۔ نگار عظیم، بلقیس ظفیر الحسن، ذکیہ مشہدی، قمر جمالی، صبیحہ انور، نعیمہ جعفری پاشا، عذرا نقوی، ثروت خان، افشاں ملک، آصف اظہار علی، تسنیم کوثر، نصرت شمسی، فریدہ رحمت اللہ، شبینہ فرشوری، رفیعہ نوشین، سفینہ جیسی افسانہ نگاروں کی کہانیاں شامل ہیں۔

اس کتاب کی ایک خاص بات یہ ہے کہ اس میں یادوں کو افسانے کی شکل میں پیش کیا گیا ہے۔ یہ بھی ایک تجربہ ہے اور میں سمجھتا ہوں کہ بنات نے یہ ایک کامیاب تجربہ کیا ہے۔ بین الاقوامی نسائی ادبی تنظیم کی ایک خوبی یہ بھی ہے کہ اس پلیٹ فارم کے ذریعے نہ صرف اردو اور ادب کا فروغ جاری ہے بلکہ سماجی خدمات میں بھی یہ تنظیم آگے آگے ہے۔ بنات کی صدر ڈاکٹر نگار عظیم اپنے پیش لفظ میں لکھتی ہیں:

''ادب اور تخلیق ذاتی ہوتے ہوئے بھی ایک سماجی عمل ہے۔ ہر ادیب پر سماجی ذمے داریاں ایک عام شہری سے زیادہ ہوتی ہیں۔ بہتر سماجی زندگی کے لیے وقتاً فوقتاً تبدیلیاں ہمیشہ سے ہوتی رہی ہیں۔ سنجیدہ ادیب کو ان سماجی تبدیلیوں کا ادراک ہونا بہت ضروری ہے۔ ساتھ ہی مصروف عمل ہونا اس سے بھی زیادہ اہم ہے، کیونکہ ہر پہلو سے ادب کا مرکزی موضوع تو انسان ہی ہے۔ جب بات ہم خاتون کی کریں گے تو ظاہر ہے ایک ماں، بیوی، بیٹی، بہن، محبوبہ کسی بھی روپ میں محبتوں سے سرشار اس کا وجود اپنے فرائض کے تئیں کس قدر سنجیدہ ہو جاتا ہے۔ بس تبھی دل سمندر بن جاتا ہے۔''
(یادوں کے جھروکے، مرتبہ: نگار عظیم، بنات، ص 9)

کلام حیدری: پروفیسر شہزاد انجم کے ذریعے لکھا گیا مونوگراف ہے، جس کو اردو ڈائریکٹوریٹ بہار، نے شائع کیا ہے۔ کلام حیدری اپنے زمانے کے معروف افسانہ نگار ہیں۔ کلام حیدری کے افسانے زمانے کی داستان ہیں۔ سماج کے غماز ان کے افسانوں میں دلکش اسلوب، علامتوں کا نظام، تجربات وغیرہ پائے جاتے ہیں۔ پروفیسر شہزاد انجم سنجیدہ لکھنے والوں میں شمار ہوتے ہیں۔

مذکورہ مونوگراف میں کلام حیدری کی سوانح، افسانہ نگاری، صحافتی خدمات، تنقید نگاری، منتخب نگارشات شامل ہیں۔ کئی افسانے، نخی، زندگانی، روشنی کی ضمانت، سوانح اپنی زندگی کے کچھ سچ اور کئی اداریے مونوگرف میں شائع کیے گئے ہیں۔ اس مونوگراف کے مطالعے سے کلام حیدری کی شخصیت اور فن کو سمجھنے میں مدد ملے گی۔

غیاث احمد گدی : ڈاکٹر ہمایوں اشرف کے ذریعے تحریر کردہ مونوگراف ہے۔ جسے اردو ڈائریکٹوریٹ بہار نے شائع کیا ہے۔ غیاث احمد گدی اردو کے ایک بہترین افسانہ نگار کے طور پر جانے جاتے ہیں۔ ان کے افسانے، بابا لوگ، پرندہ پکڑنے والی گاڑی، تج دو تج دو، افعی، کوئی روشنی، آج بھی لوگوں کے دلوں میں زندہ ہیں۔

ہمایوں اشرف ہماری نسل کے ایک اہم ناقد ہیں۔ انھوں نے اردو فکشن تنقید میں اپنا انفراد ثابت کیا ہے۔ ان کی کئی کتابیں منظر کاظمی، الیاس احمد گدی، سعادت حسن منٹو، غیاث احمد گدی، وہاب اشرفی جیسے

اردو کے معروف فکشن نگاروں پر آپ کی کتابیں مشہور ہیں۔

مذکورہ مونوگراف میں غیاث احمد گدی کے ادب کو سمجھنے کے لیے ایک واسطہ ہے۔ اس کتاب میں غیاث احمد گدی کی شخصیت اور ادب کے ممکنہ گوشوں کو اجاگر کیا گیا ہے۔ ان کے منتخب افسانے بھی مونوگراف میں شامل ہیں۔

* اس سال افسانچوں کے بھی کئی مجموعے شائع ہوئے۔

کھول دو: تنویر اختر رومانی کے افسانچوں کا پہلا مجموعہ ہے۔تنویر اختر رومانی ایک منجھے ہوئے افسانہ نگار ہیں۔ان کے افسانوں کا ایک مجموعہ 'بول' کے نام سے منظرِ عام پر آچکا ہے، جس نے ادبی حلقوں میں کافی پذیرائی حاصل کی۔ تنویر اختر رومانی کے افسانے شہروں اور دیہات کے انسان کی اندرونی کشمکش اور جذبات کی ترجمانی کے افسانے ہیں۔

مذکورہ کتاب کے نام سے یہ گمان ہوتا ہے کہ یہ منٹو کے مشہور افسانے سے متعلق کتاب ہوگی۔دراصل تنویر اختر رومانی نے بین المتونیت کے ذیل میں یہ کامیاب تجربہ کیا ہے کہ انھوں نے اردو کے مشہور و معروف افسانوں پر افسانچے قلمبند کیے۔جنھیں ری میک افسانچے کہا گیا۔ اردو افسانچے کی روایت میں تنویر اختر رومانی نے پہلی بار ری میک افسانچے لکھے۔اس کتاب میں بارہ ری میک افسانچے جن میں عید گاہ، کفن، پنچایت (پریم چند) کھول دو، بو (سعادت حسن منٹو) بابا لوگ (غیاث احمد گدی)

رئیس خانہ (احمد ندیم قاسمی) لحاف (عصمت چغتائی) لاجونتی (راجندر سنگھ بیدی) جیسے افسانوں پر افسانچے اس طرح لکھے گئے ہیں کہ اصل افسانے کا مزاج ا، اختتام اور تاثر دوبالا ہو جاتا ہے۔دوسرے حصے میں 69 افسانچے ہیں جو ان کے 55 سالہ ادبی سفر کی یادگار ہیں۔

گلشن افسانچہ : منتخب افسانچے: خالد بشیر تلگامی کی ترتیب دی ہوئی کتاب ہے۔ خالد بشیر تلگامی خود بھی ایک افسانچہ نگار ہیں۔انھوں نے اس کتاب میں 71 افسانچہ نگاروں کو شامل کیا ہے۔کتاب میں 121 افسانچے شامل ہیں۔کتاب کی ایک خاص بات یہ ہے کہ افسانچہ نگاروں کا مختصر تعارف بھی درج کیا گیا ہے۔اس میں سے زیادہ تر افسانچے وہاٹس ایپ گروپ 'گلشن افسانچہ' پر شائع ہو چکے ہیں۔یہ افسانچے زندگی کے فلسفے، آس پاس کے ماحول، انسان کے بدلتے مزاج، دوہراپن، فرقہ پرستی، منبر و مسجد کے قصے، سماجی نشیب و فراز، ظلم و ستم، طبقاتی کشمکش، بے روزگاری، چھل کپٹ، دھوکہ و فریب، محبت والفت، نفرت کا پھیلتا کاروبار وغیرہ موضوعات کو اپنے دامن میں میں سمیٹے ہوئے ہیں۔مرد اور خواتین کے افسانچے الگ الگ دیے ہیں، جبکہ ایسی تفریق کی ضرورت نہیں ہے۔

* اس برس تنقیدی مجموعے یا فکشن تنقید پر مسلسل کتاب خاصی تعداد میں سامنے آئیں۔

اردو کے 23 افسانہ نگار اور ان کا پہلا افسانہ: ڈاکٹر محمد پرویز کی شہرت یافتہ کتاب ہے۔شروع میں لوگوں میں یہ تجسس تھا کہ وہ کون سے افسانہ نگار ہیں جن کا اس کتاب میں ذکر ہے۔بعد میں کھلا کہ ڈاکٹر پرویز نے اپنی پسند اور سہولت کے مطابق کام کیا ہے۔ویسے یہ کتاب اپنی نوعیت کی منفرد کتاب تھی۔

اس کتاب میں ڈاکٹر پرویز نے علی محمود، علی عباس حسینی، کوثر چاندپوری، حیات اللہ انصاری، مجنوں گورکھپوری، ہنس راج رہبر، صالحہ عابد حسین، شکیلہ اختر، بلونت سنگھ، رام لعل، جوگندر پال، غیاث احمد گدی، کلام حیدری، انور خان، شموئل احمد، قمر جہاں، حسین الحق، شوکت حیات، عشرت بیتاب، اقبال حسن آزاد، پیغام آفاقی، صادقہ نواب سحر کے پہلے افسانے اور افسانہ نگار کا تعارف بھی پیش کیا ہے۔ان افسانوں کے مطالعے سے کئی پہلو سامنے آتے ہیں۔بعض ایسے بھی افسانہ نگار ہیں، جن کے پہلے افسانے ہی نقش اول ثابت ہوئے اور انھوں نے مزید اچھے افسانے تخلیق کیے۔بعض افسانہ نگاروں نے دوسرے اور تیسرے افسانے سے رفتار پکڑی اور وہ اپنے عہد کے اچھے افسانہ نگار ثابت ہوئے۔اس سے کئی دور کی افسانہ نگاری کا بھی پتہ چلتا ہے۔اس فہرست میں حقیقت پسند افسانہ نگار ہیں تو رومانی شناخت والے بھی، اس میں ترقی پسند ہیں تو جدیدیے بھی، مابعد جدید ہیں تو نئی صدی کے لکھنے والے بھی ہیں۔خواتین افسانہ نگار ہیں تو غیر مسلم افسانہ نگار بھی۔یہ کتاب اپنے آپ میں انفرادیت کی حامل ہے۔

چھٹا پروفیسر شمیم نکہت یادگاری خطبہ 'ہم عصر اردو فکشن' کتابچے کی شکل میں سامنے آیا۔ 64 صفحات پر مشتمل اس کتابچے میں پروفیسر شمیم نکہت اور پروفیسر ابن کنول کے تعارف کے ساتھ پروفیسر ابن کنول کے ذریعے دیے گئے خطبے کو شائع کیا گیا ہے۔پروفیسر ابن کنول نے ترقی پسند افسانے کا ذکر کرتے ہوئے جدید اور مابعد جدید افسانے کا تفصیل سے ذکر کیا ہے۔اکیسویں صدی کے افسانے پر موصوف نے سرسری نگاہ بھی ڈالی ہے۔

الیاس احمد گدی :حیات و نشانات: ڈاکٹر ہمایوں اشرف کی مرتب کردہ کتاب ہے۔ 944 صفحات کی کتاب میں ڈاکٹر ہمایوں اشرف نے الیاس احمد گدی کی شخصیت اور ان کی تخلیقات سے متعلق ہر گوشے پر ماہرین کے مضامین کو یکجا کر دیا ہے۔الیاس احمد گدی پر ریسرچ کرنے والے محققین کے لیے یہ کسی تحفے سے کم نہیں۔ کتاب میں تقریباً 80 مضامین شامل ہیں جو الیاس احمد گدی کے تعلق سے وضاحت کے ساتھ ہر گوشے پر سیر حاصل مواد فراہم کرتے ہیں۔کتاب میں شمیم حنفی، وارث علوی، علی احمد فاطمی، علیم اللہ حالی، انور پاشا، عبدالقیوم ابدالی، عبدالمغنی، احمد یوسف، انیس رفیع، مناظر عاشق ہرگانوی، قیصر شمیم، مشرف عالم ذوقی، نامی انصاری، اے خیام، آفتاب احمد آفاقی، شہاب ظفر اعظمی، عارفہ بشریٰ وغیرہ نامی گرامی لوگوں کے مضامین شامل ہیں۔خود مرتب کا تقریباً 60 صفحات کا مقدمہ اور کئی مضامین کتاب میں موجود ہیں۔

شفیع مشہدی کے افسانے: ڈاکٹر ہمایوں اشرف کی مرتب کردہ کتاب ہے۔کتاب میں شافع مشہدی کے 30 افسانے شامل ہیں۔جن کے مطالعے سے شفیع مشہدی کی افسانہ نگاری کو کسی حد تک سمجھا جا سکتا ہے۔ان افسانوں کے متعلق ڈاکٹر ہمایوں اشرف کا طویل مضمون (44) بھی شامل کتاب ہے، جس سے شفیع مشہدی کی افسانہ نگاری کے مختلف پہلوؤں پر سیر حاصل روشنی پڑتی ہے۔شفیع مشہدی کے تعارف میں افسانے کے علاوہ ان کے دیگر

ادبی کارناموں اور ان کی شخصیت کے بارے میں بھرپور معلومات حاصل ہو جاتی ہیں۔

شفیع مشہدی کے افسانوں میں ان کے سبھی معروف افسانے شامل ہیں۔ کرچیاں، سنیچر شاہ، بنتِ زلیخا، سید کی حویلی، طوطے کا انتظار، گرتی دیواریں، جلدی کرو، مٹی کی خوشبو، میک اپ، کبوتر، روشنی کی آگ، نیلے بادبان والی کشتی، آہنی ہے پیرہن وغیرہ شامل ہیں، جن کے مطالعے سے شفیع مشہدی کے افسانوں کو سمجھا جا سکتا ہے۔

اردو فکشن اور اسلم جمشیدپوری کی تنقیدی بصیرت: عرفان عارف کی مرتب کردہ کتاب ہے۔ جسے قاسمی کتب خانہ، جموں نے عمدگی سے شائع کیا ہے۔ عرفان عارف نوجوان شاعر ہیں۔ تحریک بقائے اردو، نامی تنظیم چلاتے ہیں، جس کا روزانہ جلسہ فیس بک کے ذریعے منعقد ہوتا ہے۔ ان کی کئی کتابیں شائع ہو چکی ہیں۔

کتابِ ہٰذا میں انھوں نے اسلم جمشید پوری کے ناول، افسانے اور افسانچے پر لکھے مضامین کو جمع کیا ہے اور ایک مقدمہ لکھا ہے۔ ساتھ ہی بڑی عرق ریزی سے صاحبِ مضامین کا تعارف نامہ جو تقریباً 40 صفحات پر مشتمل ہے، تیار کیا ہے۔ یہ مضامین طالب علموں کے لیے خصوصاً بہت مفید ہیں۔

اکیسویں صدی میں اردو ناول: منظور حسین کی کتاب ہے، جسے قاسمی کتب خانہ، جموں نے شائع کیا ہے۔ منظور حسین نوجوان اسکالر ہیں۔ وہ ایسے کام کرتے رہتے ہیں۔ مذکورہ کتاب میں منظور حسین نے اس کتاب میں دو درجن ایسے ناولوں پر مختلف اسکالرز کے مضامین کو یکجا کیا ہے، جو اکیسویں صدی میں شائع ہوئے۔ کئی اہم اسکالرز کے ناول پر لکھے گئے مضامین کتاب میں شامل ہیں۔ قدوس جاوید، علی احمد فاطمی، صغیر افراہیم، غضنفر، سید احمد شمیم، مولا بخش، انتخاب حمید، نورالحسنین، سید محمد اشرف، خلیل مامون، ریاض احمد، ریاض توحیدی، شاداب علیم کے مضامین طالب علموں کی صحیح رہنمائی کے لیے کافی ہیں۔

اردو ناول اور ناولٹ: پروفیسر اسلم جمشید پوری کی نئی کتاب ہے۔ 368 صفحات کی اس کتاب کو ماڈرن پبلشنگ ہاؤس نے بہت اچھے گیٹ اپ کے ساتھ شائع کیا ہے۔ اس کتاب میں ناول اور ناولٹ کے متعلق تحقیقی مضامین اور تجزیے شامل ہیں۔ ان مضامین کے ذریعے ادب کی دنیا میں ناولٹ کو لے کر جو کنفیوژن ہے، اسے دور کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ کتاب کے آخر میں 2000 سے 2022 تک شائع ہونے والے ناولوں کی ایک فہرست دی گئی ہے۔ ساتھ ہی ابتدا سے اب تک کے خاص ناولٹس کی بھی ایک فہرست دی گئی ہے۔ جو ناول یا ناولٹ پر تحقیقی وتنقیدی کام کرنے والوں کے لیے انتہائی مفید ہے۔

ڈاکٹر نعیمہ جعفری پاشا کے نمائندہ افسانے: عمران عاکف خان کی مرتب کردہ کتاب ہے۔ جسے ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس نے شائع کیا ہے۔

کتابِ ہٰذا میں عمران عاکف خان نے نعیمہ جعفری پاشا کے افسانوں کا ایک انتخاب شامل کیا ہے۔ نعیمہ جعفری پاشا کے 28 افسانے کتاب میں شامل ہیں۔ ان افسانوں کے مطالعے سے نعیمہ جعفری کی افسانہ نگاری کو سمجھنے میں مدد مل سکتی ہے۔ ان افسانوں میں نعیمہ جعفری پاشا کے مشہور ومقبول افسانے شامل ہیں۔ چوتھی کا ایک اور جوڑا، امربیل، بابل کا آنگن، ٹوٹا ہوا آدمی، کرائے کی کوکھ، زہریلی دھوپ، اف یہ آسمان، خوبصورت، آنکھوں کی مہکتی خوشبو، چاند کا داغ، داغدار اجالا، کینچوے، ایک وفا ایسی بھی، وغیرہ نعیمہ جعفری پاشا کے اچھے اور نمائندہ افسانے ہیں۔ پھر عمران عاکف خان کا طویل مقدمہ بعنوان 'مابعد جدید افسانے کا نمائندہ نام: ڈاکٹر نعیمہ جعفری پاشا' موصوفہ کے افسانے کی تفہیم میں معاون ہوتا ہے مگر میرا خیال ہے کہ نعیمہ جعفری پاشا کو مابعد جدید کے خانے میں رکھنا مناسب نہیں۔ ان کے زیادہ تر افسانے ترقی پسندی کا رنگ لیے ہوئے دل کو چھو لینے والے افسانے ہیں۔ اگر کتاب میں نعیمہ جعفری پاشا کا تعارف بھی شامل ہوتا تو ان پر کام کرنے والوں کو آسانی ہوتی۔

اردو ناول : نظری اور عملی تنقید: ڈاکٹر سفینہ بیگم کی ایک اہم تنقیدی کتاب ہے۔ ناول کی تنقید پر مبنی اس کتاب کو عرشیہ پبلی کیشنز نے شائع کیا ہے۔ یہ کتاب ناول کے متعلق مغربی نظریات کے ساتھ ساتھ اردو میں موجود ناول کی تنقید سے بھی بحث کرتی ہے۔ سفینہ بیگم ایک سنجیدہ طالب علم ہیں۔ وہ خود بھی ناول نگار ہیں۔ گذشتہ برسوں ان کا ناول 'خلش' ادبی حلقوں میں سراہا جا چکا ہے۔

مذکورہ کتاب میں ناول کے تعلق سے عمدہ تنقید کی گئی ہے۔ ناول کی ہئیت، پلاٹ، اسلوب، کردار، واقعات وغیرہ پر سیر حاصل بحث ملتی ہے۔ اردو ناول میں وجودی عناصر، ناول تنقید کے امکانات، ناول میں اظہار وبیان کے مسائل، اردو ناول میں تاریخ کے تجربات، اردو ناول کی تانیثی قرأت، ناول کا تصور اور اس کی ساخت، بین المتونیت اور اردو ناول، جیسے موضوعات سے سفینہ بیگم نے صحت مند بحث کی ہے۔ ساتھ ہی اردو ناولوں کی مثالیں بھی پیش کی ہیں۔

سفینہ بیگم نے اپنی کتاب میں کئی چاند تھے سرآسماں (شمس الرحمٰن فاروقی) غلام باغ، حسن کی صورت حال (مرزا اطہر بیگ) خواب سراب (انیس اشفاق) آخری سواریاں (سید محمد اشرف) شہرِ لازوال، آبادویرانے (بانو قدسیہ) جیسے معرکتہ الآرا ناولوں کا مختلف زاویے سے مطالعہ پیش کیا ہے۔ ان ناولوں کے مطالعے میں ناول کی نظری اور عملی تنقید کے نمونے بھی ملتے ہیں۔ ناول پر کام کرنے والے اسکالرز اور تحقیق کے طالب علموں کے لیے یہ کتاب بہت ضروری ہے۔

قرۃ العین حیدر کے منتخب افسانے: ڈاکٹر ریحانہ سلطانہ کی مرتب کردہ کتاب ہے۔ ڈاکٹر ریحانہ سلطانہ کی اس سے قبل بھی ایک کتاب 'قرۃ العین حیدر کے نمائندہ افسانے' منظر عام پر آچکی ہے۔ ڈاکٹر ریحانہ سلطانہ نے ایم فل اور پی ایچ ڈی بھی قرۃ العین حیدر پر کی ہے۔ اسی لیے ان سے یہ امید کی جاتی ہے کہ وہ قرۃ العین حیدر کے فکشن پر اچھی خاصی نظر رکھتی ہوں گی۔ امید کے عین مطابق ڈاکٹر ریحانہ سلطانہ نے عینی آپا کے ایسے افسانے منتخب کیے ہیں، جن کا تعلق نصاب سے ہے۔ اودھ کی شام، مونالیزا، جہاں کارواں ٹھہرا تھا۔ جلا وطن، برف باری سے پہلے، ڈالن والا، یاد کی ایک دھنک چلے، سکریٹری، دو سیاح اور فقیروں کی پہاڑی، جیسے افسانوں کی شمولیت اور ان کے تجزیے ریسرچ اسکالرز کے لیے بڑے کام کے ہیں۔ آپ نے اس کتاب میں ایک مقدمہ بھی لکھا ہے۔ جس میں انھوں نے قرۃ العین حیدر کے فکشن اور خاص کر افسانوں سے متعلق بہت کچھ لکھا ہے۔

تنقید و تعبیر: ڈاکٹر زرینہ بیگم کے مضامین کا مجموعہ ہے۔ ڈاکٹر زرینہ بیگم ویسے تو بنیادی طور پر شاعرہ ہیں۔ مگر ان کے مختلف مضامین ہندوپاک کے ادبی رسائل میں شائع ہوتے رہتے ہیں۔ تنقید و تعبیر، ان کے مضامین کا پہلا مجموعہ ہے۔ اس کتاب کو مصنفہ نے دو حصوں میں تقسیم کیا ہے۔ پہلے حصے میں شاعری پر تنقیدی مضامین شامل کیے ہیں۔ دوسرے حصے میں فکشن پر تنقیدی مضامین شامل ہیں۔ جن میں پریم چند، ترقی پسند افسانے، عصمت چغتائی، پریم چند کے بعد اردو افسانہ اور نئے اردو افسانے پر خاطر خواہ مضامین شامل ہیں۔

قدرت اللہ شہاب کے منتخب افسانے اور تجزیے: ڈاکٹر شبستاں آس محمد کی کتاب ہے۔ ڈاکٹر شبستاں ابھرتی ہوئی ناقد ہیں۔ ان کی اس سے قبل ایک کتاب 'جہان قدرت اللہ شہاب' شائع ہو کر مقبول ہو چکی ہے۔ جس میں انھوں نے قدرت اللہ شہاب کی سوانح، ناولٹ، افسانے، وغیرہ پر تنقیدی بحث کی ہے۔ ڈاکٹر شبستاں نے ایم فل اور پی ایچ ڈی بھی قدرت اللہ شہاب پر مکمل کی ہے۔

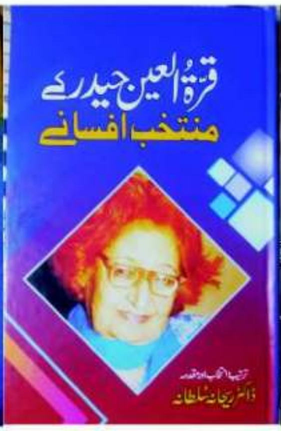

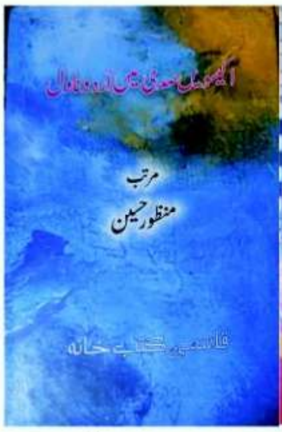

مذکورہ کتاب 'قدرت اللہ شہاب کے منتخب افسانے اور تجزیئے' میں ڈاکٹر شبستاں نے قدرت اللہ شہاب کے افسانوں کو جمع کیا ہے اور ان کے تجزیے بھی کیے ہیں۔ یہ وہ افسانے ہیں جو آسانی سے دستیاب نہیں ہیں۔ مثلاً چندراوتی، ماں جی، دورنگا، جال، پہلی تنخواہ، شلوار، غریب خانہ، اسٹینو گرافر، پکے آم، پھوڑے والی ٹانگ، تلاش، ریلوے جنکشن، جگ مگ افسانوں کے ساتھ ساتھ ان کے تجزیے اس کتاب میں شامل ہیں۔ یہ کتاب قدرت اللہ شہاب اور ترقی پسند افسانے پر کام کرنے والوں کے لیے خاص طور سے مفید ہے۔

کہکشاں پروین: فکری و فنی جہات: ڈاکٹر مکمل حسین کی مرتب کردہ کتاب ہے۔ اس کتاب کے پہلے حصے الف کے سارے مضامین مکمل حسین کے ہیں۔ مکمل حسین نے کہکشاں پروین کی ادبی خدمات پر اچھا خاصا لکھا ہے۔ کہکشاں پروین کی تحقیق، تنقید، شاعری اور افسانوں کا مکمل جائزہ پیش کیا ہے۔ اس حصے میں کہکشاں پروین کے مشہور افسانے بھی شامل کیے ہیں۔ ایک مٹھی دھوپ، دھوپ کا سفر، سرخ لکیریں، پانی کا چانداور مور کے پاؤں جیسے مشہور افسانے شامل کیے گئے ہیں۔

کتاب کے دوسرے حصے میں مشہور ومعروف ناقدین اور فکشن نگاروں کے مضامین شامل کیے ہیں۔ قمر جہاں، ہمایوں اشرف، شموئل احمد، عبیداللہ ہاشمی، اختر آزاد، غالب نشتر، ارشاد سیانوی، لائق فاطمہ نقوی، شرافت حسین، خورشید پرویز صدیقی، عرفان کوثر اور تقریباً ایک درجن اسکالرز کے مضامین شامل ہیں۔ اس کتاب کے مطالعے سے کہکشاں پروین کی مکمل شخصیت اور فن ابھر کر سامنے آتا ہے، جو مکمل حسین کی تنقید کو بھی اجاگر کرتا ہے۔

افسانچہ اور افسانچہ نگار: کتاب اسلم جمشید پوری کی تحریر کردہ ہے۔ اس کتاب میں افسانچے کے فن پر تحقیقی وتنقیدی نظر ڈالی گئی ہے۔ افسانچہ کب اور کس ادیب کے ذریعے وجود میں آیا۔ کس نے اسے افسانچہ نام دیا۔ کن کن افسانچہ نگاروں نے اس کے فروغ میں حصہ لیا۔ موجودہ اور ماضی کے عہد کے معروف افسانچہ نگار اور ان کے افسانچے اس میں شامل ہیں۔ پہلی بار افسانوں کے تجزیے بھی اس کتاب میں شامل کیے گئے ہیں۔ افسانچے پر کام کرنے والے طالب علموں کے لیے یہ کتاب کام کی ہے۔

قرۃالعین حیدر کے 52 افسانے: ڈاکٹر نازیہ بیگم جافو خان (ماریشس) کی کتاب ہے، جسے کتابی دنیا، لاہور نے شائع کیا ہے۔ اس سے قبل بھی نازیہ بیگم کی کئی کتابیں منظر عام پر آچکی ہیں۔ قرۃ العین حیدر ان کا پسندیدہ موضوع ہے۔ پچھلے سال بھی قرۃ العین حیدر پر ان کی کتاب شائع ہوئی تھی۔

ڈاکٹر نازیہ بیگم گاندھی انسٹی ٹیوٹ، ماریشس میں پروفیسر ہیں۔ مذکورہ کتاب میں نازیہ بیگم نے عینی آپا کے سارے افسانوں کے تجزیے کیے ہیں۔ انھوں نے عینی آپا کے پانچوں افسانوی مجموعوں، ستاروں سے آگے، شیشے کے گھر، پت جھڑ کی آواز، روشنی کی رفتار اور جگنوؤں کی دنیا کے ہر افسانے کا تجزیہ کیا ہے۔

'تجزیہ میں پلاٹ، کردار، پس منظر، نقطۂ نظر، اسلوب، وحدت تاثر اور آغاز و اختتام پر افسانے کے فن کی مناسبت سے بحث کی گئی ہے تاکہ معلوم ہو جائے کہ افسانہ کس نوعیت کا ہے۔''

(قرۃ العین حیدر کے 52 افسانے، ڈاکٹر نازیہ بیگم جافو خان، پیش لفظ)

بارود اور کونپل، عارف نقوی (جرمنی) کے منتخب افسانے: اسلم جمشید پوری کی مرتب کردہ کتاب ہے۔ اس کتاب میں عارف نقوی کے بیس افسانے اور پانچ افسانچے شامل ہیں۔ ساتھ ہی اسلم جمشید پوری کا ایک طویل مقدمہ جس میں عارف نقوی کی شخصیت اور فن پر بحث کی گئی ہے۔ عارف نقوی کی افسانہ نگاری کے مختلف شیڈس کا انکشاف بھی اس مقدمے میں ہے۔

عارف نقوی یوں بھی کثیر رخی فنکار ہیں۔ وہ افسانہ نگار، افسانچہ نگار، شاعر، صحافی، سفر نامہ نگار، محقق و ناقد، خاکہ نگار، ناولٹ نگار کے ساتھ ساتھ اچھے استاد بھی ہیں اور ان کے معروف افسانوں میں بارود اور کونپل، زلیخا، رکشے والا، پشیمانی، کیرم بورڈ، تعویذ، نوکر، سوئے فردوس بریں، بیرک نمبر 108، پہلا جوتا، لوسی، پاسپورٹ وغیرہ ہیں۔ ان افسانوں میں عارف نقوی کا ترقی پسند نظریہ واضح ہے۔ جو منفی حالات میں بھی، مثبت قدروں کا امین رہتا ہے۔

خاموش صدائیں: صبیحہ تزئین کے ذریعے مرتب کردہ کتاب ہے، جسے عرشیہ پبلی کیشنز نے شائع کیا ہے۔ اس کتاب میں محبت کے موضوع پر 12 افسانوں کو جمع کیا گیا ہے۔ ایسی کوشش پہلے بھی عابد سہیل نے کی تھی۔ اس کتاب میں ایسی کہانیوں کا انتخاب کیا گیا ہے جو محبت کے جذبات کو اپنے دامن میں سمیٹے ہوں۔ وہ خواہ کسی بھی عہد کی ہوں۔ لہٰذا اس کتاب میں بھی قرۃ العین حیدر، قاضی عبدالستار، ضمیر الدین احمد، عبداللہ حسین، سے لے کر موجودہ عہد کے شفیع جاوید، زاہدہ حنا، صدیق عالم، مشرف عالم ذوقی، خورشید اکرم، سہیل وحید، عمر عادل، ضمیر الدین احمد کی کہانیاں شامل ہیں۔

دھنورا: اسلم جمشید پوری کا پہلا ناول ہے۔ جو کولاژ تکنیک میں گاؤں دیہات کے منظر اور پس منظر میں لکھا گیا ہے۔ اس ناول میں مرکزی کردار کی شکل میں گاؤں، دھنورا ہے۔ باقی سبھی کردار آتے ہیں، اپنا رول ادا کرتے ہیں اور چلے جاتے ہیں۔ یہ اردو ناول میں ایک تجربہ ہے۔ ناول کے بارے میں نوجوان محقق وناقد ڈاکٹر ابراہیم افسر لکھتے ہیں:

''ناول 'دھنورا' کا اندازِ پیشکش اتنا دل کش، شستہ اور رواں دواں ہے کہ ہر باب میں قاری اپنے آپ کو ڈوبا ہوا محسوس کرتا ہے۔ گاؤں کی جزئیات، شادی بیاہ، کھیل تماشے، کاروباری لین دین، کھیتی باڑی کے طریقے، نوکری چاکری کے لیے گاؤں سے باہر نکلنا، گھر کے بام و در میں ہونے والی گفتگو، جمعے کی نماز پڑھنے کے لیے دوسرے گاؤں کا سفر، مندر میں ہونے والی آرتی، گاؤں کی عورتوں کے مسائل، ہجرت کا کرب، اپنے لوگوں سے بچھڑنے کا درد اور مالی مسائل وغیرہ کا پروفیسر اسلم جمشید پوری نے خوب صورتی کے ساتھ بیان کیا ہے ''

(ناول دھنورا کا تجزیاتی مطالعہ، ڈاکٹر ابراہیم افسر، سہ ماہی عالمی فلک، شارہ نمبر 10-9، دھنباد، ص 103)

محصور پرندوں کا آسمان: نئی نسل کی افسانہ نگار حمیرا عالیہ کا پہلا ناول ہے، جسے عرشیہ پبلی کیشنز نے شائع کیا ہے۔ حمیرا عالیہ کا اپنا انداز ہے۔ انھوں اس ناول کے ذریعے خود کو ثابت کیا ہے۔ ان کے یہاں پختگی ہے۔ وہ اچھی زبان لکھتی ہیں۔ ان کا بیانیہ پر اثر ہے۔

سسٹم: عبدالصمد کا تحریر کردہ تازہ ناول ہے، جسے کتاب دار نے شائع کیا ہے۔ عبدالصمد ہمارے ان فکشن نگاروں میں ہیں، جنھوں نے ہمیشہ نیا لکھا ہے۔ ملک کی تازہ

صورت حال ان کے ناولوں سے منعکس ہوتی ہے۔ وہ جوں جوں عمر کی سیڑھیاں چڑھ رہے ہیں، ان کی تخلیقیت میں اضافہ ہورہا ہے۔ تقریباً ہر سال ان کا ایک ناول یا افسانوی مجموعہ یا کوئی کتاب منظر عام پر آتی ہے۔ اس سے قبل ان کا ناول 'کشکول' شائع ہوکر مقبول ہو چکا ہے، جو کورونا جیسی مہلک بیماری میں فقیروں کی سرگرمیوں کو عمدگی سے اجاگر کرتا ہے۔

مذکورہ ناول 'سسٹم' بھی حالاتِ حاضرہ کا عکاس ہے۔ اس ناول میں پولس محکمے کی بدعنوایوں کا پردہ فاش کیا گیا ہے۔ مرکزی کردار 'میں' ہے جو محکمہ پولس میں سپاہی ہے۔ ایک سپاہی کے ذریعے پورے پولس ڈپارٹمنٹ کے طریقۂ کار یعنی سسٹم پر سوال اٹھائے گئے ہیں۔ مال کے بٹوارے کا نظام سمجھایا گیا ہے۔ اس کی بیوی زلیخا ایک مذہبی عورت ہے اور رشوت کو اپنے، اپنے بچوں اور پورے گھر کے لیے زہر سمجھتی ہے اور ساری زندگی عسرت میں گذار دیتی ہے، جبکہ ناول کا مرکزی کردار رشوت لیتا ہے۔ انور اس کا کہانی کا ردوست ہے۔ راجو ایک گھاگ سیاست داں ہے۔ اور 'میں' کا دوست بن جاتا ہے۔ اس کے ریٹائرمنٹ کے بعد اسے اپنے یہاں رکھ لیتا ہے۔ یہاں سیاست کے گھناؤنے سسٹم کی پرتیں کھلتی ہیں۔ پورا ناول پولس محکمے اور سیاست کی بدعنوانیوں، عمل اور مال کے بٹوارے کے گرد گھومتا ہوا زندگی کے کئی رخ کی نقاب کشائی کرتا ہے۔

شہر ذات: شاہد اختر کا نیا ناول ہے۔ شاہد اختر اردو فکشن کا ایک مستند نام ہے۔ ان کے افسانے اور ناول انفرادیت رکھتے ہیں۔ اس سے قبل ان کے تین افسانوی مجموعے، برف پر ننگے پاؤں، موتی، خوا بگینے اور ایک ناول شہر میں سمندر آ کر مقبولیت حاصل کر چکے ہیں۔

مذکورہ ناول ' شہر ذات' دراصل انسان کی باطنی حالت اور کیفیت کو ظاہر کرتا ہے۔ یہ ناول جتنا معاشرے کی تبدیلیوں کو ظاہر کرتا ہے، اتنا فرد کی نفسیات اور اس کے اندرون کو بھی پیش کرتا ہے۔ ناول کا مرکزی کردار خرم ہے۔ دوسرے کرداروں میں انترا، خرم کی ماں، ماموں، بھائی جان، جمیلہ بھابھی وغیرہ ہیں۔ خرم کی اچانک موت سے قاری بھی پریشان ہو جاتا ہے۔ مگر یہ ایک فطری موت ہے۔ ناول کے بارے میں شعیب نظام لکھتے ہیں:

''پورا ناول شروع سے آخر تک قاری، کو اپنی گرفت میں رکھتا ہے اور خرم کے کردار کے ذریعے باہر سے اندر کی ٹوٹ پھوٹ کو بہت فنکاری سے پیش کیا گیا ہے۔ یہ ناول جتنا خارج کو اپنے احاطے میں لیتا ہے، اس سے زیادہ داخلی دنیا میں اتھل پتھل مچاتا ہوا اپنے انجام کو پہنچتا ہے۔ اسی لیے اس کا عنوان بھی شہر ذات ہے۔''

(شہر ذات، شاہد اختر، ص 11)

'کوشل خاتون' کی شکل میں شفق سوپوری کا نیا ناولٹ بازار میں آیا ہے۔ ایک نئے مسئلے کو ان کے اسلوب نے ایسا گرفت میں لیا ہے کہ لگتا ہے وہ عام مسئلہ ہے۔ گھر گھر کی کہانی ہے۔ ماں باپ کی توجہ جب اپنے بچوں خاص کر بچیوں کی طرف نہیں ہوتی ہے، تو ایسے گل کھلتے ہیں۔ ایک دو کمروں میں کئی کئی بچوں کے ساتھ رہنے میں ایسے ایسے جنسی مسائل پیدا ہوتے ہیں، جو والدین نے سوچے بھی نہیں ہوتے۔ لڑکیوں کی بے راہ روی ایک خطرناک نتائج سامنے لاتی ہے۔ اور والدین کا سر شرم سے جھکتا ہی نہیں بلکہ وہ کہیں منھ بھی دکھانے کے لائق نہیں رہتے۔ شفق سوپوری نے کوشل خاتون، کی شکل میں آنکھیں کھول دینے والا کردار اور واقعات قلمبند کیے ہیں۔

بجھتے جلتے چراغ: عارف نقوی کا تازہ ناولٹ ہے۔ عارف نقوی زود گو قلم کار ہیں۔ انھوں نے ادب کی کئی اصناف میں کامیاب طبع آزمائی کی ہے۔ یہ ان کا پہلا ناولٹ ہے۔

اس ناولٹ کی کہانی جرمنی، ترکی، عراق، لکھنؤ کی تہذیب و تمدن کو پیش کرتی ہے۔ آدھی سے زیادہ کہانی لکھنؤ کے اردگرد گھومتی ہے۔ ماریہ اور ساجد دونوں ایک دوسرے سے پیار کرتے ہیں۔ ساجد لکھنؤ کا رہنے والا ہے۔ ہم سب بخوبی جانتے ہیں کہ عارف نقوی کا تعلق لکھنؤ سے ہے۔ ان کا بچپن لکھنؤ کی گلیوں اور محلوں میں گزرا ہے۔ اس ناولٹ کے مرکزی کردار ساجد میں کبھی کبھی عارف صاحب کی جھلک نظر آتی ہے۔

اپنا اپنا سچ: دیپک بدکی کا نیا ناولٹ ہے۔ دیپک بدکی کا یہ پہلا ناولٹ ہے۔ اس سے قبل دیپک بدکی کے قلم سے آٹھ افسانوی مجموعے، دو افسانوں کے مجموعے، دس تنقیدی کتب، ایک سوانح، ایک تحقیقی کتاب نکل چکی ہیں اور اب یہ ناولٹ 'اپنا اپنا سچ'۔ دیپک بدکی کی تخلیقات میں کشمیری پنڈتوں کا درد و کرب جھلکتا ہے۔ اور ایک ایسی ہجرت کا غم بھی آشکار ہوتا ہے، جو انھیں اپنی زمین سے اجڑنے کا سبب بنی تھی۔

ناولٹ، اپنا اپنا سچ، میں انھوں نے کشمیر کی قدیم تاریخ، جب ہندو مسلمان شیر و شکر کی طرح ایک ہو کر رہتے تھے، کا بیان کیا ہے۔ کشمیر ہندوؤں کا تھا یا مسلمانوں کا۔ دونوں اپنی اپنی کہانی بیان کرتے ہیں۔ دونوں اپنی جگہ صحیح ہیں۔ معاملہ سیاست کا ہے۔ 1947 میں جب ملک تقسیم ہوا اور ایک بار حضرت بل سے موئے مبارک غائب ہو گیا تھا۔ ان دو مواقع پر پورے علاقے نے فرقہ وارانہ فسادات نہ صرف دیکھے بلکہ جھیلے۔ ناگرائے اور ان کی بیوی ہمالہ اور بیٹے اگنی شیکھر نے ہجرت کے دردناک عذاب کا سامنا کیا۔ پورے ناولٹ میں ہندوؤں اور مسلمانوں کا انمٹ میل جول، فرقہ واریت، ہجرت کے تماشے وغیرہ کو دیپک بدکی نے تاریخی نقطۂ نظر سے ناولٹ کے قالب میں کامیابی سے ڈھالا ہے۔

سبز پوش خاتون: طٰہٰ نسیم کا تاریخی ناولٹ ہے۔

مذکورہ ناولٹ 'سبز پوش خاتون' دراصل 1857 کے بطن سے پیدا حالات میں ایک خاتون کی بہادری کی کہانی ہے۔ یہ کہانی دہلی کی ایک بہادر دوشیزہ روشن کی ہے، جس نے اپنی جنگی صلاحیتوں اور منصوبہ بندی سے انگریزوں کے چھکے چھڑا دیے۔ روشن نے جنگی آلات، گھوڑا، اور تلوار چلانے کی مشقیں کی، پھر اپنے وفا دار ساتھیوں کا ایک ٹولہ بنا کر ہر محاذ پر انگریزوں کے دانت کھٹے کیے۔ بار ہا انگریزوں کو شکست کا منھ دیکھنا پڑا۔ روشن کی پلاننگ اتنی زبردست ہوتی تھی کہ انگریز بہت زمانے تک یہ سمجھ نہیں پائے کہ ان کو نقصان کس نے پہنچایا ہے۔ طٰہٰ نسیم کو روشن جیسے کردار کو سامنے لانے کے لیے مبارکباد۔

بالکونی: ماریشس کی نوشین نور محمد کا ناولٹ ہے۔ نوشین نور محمد گاندھی انسٹی ٹیوٹ کی طالبہ ہیں۔ ماریشس کی تاریخ میں یہ پہلا ناولٹ ہے۔

مذکورہ ناولٹ میں کورونا جیسی مہلک بیماری سے ناولٹ کی کہانی پروان چڑھتی ہے۔ نتاشا اس ناولٹ کا مرکزی کردار ہے۔ جو بچپن سے ہی ہکلاتی ہے، مگر بہت مترنم آواز میں گاتی ہے۔ گاتے وقت اس کی زبان ٹھیک ہو جاتی ہے۔ آہستہ آہستہ وہ کافی شہرت اور پیسہ کی لیتی ہے۔ جس سے وہ اپنا علاج کراتی ہے اور ٹھیک ہو جاتی ہے۔ اس کے والد اس کی ہکلاہٹ کی وجہ سے شرمندگی محسوس کرتے ہیں۔ اور اس سے کتراتے ہیں۔ اسے بھی اپنے والد سے نفرت ہو جاتی ہو۔ کورونا کا زمانہ آجاتا ہے۔ نتاشا کورونا کے زمانے میں کافی خدمت خلق کرتی ہے۔ ایک اچھا جذباتی ناولٹ ہے۔ نوشین سے بہت سی توقعات ہیں، آئندہ وہ اس سے اچھا ناول لکھیں گی۔

* بہت سے رسائل نے اردو کے فکشن اور فکشن نگاروں پر نمبر اور گوشے نکال کر فکشن کی خدمت کی ہے۔

■

Prof.Aslam Jamshedpuri
HOD, Dept of Urdu
Chaudhary Charan Singh University, Ramgarhi,
Meerut- 250001 (UP)

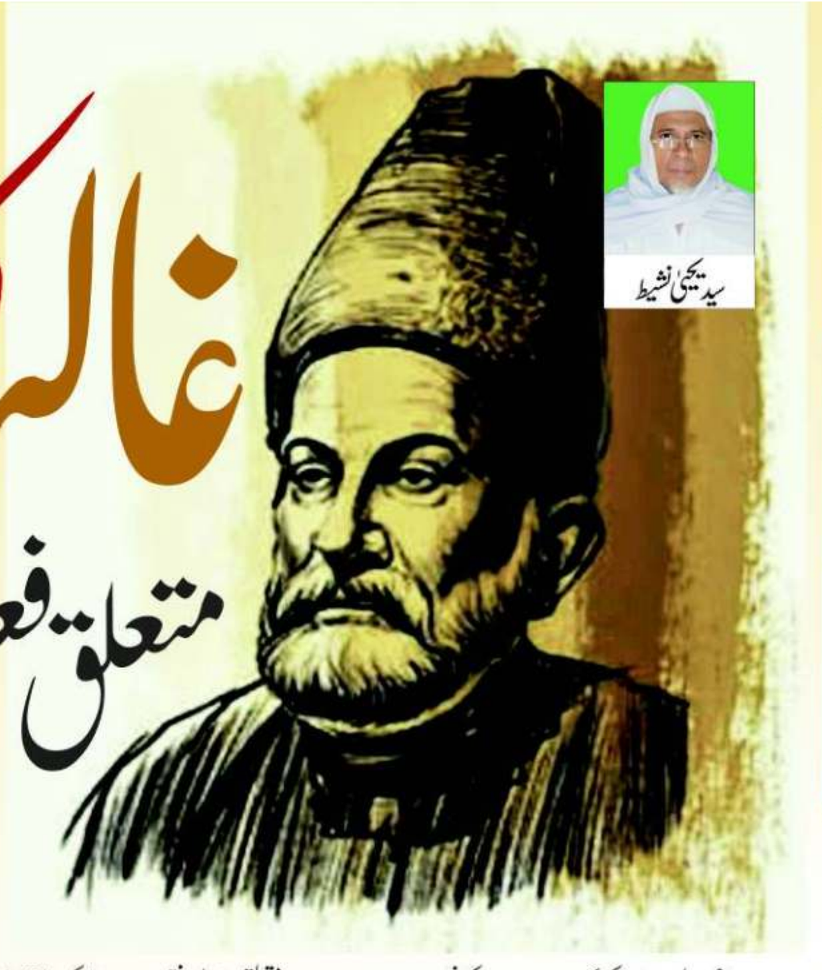

سید یحییٰ نشیط

غالب کلام میں متعلق فعل رِ تمئیز کا استعمال

جس طرح اسم کی کیفیات اور اس کی خصوصیات بتانے والے لفظ کو صفت کہا جاتا ہے اسی طرح فعل اور صفت کی کیفیتوں اور ان کی خصوصیتوں کی وضاحت کرنے والے الفاظ قواعد کی زبان میں تمیُز یا متعلق فعل کہلاتے ہیں۔ تمیُز بروزن تعمیر عربی لفظ ہے لیکن فارسی اور اردو کی بول چال میں یہ 'تمیز' بروزن خمیر بن گیا ہے اور آج یہی املا مروج ہے۔ فعل کی خصوصیات سے مراد اس کی زمانی، مقامی، طوری اور مقداری حالت ہے۔ ان کے علاوہ بھی متعلق فعل اسم، صفت، ضمیر۔ مصدر، حروف ربط کی ظرفی اور طوری حالت وغیرہ سے بنتے ہیں۔ متعلق فعل کی زمانی، مقامی، طوری اور مقداری حالت کا معنوی سطح پر تعین کرنے کے لیے کتنا، کیسا، کب اور کہاں جیسے سوالات سے حاصل ہونے والے جوابات معاونت کر سکتے ہیں۔ متعلق افعال کی تقسیم تین بنیادوں پر ہو سکتی ہے۔ (الف) استعمال کی بنیاد پر (ب) ہئیت کی بنیاد پر اور (ج) معنی کی بنیاد پر۔

(الف) استعمال کی بنیاد پر:

(1) جن متعلق افعال کا استعمال جملے میں آزادانہ طور پر ہوتا ہے، جیسے ہائے! میں اب کیا کروں، جلدی آؤ پیارے۔ وغیرہ۔ ان دونوں مثالوں میں بالترتیب 'اب اور جلدی' ایسے آزاد متعلق افعال (صرفیے) ہیں جن کے بغیر بھی یہ فقرے اپنا مفہوم ادا کر دیتے ہیں۔

(2) جو متعلق افعال، فقرے یا جملے کی بامعنی اکائیوں سے جڑے رہتے ہیں۔ جیسے جب لیلیٰ ہی نہیں تو میں جی کے کیا کروں گا۔ جہاں ریگستان دکھائی دیتا ہے، کبھی وہاں پانی ہوا کرتا تھا۔ یاد رہے کہ جب، جہاں، جوں، جتنا جیسے متعلق افعال ضمیر موصولہ ''جو'' سے بنتے ہیں۔

(3) بعض متعلق فعل ایسے ہوتے ہیں جو کلمے کی کسی بھی قسم سے منسلک ہو جاتے ہیں، جیسے اس نے مجھے پوچھا تک نہیں۔ یہ تو کسی کی جعل سازی دکھائی دیتی ہے۔ ان جملوں میں 'تک' اور 'تو'، متعلق فعل ہیں جو بالترتیب 'پوچھنا' فعل اور 'یہ' ضمیر اشارہ سے جڑے ہیں۔

(ب) ہئیت کی بنیاد پر:

(1) ایسے متعلقہ فعل جو دوسرے اجزائے کلام سے مل کر بنتے ہیں۔

(2) ایسے متعلقہ فعل جو کسی دوسرے لفظ سے نہیں بنتے، جیسے اچانک، پھر، ٹھیک، دور وغیرہ۔

(1) اسما سے بنے متعلق فعل:

اس طرح کے متعلق افعال اسم کے ساتھ فعل جڑنے سے بنتے ہیں جیسے:

دن بھر، دیر رات تک، صبح سویرے، ترتیب سے، بلیوں اچھلنا، پانی پھرنا، بھوکوں مرنا، گلا پھاڑنا۔ گھڑ چال، مستانہ چال، گلی گلی جھانکنا، تم کیا خاک مدد کرو گے وغیرہ۔ اشعارِ غالب کے نحوی نظام میں ضرورت شعری کے تحت جملے کی بامعنی صرفی اکائیاں اکثر قواعدی ضابطے سے ہٹ کر اپنے مقامِ معینہ کو بدل دیتی ہیں۔ متعلق فعل کے الفاظ میں بھی اس طرح کا تغیر رونما ہوتا ہے۔ مثلاً

مستانہ طے کروں ہوں رہِ وادیِ خیال
تا بازگشت سے نہ رہے مدعا مجھے
یاں صبح دم جو دیکھیے آکر تو بزم میں
نے وہ سرود و شور نہ جوش و خروش ہے
بوئے گل، نالۂ دل، دودِ چراغِ محفل
جو تری بزم سے نکلا سو پریشاں نکلا
بے صرفہ ہی گزرتی ہے ہو گرچہ عمر خضر
حضرت بھی کل کہیں گے کہ ہم کیا کیا کیے
ہنسا کچھ کھلکھلا کر پہلے، پھر مجھ کو جو پہچانا
تو یوں رویا کہ جوئے خوں بہی پلکوں کے داماں سے

مندرجۂ بالا اشعار میں 'مستانہ طے کرنا، صبح دم دیکھنا، پریشان نکلنا' بے صرفہ گزرنا اور کھلکھلا کر ہنسا، پانچوں اسم سے جڑ کر بنے متعلق فعل ہیں۔ ان اشعار کے تمام متعلق فعل، فعل کی کیفیت بھی بیان کر رہے ہیں۔ آخری مثال میں کھلکھلا کر ہنسا حالیہ معطوفہ بطور متعلق فعل استعمال ہوا ہے۔ بعض اوقات اسم کے آگے 'سے' (نشان گرِ وصف فعل) لگانے سے بھی متعلق فعل بن جاتے ہیں جیسے

نہ کہیو طعن سے پھر تم کہ 'ہم ستم گر ہیں'
مجھے تو خو ہے کہ جو کچھ کہو ''بجا کہیے''

اس شعر میں 'طعن سے کہنا' یہ فقرہ طعن (اسم) سے (نشان گرِ وصفِ فعل) اور کہنا (فعل) کے بامعنی تعملات سے بنا ہے۔ چونکہ اس فقرے میں 'طعن'، کہنا فعل کی خوبی کا مظہر ہے۔

اس لیے قواعد کی رو سے یہ متعلق فعل کے زمرے میں آتا ہے۔ اردو میں اسم کے آگے یوں 'سے' لگنے سے بالعموم متعلقِ فعل کی صورت بن جاتی ہے جیسے صبح سے، بھولے سے، محبت سے دن بھر سے وغیرہ۔ غالب کا یہ شعر بطور مثال پیش کیا جاسکتا ہے۔

اس رنگ سے اٹھائی کل اس نے اسد کی نعش
دشمن بھی جس کو دیکھ کے غم ناک ہو گئے

یہاں نعش اٹھانے کے ڈھنگ رطریقے کو اجاگر کیا گیا ہے۔ اس لیے 'اس رنگ سے' متعلق فعل ہوا۔

عجب نشاط سے جلاد کے چلے ہیں ہم آگے
کہ اپنے سائے سے سر پاؤں سے ہے دو قدم آگے

اس شعر میں جلاد کے آگے چلنے کے طریقے کو بتایا گیا ہے۔ 'نشاط سے چلنا' یہ 'عجب نشاط سے ہم جلاد کے آگے چلے ہیں' اس حال مطلق والے جملے کی طویل اکائی ہے جس میں چلنے کے فعل کی خوبی بتائی گئی ہے۔ اس لیے 'عجب نشاط سے' یہاں متعلق فعل کہلائے گا۔ اسی نوع کا یہ شعر بھی ہے۔

زندگی اپنی جب اس شکل سے گزری غالب
ہم بھی کیا یاد رکھیں گے کہ خدا رکھتے تھے

یہاں زندگی کا 'اس شکل سے گزرنا' میں 'اس شکل' اسم اشارہ ہے اور 'گزرنا' فعل کی خوبی بیان کر رہا ہے۔

(2) ضمائر سے بنے متعلق فعل:

اس طرح کے متعلق افعال ضمائر کے ساتھ فعل جڑنے سے بنتے ہیں جیسے یہاں، وہاں، ادھر، ادھر، جدھر، کدھر، ضمائر سے بنے ایسے متعلق افعال مکانی کہلاتے ہیں۔

متعلق فعل مکانی کی دو قسمیں ہیں (1) ظرفی: جیسے یہاں، وہاں، آگے رسامنے، پیچھے، اندر، باہر، نیچے، اوپر، پاس، قریب، دور وغیرہ اور (2) طرفی: جیسے ادھر، ادھر، کدھر، جدھر، دائیں بائیں، اس طرف، اُس طرف، شرقی ر شرقاً، غربی رغرباً، شمالی رشمالاً، جنوبی رجنوباً وغیرہ۔ ضمائر سے بنے متعلق افعال میں کبھی کبھی کام کرنے کا وقت ظاہر ہوتا ہے، جیسے اب، جب، آج، کل، صبح سویرے، آگے، شب و روز، رفتہ رفتہ، دھیرے دھیرے وغیرہ۔ غالب کے کلام میں ان متعلق افعال کی مثالیں مل جاتی ہیں۔ جیسے

جو آؤں سامنے ان کے تو مرحبا نہ کہیں
جو جاؤں واں سے کہیں کو تو خیر باد نہیں

(سامنے، واں [وہاں] مکانی ظرفی)

رات کے وقت مے پیے، ساتھ رقیب کو لیے
آوے وہ یاں خدا کرے، پر نہ کرے خدا کہ یوں

(یاں۔ مکانی ظرفی)

منظر اک بلندی پر اور ہم بنا سکتے
عرش سے ادھر ہوتا کاش کہ مکاں اپنا

(بلندی پر۔ مکانی ظرفی، اُدھر۔ مکانی طرفی)

آگے آتی تھی حالِ دل پہ ہنسی
اب کسی بات پر نہیں آتی

(آگے، اب زمانی متعلق فعل)

اس شعر میں حالِ دل پر ہنسی آنے اور نہ آنے کے وقت کی نشاندہی کر دی گئی ہے۔

بازیچۂ اطفال ہے، دنیا، مرے آگے
ہوتا ہے شب و روز تماشا مرے آگے

(آگے، متعلق فعل مکانی۔ شب و روز، متعلق فعل زمانی)

شاعر نے مندرجۂ بالا اشعار میں لفظ 'آگے' کا استعمال متعلق فعلِ زمانی اور متعلق فعل مکانی دونوں طرح کیا ہے۔

غالب کے یہاں بعض اشعار ایسے بھی ملتے ہیں جن میں زمانی و مکانی دونوں متعلقہ افعال کی ترجمانی ایک ساتھ ہوئی ہے جیسے

مند گئیں کھولتے ہی کھولتے آنکھیں غالب
یار لائے مرے بالیں پہ اسے پر کس وقت

اس شعر میں آنکھیں بند ہو جانے کے بعد یار کو بالیں پر لانے کی بات کہی گئی ہے۔ اس میں لانے کا وقت اور مقام وقت دونوں متعلق افعال کا ذکر ہے۔ اسی انداز کا یہ شعر بھی ملاحظہ ہو

مند گئیں کھولتے ہی کھولتے آنکھیں ہے ہے
خوب وقت آئے تم اس عاشقِ بیمار کے پاس

ان دونوں اشعار میں تاسف کے جذبے کو دو طرح سے واضح کیا گیا ہے۔ پہلے شعر میں استفہام کے ذریعے اور دوسرے شعر میں حرف فجائیہ 'ہے ہے' کے ذریعے۔

(3) طوری متعلق فعل:

اس نوع کے متعلق افعال کام کی نوعیت، طور طریقے کا اظہار کرتے ہیں۔ اس کی پہچان 'کیسا' سوال پوچھنے سے ہو جاتی ہے، جیسے چٹ پٹ، جلدی جلدی، رفتہ رفتہ، چپکے چپکے وغیرہ۔ جملوں میں ان کا استعمال بالعموم فعل سے پہلے ہوتا ہے۔ مثلاً زید چٹ پٹ تیار ہو گیا۔ وہ جلدی جلدی چلنے لگا۔ فعل کے طور طریقوں کا اظہار کرنے والے متعلق افعال کی تعداد اتنی زیادہ ہے کہ انھیں کسی خاص قسم کے اندر رکھنا ذرا مشکل امر ہے، اس لیے ان کی صرف نشاندہی کافی ہوگی۔ چند متعلق افعال درج ذیل ہیں۔ ایسے، ویسے، جیسے، اچانک، بآسانی، بہ دیر، بالمشافہ، یونہی، پیدل، آپ ہی آپ، یکا یک، بغور، حسبِ منشا، حسبِ ضرورت، بے شک، دراصل، ہاں، جی، ٹھیک، بجا، اس لیے، تو، ہی، بھی، بھر، تک وغیرہ۔ ان کے علاوہ جبراً، فوراً، مثلاً، بعینہٖ، فی الفور، بالکل، بقدر، ہر چند، غالباً، یقیناً، فی الحقیقت، چنانچہ، لہٰذا، کما حقہ، قس علیٰ ہذا۔ غالب کے یہاں ان کے استعمال کی مثالیں مل جاتی ہیں جیسے

ہر چند ہو مشاہدۂ حق کی گفتگو
بنتی نہیں ہے بادہ و ساغر کہے بغیر

(ہر چند۔ متعلق فعل)

ع: طاقت بقدر لذت آزار بھی نہیں

(بقدر۔ متعلق فعل)

(4) تکرار فعل سے بنے متعلق فعل:

کبھی کبھی افعال کی تکرار سے فعل کی حالت کا اندازہ ہو جاتا ہے۔ جیسے رفتہ رفتہ، بیٹھے بیٹھے، چلتے چلتے وغیرہ۔ غالب کے اشعار میں متعلق افعال کی یہ مثالیں بھی مل جاتی ہیں۔ جیسے

سختی کشانِ عشق کی پوچھے ہے کیا خبر
وہ لوگ رفتہ رفتہ سراپا الم ہوئے

(رفتہ رفتہ۔ متعلق فعل)

تم اپنے شکوے کی باتیں نہ کھود کھود کر پوچھو
حذر کرو مرے دل سے کہ اس میں آگ بھری ہے

(کھود کھود کر۔ متعلق فعل)

ع: چپکے چپکے جلتے ہیں جوں شمع ماتم خانہ ہم

(چپکے چپکے۔ متعلق فعل)

ان تینوں اشعار میں کام کی طوری حالت بتائی گئی ہے۔ یعنی رفتہ رفتہ سراپا الم ہونا اور بات کو کھود کھود کر پوچھنا اور چپکے چپکے جلنا۔

(5) مصادر سے بنے متعلق فعل:

متعلق فعل مصادر سے بھی بنتے ہیں، جیسے آتے، کرتے، دیکھتے ہوئے، مرتے ہوئے، بیٹھے ہوئے، چاہے، لیے، مانو وغیرہ۔ غالب کے یہاں اس قسم کے متعلق افعال کا استعمال ہوا ہے جیسے

آگہی دام شنیدن جس قدر چاہے بچھائے
مدعا عنقا ہے اپنے عالم تقریر کا

(جس قدر چاہے سے بچھانا فعل کا وصف بیان ہوتا ہے)

اس شعر کے پہلے مصرع کی نثر یوں ہوگی: آگہی، جس قدر

چاہے دامِ شنیدن بچھائے۔جس کی رو سے' دامِ شنیدن بچھانے' کےفعل کا وصف 'جس قدر چاہئے' سے ظاہر ہو رہا ہے۔

جی ڈھونڈتا ہے پھر وہی فرصت کے رات دن
بیٹھے رہے تصورِ جاناں کیے ہوئے

(کیے ہوئے،'کرنا' فعل کی صفت بیان کر رہا ہے)

(ج) معنی کے اعتبار سے متعلق فعل:

معنی کے اعتبار سے متعلق فعل کی چار قسمیں ہیں (1) متعلق فعل مکانی (2) متعلق فعل زمانی (3) متعلق فعل طوری (4) متعلق فعل مقداری۔گزشتہ صفحات میں اولین تین قسموں پر غور کیا جا چکا ہے۔اب یہاں متعلق فعل مقداری پر غور کیا جائے گا۔مقدار کے میزان کی تقسیم یوں کی جاسکتی ہے۔(الف) مقدارِ قلیلی (ب) مقدارِ کثیری اور (ج) مقدارِ تدریجی۔

مقدارِ قلیلی، متعلق فعل کی وہ قسم ہے جس کے ذریعے کام میں پائی جانے والی کمی ظاہر ہوتی ہے۔جیسے، کچھ، لگ بھگ، چند، تک، ذرا، چندے، رمق، عنقا وغیرہ۔ان مقداری متعلق فعل میں 'چندے' کی مختلف شکلیں مختلف معنی کے ساتھ اردو شاعری میں نظر آتی ہیں، مثلاً غالب کہتے ہیں۔

رہے اس شوخ سے آزردہ ہم چندے تکلف سے
تکلف بر طرف، تھا ایک اندازِ جنوں وہ بھی

پھر اپنے مرنے والے سے یہ کہہ لو
ذرا اور آپ چندے جیے جائیں

(جلال)

ان دونوں اشعار میں غالب اور جلال نے 'چندے' کا استعمال کچھ روز یا کچھ مدت کے لیے کیا ہے لیکن اردو محاورے اور ضرب الامثال میں اس لفظ کے معنی بدل جاتے ہیں، جیسے چندے آفتاب چندے ماہتاب' اس مثل میں 'چندے' کے معنی بے مثل کے ہیں۔غالب نے ایک پوری غزل میں متعلق فعل 'چند' کا استعمال مقدار کی کمی کے لیے کیا ہے۔

دلِ بیتاب کے سینے میں دمِ چند رہا
بدمِ چند گرفتارِ غمِ چند رہا

زندگی کے ہوے ناگہ نفس چند تمام
کوچۂ یار جو مجھ سے قدمِ چند رہا

پہلے شعر میں 'دم' ذو معنی کے طور پر استعمال ہوا ہے۔پہلے معنی اس کے سانس کے ہیں اور دوسرے معنی ساعت / وقفہ / لمحہ کے ہیں۔شاعر نے اس شعر میں نحوی کرتب بازی دکھانے کی کوشش کی ہے۔پہلے مصرع میں 'دلِ بیتاب' کے سینے میں چند ساعت رہنے کی بات کہی گئی ہے۔دوسرا مصرع پہلے مصرع کی خبر بیان کر رہا ہے کہ (دلِ بیتاب) سینے کے اندر چند سانسوں تک غم میں گرفتار رہا ہے۔اس مصرع میں 'چند' کا دو بار استعمال ہوا ہے۔پہلے 'چند' کا تعلق 'دم' یعنی سانس سے ہے لیکن دوسرے 'چند' کا تعلق جس فقرے سے ہے، اس کی قرأت میں (کالی داس گپتا کے مرتبہ دیوان غالب کے مطابق) 'گرفتار' اور 'غم' دونوں کے نیچے 'زیرِ اضافت کی علامتیں شامل ہیں، جن کی وجہ سے مصرع کی نحوی ساخت پیچیدہ ہو گئی ہے۔ یہاں 'گرفتارِ' کی 'را' کو موقوف الیہ یعنی 'را' بلا اضافت اور اضافت کے ساتھ دونوں طرح پڑھا جا سکتا ہے۔غمِ چند کے معنی یہاں معمولی غم کے زیادہ مناسب ہیں ورنہ 'غم' کو جمع کی صورت میں تسلیم کرنا پڑے گا، لیکن چند غم کہنا محاورہ نہیں ہے۔ دل بیتاب کا سینے میں دم چند یعنی تھوڑی ساعت رہنے کی بات کہنے کی وجہ سے 'دمِ چند، رہنا اس فعل کا متعلق فعل بن گیا ہے۔دوسرے مصرع میں دم (سانس) اور گرفتارِ غم دونوں کا متعلق فعل 'چند' ہی ہے۔

دوسرے شعر کے پہلے مصرع میں نفس کے معنی سانس اور ساعت / گھڑی دونوں لیے جا سکتے ہیں۔یعنی ناگاہ زندگی کی چند گھڑیاں ختم ہوئیں۔یا ناگاہ زندگی کی چند سانسیں تمام / ختم ہوئیں۔پہلا مصرع معنی کے لحاظ سے دوسرے مصرع سے مربوط ہے۔اس لیے مکمل شعر کے معنی ہوں گے،" کوچۂ یار جب مجھ سے چند قدم ہی رہ گیا تھا، ناگاہ زندگی کی باقی چند سانسیں / گھڑیاں تمام ہوئیں۔ یہاں پہلے مصرع میں متعلق فعل 'چند' کی نسبت نفس سے اور دوسرے مصرع میں 'قدم' سے ہے۔اس طرح اوپر کی تمام مثالوں میں یہ متعلق فعل تخفیفِ عمل کے نشان گر بن گئے ہیں۔قلتِ شے کی سب سے ادنیٰ حالت کے لیے 'عنقا' یعنی عدم وجود کا استعمال کیا جاتا ہے۔اس سے مراد ایسی شے جس کا کوئی وجود نہیں۔غالب نے 'مدعا عنقا ہے' اور 'عنقا ارمی، جیسی تراکیب تخفیفِ اشیا کے لیے استعمال کی ہیں۔اسی نوع کا ایک لفظ 'رمق' بھی ہے یہ انتہائی قلیل شے کے لیے استعمال ہوتا ہے۔غالب کے کلام میں مجھے اس کی کوئی مثال نہیں ملی۔

دوسری قسم مقدار کثیری ہے اس سے مراد وہ مقدار جس سے کسی شے کی زیادتی کا اظہار مطلوب ہو۔جیسے بہت، خوب، زیادہ، انتہا، بہت زیادہ، وفور وغیرہ۔غالب کے کلام میں متعلق فعل مقداری کے استعمال کی مثالیں مل جاتی ہیں، لیکن انھوں نے کثرتِ مقداری کے اظہار کے لیے بعض محاوراتی مرکبات سے بھی کام لیا ہے، مثلاً بیک وقت کئی چیزوں کا ہاتھ لگ جانا، اس کے لیے فارسی کا محاورہ 'بیک کف بردنِ صد دل' استعمال ہوتا ہے۔گویا مقدار کی کثرت کا اظہار اس محاورے سے ہوتا ہے۔غالب نے ایک شعر میں اسے برتا ہے۔

شمارِ سبحہ مرغوب بتِ مشکل پسند آیا
تماشائے بیک کف بردنِ صد دل پسند آیا

سبحہ کو عرف عام میں تسبیح کہتے ہیں جس کے اندر سو دانے ہوتے ہیں اور ذکر کرتے ہوئے ان دانوں کو پھیرا جاتا ہے۔تسبیح پھیرنے کا یہ عمل صرف ایک ہاتھ کی انگلیوں پر بہ آسانی کیا جاتا ہے۔معشوق کو تسبیح پھیرنے کا یہ عمل اس لیے مرغوب ہے کہ وہ بھی ہاتھ کے ایک اشارے سے سو دلوں کو اپنی جانب پھیر سکتا ہے۔یہاں اگرچہ بیک کف بردن صد دل میں صفت عددی ہے لیکن کئی دلوں پر یکساں قابو پانے کے جو معنی نکلتے ہیں وہ بردن یعنی 'اڑا لینا' کی خصوصیت کی طرف مراجعت کرتے ہیں۔غالب کے دیوان کی پہلی غزل میں تنہائی کی حالت میں شام کے صبح کرنے کی دشواری کو جوئے شیر لانا کہا گیا ہے۔یعنی تنہائی کی رات گزارنا نہایت سخت کام ہے، جیسے پہاڑ کھود کر جوئے شیر لانا۔ان معنوں میں شام کا صبح کرنا کے عمل کا متعلق فعل جوئے شیر لانا ہے۔چونکہ جوئے شیر لانا یہ محاورہ کام کی نہایت سختی یا دشواری کے لیے استعمال ہوا ہے، اس لیے غالب کے شعر میں جوئے شیر لانا متعلق فعل کے زمرے میں آئے گا۔

مقدارِ تدریجی میں ان متعلق افعال کا شمار ہوتا ہے جو کسی شے یا فعل کی بتدریج کمی یا اضافے کا اظہار کرتے ہیں۔جیسے تھوڑا تھورا، کم کم، باری باری، تل تل، پل پل وغیرہ۔بعض اوقات مصادر سے سابقے جوڑ کر بھی متعلق فعل بنائے جاتے ہیں۔جیسے انجانا، بے گانا، بے قصور، بخیر، بالجبر، بالمشافہ، بدستور، نڈر، در اصل، در حقیقت، ہر گھڑی، ہر دن، ہر پل، بلاضرورت، ناگہاں، فی الفور، ہر چند وغیرہ۔بعض افعال سے لاحقے جوڑ کر بھی متعلق فعل بنائے جاتے ہیں۔جیسے جبراً، فوراً، قصداً، مثلاً، ہفتہ وار، ماہوار وغیرہ۔ان کے علاوہ بھی بیسیوں الفاظ اردو میں رائج ہیں جو بطور متعلق فعل استعمال ہوتے ہیں۔غالب کے یہاں ان کا استعمال بھی ہوا ہے لیکن نحوی تراکیب کے متاثر ہونے کی ان کے یہاں کوئی مثال نہیں ملتی اور نہ ہی حسن بیان کے اضافے کا وہ سبب بنے ہیں۔ان الفاظ (متعلق افعال) کے استعمال کے دوران نثری نحوی ساخت اور شعری نحوی ساخت میں کوئی فرق نظر نہیں آتا۔

■

Dr. Syed Yahya Nasheet
24, Kashana KALGAON
Dist. Yavatmal 445203 (MS)

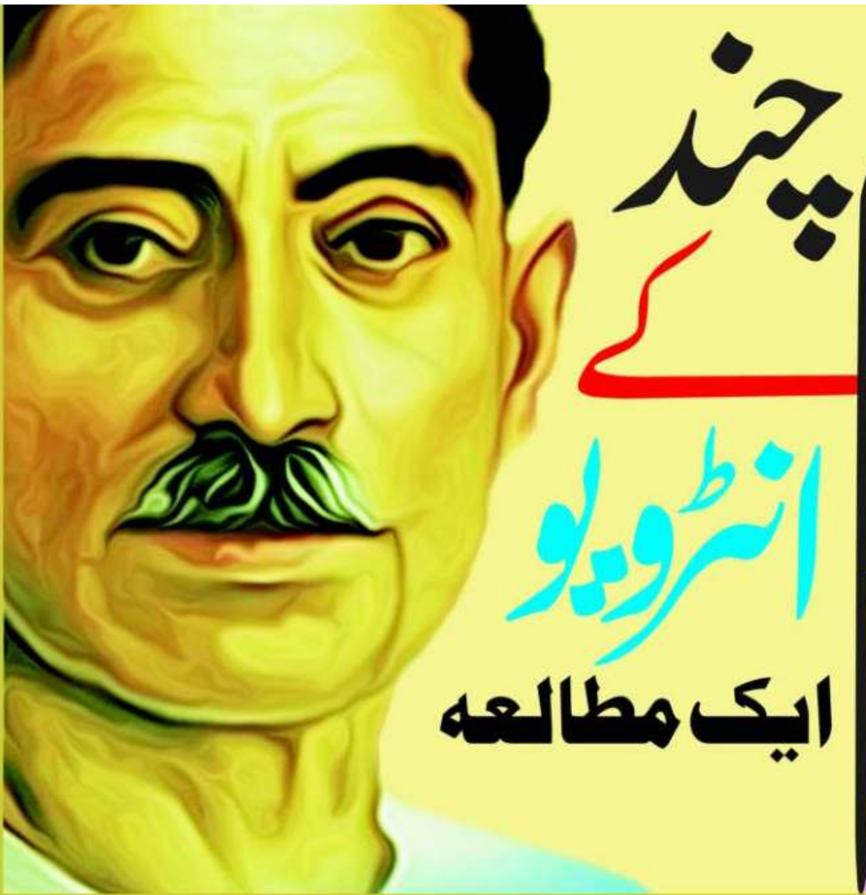

پریم چند کے انٹرویو

ایک مطالعہ

منی بھوشن کمار

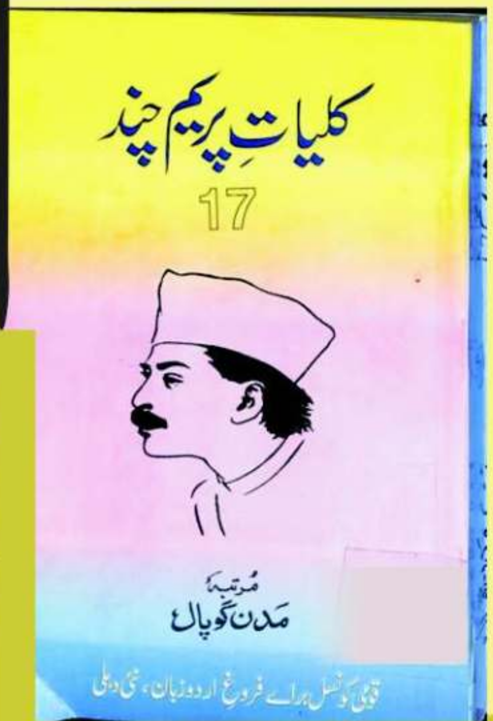

کلیات پریم چند (ناشر: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی؛ اپریل، جون۔ 2004) کی آخری جلد (24) کا پانچواں باب پریم چند (31 جولائی 1880۔ 8 اکتوبر 1936) کے انٹرویو سے آراستہ ہے۔ اس کلیات کے مرتب مدن گوپال نے مذکورہ جلد میں پریم چند کے پانچ انٹرویو کو یکجا کیا ہے۔ یہ انٹرویو 1934-1930 کے اثنا میں شائع ہوئے تھے۔ پہلا انٹرویو بنارسی داس چترویدی کے خط کے جواب کی شکل میں سامنے آیا۔ دوسرا اور تیسرا انٹرویو فلمی دنیا کے دو رسالوں سے متعلق ہیں۔ جب کہ آخری دو انٹرویو 'اندر ناتھ مدان' اور 'شری رانگے کر' کی کوششوں کے نتائج ہیں۔ اس کلیات میں مرتب مدن گوپال نے کہیں بھی یہ دعویٰ نہیں کیا ہے کہ پریم چند کے انٹرویو کی کل تعداد پانچ ہی ہے۔ پریم چند کی وسیع تخلیقی دنیا کو دیکھتے ہوئے ایسا خیال مناسب بھی نہیں ہوتا۔ اس لیے مستقبل قریب میں ان انٹرویو کی تعداد میں اضافہ ہو جائے تو یہ کوئی حیرت کی بات نہیں ہوگی۔ یہ امر قابل ذکر ہے کہ اردو میں شائع یہ انٹرویو مرتب مدن گوپال کو ہندی زبان میں حاصل ہو سکے تھے اور انھوں نے ان انٹرویو کو اردو میں فقط تبدیلی رسم خط کے ساتھ پیش کیا ہے۔

پریم چند کے انٹرویو کے معروضی مطالعے سے قبل یہ سوال لائق توجہ ہے کہ ان انٹرویو کی عصر حاضر میں افادیت کتنی ہے؟ پریم چند کے وسیع جہان تخلیق کا ناقدین نے گہرا مطالعہ کیا ہے۔ قمر رئیس، مدن گوپال، پردیپ جین، رام بلاس شرما، گوپال رائے، کمل کشور گوینکا — یہ اردو اور ہندی کے ان قلم کاروں کے اسما ہیں جنھوں نے اپنی تحریر اور زندگی کا اہم حصہ ادبیات پریم چند پر نثار کر دیا۔ 1986 میں پریم چند کی وفات کے 50 برس مکمل ہونے کے بعد پریم چند کی تخلیقات کو شائع کرنے والے ناشروں کا سیلاب آ گیا۔ اس کے سبب عہد ماضی سے ہر دلعزیز پریم چند کی تخلیقات کا دور دراز کے علاقوں میں پہنچنے کا سلسلہ تیز سے تیز تر ہوا۔ شاید یہی وجہ ہے کہ پریم چند سے متعلق نوخیز مصنفین کی تحریریں برابر سامنے آ رہی ہیں۔ بہ طور نتیجہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ تخلیقات پریم چند کے کئی پہلوؤں کا ابھی سامنے آنا باقی ہے اور ان پہلوؤں کو ظاہر کرنے میں پریم چند کے انٹرویو مفید ثابت ہو سکتے ہیں۔ ان کے ذریعے جہاں پریم چند کی تخلیقات کو سمجھنے کی راہ ہموار ہوگی وہیں پریم چند کی شخصیت اور خیالات کو بھی ان کی حقیقی شکل میں نشان زد کیا جا سکے گا۔ اس مختصر تمہید کے بعد اب براہ راست پریم چند کے انٹرویو پر بات کرتے ہیں۔

11 مئی 1930 کو کلکتہ سے شائع ہونے والے ہندی رسالہ 'وشال بھارت' کے مدیر بنارسی داس چترویدی نے کلکتہ سے پریم چند کو ایک خط لکھا۔ چترویدی جی کی خواہش تھی کہ وہ پریم چند پر کسی انگریزی اخبار مثلاً 'سمجھوتا'، 'لیڈر'، وغیرہ میں کچھ لکھیں۔ اس مقصد سے انھوں نے سات سوالوں کا جواب پریم چند سے اپنے خط میں مانگا تھا۔ یہ سات سوال اس طرح ہیں:

"1. آپ نے گلپ (افسانہ) لکھنا کب پرارنبھ (شروع) کیا؟

2. اپنی کون کون سی گلپ (افسانہ) آپ کو سروُتم (بہترین) لگتی ہے؟

3. آپ کی لیکھن شیلی (طرز تحریر) پر دیشی یا ودیشی کن کن گلپ لیکھکوں (افسانہ نگاروں) کی رچنا (تخلیقات) کا پربھاؤ (اثر) پڑا ہے؟

4. آپ کو اپنے گرنتھوں (کتابوں) سے رچناؤں (تخلیقات) سے کیا ماسک آئے (ماہانہ آمد) ہو جاتی ہے؟

5. ہندی میں گلپ ساہتیہ (افسانوی ادب) کی ورتمان

پرگتی (موجودہ ترقی) کے وشے (موضوع) میں آپ کے کیا وچار (خیال) ہیں؟

6 آپ کی رچناؤں (تخلیقات) کا انوواد (ترجمہ) کن کن بھاشاؤں (زبانوں) میں ہوا ہے؟

7. آپ کی آکانچھائیں (خواہشیں) کیا کیا ہیں؟'' (ص: 338)

ان سات سوالوں کے علاوہ بنارسی داس چترویدی نے پریم چند سے ان کی حالیہ تصویر بھی مانگی تھی۔

پریم چند نے ان سات سوالوں کے جواب اپنے 3 جون 1930 کو لکھے خط میں دیا۔ ان سوالوں کے جوابات ہی پریم چند کے پہلے انٹرویو کی شکل میں کلیات پریم چند کی جلد 24 میں درج ہیں۔ مذکورہ سات سوالوں میں سے پانچ کا تعلق پریم چند کی قلمی زندگی سے ہے۔ آخری سوال ذاتی نوعیت کا ہے جب کہ پانچواں سوال ہندی میں افسانوی ادب کی موجودہ رفتار پر پریم چند کی رائے سے متعلق ہے۔ پہلے سوال کے مختصر جواب میں پریم چند نے اپنی افسانہ نگاری کا ابتدائی سنہ 1907 بتایا ہے۔ 'سوز وطن' نام سے پہلا افسانوی مجموعہ 1907 میں 'زمانہ پریس' سے شائع ہوا جسے حمیر پور کے کلکٹر نے باغیانہ سمجھ کر نذر آتش کرا دیا تھا۔ اس واقعے کے بعد سوز وطن کا ترجمہ کئی مجموعوں اور رسالوں میں شائع ہوا۔ یہاں دو باتیں خصوصاً قابل غور ہیں۔ اوّل یہ کہ 'سوز وطن' کی پہلی اشاعت 'زمانہ پریس' سے ہوئی۔ 'سوز وطن' کی اشاعت کے متعلق بعض محققین نے یہاں تک کہا ہے کہ 1907 میں پریم چند کی کوئی تخلیق 'زمانہ' میں شائع نہیں ہوئی تھی۔ محققین نے غالباً اس بات پر غور نہیں کیا کہ بقول پریم چند ان کا پہلا افسانوی مجموعہ 'زمانہ پریس' سے شائع ہوا نہ کہ 'زمانہ' رسالہ میں۔ سند رہے کہ 'زمانہ' نام سے رسالے کی اشاعت بھی پریم چند کی زندگی میں ہوتی تھی اور اسی نام سے مطبع بھی موجود تھا۔ دوسری اہم بات یہ ہے کہ 'سوز وطن' افسانوی مجموعے کو ممنوعہ قرار نہیں دیا گیا تھا۔ یہ مجموعہ اپنی اشاعت کے ساتھ حمیر پور کے کلکٹر کی بدنیتی کا شکار ضرور ہوتا ہے لیکن اس کا ترجمہ کئی مجموعوں اور رسالوں میں شائع ہوتا رہا۔ اگر اسے ممنوعہ قرار دیا گیا ہوتا تو اس کی متعدد اشاعتیں ناممکن تھیں۔

دوسرا سوال 'اپنی کون کون سی گلپ (افسانہ) آپ کو سروتم (بہترین) لگتی ہے؟' کا جواب دینے میں پریم چند کے سامنے تذبذب کی کیفیت پیدا ہونا فطری ہے۔ یہاں پریم چند نے اپنی پندرہ کہانیوں کا ذکر کیا ہے جس میں 'بڑے گھر کی بیٹی' اور 'نمک کا داروغہ' جیسی اعلا درجے کی تخلیقات شامل ہیں۔ ان پندرہ افسانوں کے علاوہ 'منزل مقصود' نام سے تصنیف شدہ اصل اردو کہانی کا بھی پریم چند نے الگ سے ذکر کیا ہے جس کا اس وقت تک ہندی میں ترجمہ نہیں ہو سکا تھا۔

تیسرا سوال جو پریم چند کے تخلیقی عمل پر دیسی بدیسی افسانہ نگاروں کے اثر سے متعلق ہے، کے جواب میں پریم چند کہتے ہیں کہ ان پر کسی خاص مصنف کا اثر نہیں پڑا۔ اسی کے ساتھ پریم چند کا اعتراف ہے کہ بہت کچھ پنڈت رتن ناتھ لکھنوی' اور تھوڑا سا 'رویندر ناتھ ٹھاکر' کا اثر پڑا۔ یہاں انھوں نے کسی غیر ملکی مصنف کا ذکر نہیں کیا ہے۔ حالاں کہ ایک دوسرے انٹرویو میں پریم چند اسی حوالے سے کچھ بدیسی مصنفین کا ذکر کرتے ہیں جن کا آئندہ ذکر ہوگا۔ بنگلہ ادیب رویندر ناتھ ٹھاکر کے نام اور تحریروں سے تو پوری دنیا واقف ہے۔ 'پنڈت رتن ناتھ لکھنوی' تو اردو ادب کی شان ہیں۔ 'فسانۂ آزاد' ان کی مشہور ترین تخلیق ہے جس سے اردو کے کئی نامور ادیبوں نے اپنے تخلیقی سفر میں استفادہ کیا۔ فسانۂ آزاد کی ضخیم جلدوں میں موجود بے حد وسیع متن کو معروف ناقدین نے داستان اور ناول کی درمیانی کڑی قرار دیا ہے۔ پریم چند پر فسانۂ آزاد کے اثر کو اس طور پر بھی دیکھا جا سکتا ہے کہ وہ اس کے ہندی مترجم بھی ہیں۔

چوتھے سوال میں چترویدی جی نے پریم چند سے کتابوں اور تخلیقات سے ہونے والی 'ماہانہ آمد' کے متعلق دریافت کیا ہے۔ اس کے جواب میں پریم چند نے 'ماہانہ آمد' کی جگہ پر تخلیقی عمل سے اس وقت تک ہوئی کل آمد کی تفصیل پیش کی ہے۔ یہاں بہ آسانی دیکھا جا سکتا ہے کہ ہندستانی ادب کا یہ تاج، کس قدر عسرت میں زندگی گزار رہا تھا!

پریم چند کے تخلیقی عمل سے جڑا پانچواں اہم سوال (سوال نمبر 6) ان کی تخلیقات کے دیگر زبانوں میں تراجم سے متعلق ہے۔ یہاں پریم چند اطلاع دیتے ہیں کہ ان کی بعض تخلیقات کا ترجمہ مراٹھی، گجراتی، اردو اور تمل میں ہوا۔ اس کے علاوہ جاپانی اور انگریزی میں بھی ان کی تین چار کہانیوں کا ترجمہ اس وقت تک شائع ہو چکا تھا۔ پریم چند کے مطابق ان کی تخلیقات کا سب سے زیادہ ترجمہ اردو میں ہوا اور اس کے بعد مراٹھی میں۔ تمل اور تیلگو میں ان کی تخلیقات کا ترجمہ ہوا یا نہیں، اسے لے کر پریم چند مطمئن نہیں تھے۔ کچھ صاحبان نے ان زبانوں میں ترجمے کی اجازت پریم چند سے مانگی تھی جو انھوں نے دے دی۔ تمل اور تیلگو میں تخلیقات کے ترجمہ ہونے کی اطلاع، پریم چند کے پاس اتنی ہی تھی۔

تخلیقی عمل سے جڑے سوالوں کے بعد پانچویں سوال ہندی میں افسانوی ادب کی موجودہ رفتار سے متعلق پریم چند کے خیالات پر آتے ہیں۔ یہاں پریم چند کے خیالات ملاحظہ کریں:

''ہندی میں گلپ ساہتیہ (افسانوی ادب) ابھی اتینت پرارمبھک دشا (بے حد ابتدائی حالت) میں ہے۔ کہانی لکھنے والوں میں سدرشن، کوشک، جینندر کمار، اگر، پرساد، راجیشوری یہی نظر آتے ہیں۔ مجھے جینندر اور اگر میں مَولکتا (نیاپن) اور باہلیہ (کثرت) کے چنہہ (نشان) ملتے ہیں۔ پرساد جی کی کہانیاں بھاواتمک (جذباتی) ہوتی ہیں۔ Realistic نہیں۔ راجیشوری اچھا لکھتے ہیں مگر بہت کم۔ سدرشن جی کی رچنائیں (تخلیقات) سندر (خوب صورت) ہوتی ہیں۔ پر گہرائی نہیں ہوتی اور کوشک جی اکثر باتوں کو بے ضرورت بڑھا دیتے ہیں۔ کسی نے ابھی تک سماج کے کسی وشیش انگ (خاص جزو) کا وشیش روپ سے (خصوصی طور پر) ادھین (مطالعہ) نہیں کیا۔ اگر نے کیا مگر بہک گئے۔ میں نے کرشک (کاشت کار) سماج کو لیا۔ مگر ابھی کتنے ہی ایسے سماج پڑے ہیں۔ جن پر روشنی ڈالنے کی ضرورت ہے۔ سادھوؤں کے سماج کو کسی نے اسپرش (چھوا) تک نہیں کیا۔ ہمارے یہاں کلپنا (تصور) کی پردھانتا (اہمیت) ہے۔ انوبھوتی (احساس) کی نہیں۔ بات یہ ہے کہ ابھی تک ساہتیہ (ادب) کو ہم ووسائے (کاروبار) کے روپ میں نہیں گرہن (قبول) کر سکے۔ میرا جیون (زندگی) تو آرتھک درشٹی سے اسپھل (مالی اعتبار سے ناکام) ہے اور رہے گا۔ 'ہنس' نکال کر میں نے کتابوں کی بچت کا بھی وارا نیارا کر دیا۔ یوں شاید اس سال چار پانچ سو مل جاتے۔ پر اب آشا (امید) نہیں۔'' (ص 480)

یہاں پریم چند ہندی کے افسانوی ادب کو ابتدائی حالت میں دیکھتے ہیں۔ اس وقت تک تخلیق شدہ ہندی ادب پریم چند کی نظر میں 'تخیل اساس' ہے، 'محسوسات' پر مبنی نہیں۔ پریم چند نے اوپر جن تخلیق کاروں کے نام بتائے ہیں، ان میں سے زیادہ تر کی پہچان اب تک محفوظ ہے۔ سدرشن اور کوشک (وشمبھر ناتھ کوشک) پریم چند کی روایت کے مشہور قلم کار ہیں۔ جینندر کمار ہندی ادب میں تحلیل نفسی کے باوا آدم کے طور پر شناخت رکھتے ہیں۔ اگر (پانڈے بے چن شرما اگر) کے یہاں حد درجہ حقیقت نگاری ملتی ہے۔ ساتھ ہی جنسی کج رویوں کو بھی اپنی تحریروں میں انھوں نے اہمیت دی ہے۔ پرساد (جے شنکر پرشاد) ماضی کے واقعات خصوصی طور پر پیش کرتے ہیں۔ پرشاد کا

شمار ہندی ادب میں رومانیت کے اہم ستون میں ہوتا ہے۔ جب کہ راجیشوری اب ایک غیر معروف افسانہ نگار ہیں۔ یہاں بہ آسانی ادیبوں کی شناخت کے متعلق پریم چند کی دور اندیشی کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔

اب اس انٹرویو کے آخری سوال 'پریم چند کے ارمان' پر آتے ہیں۔ پریم چند کا سب سے بڑا ارمان جنگ آزادی میں کامیاب ہونے کا ہے۔ وہ دو چار اعلیٰ درجے کا ناول لکھنا چاہتے ہیں مگر اس کا مقصد بھی حصول آزادی ہی ہے۔ وہ ادب اور اپنے وطن کے لیے مسلسل کچھ نہ کچھ کرنا چاہتے ہیں۔ انھیں موٹر اور بنگلے کا لالچ نہیں ہے۔ فقط عام خوراک اور معمولی کپڑے میسر ہوں، یہی ان کی خواہش ہے۔ اپنی اولاد کے متعلق وہ چاہتے ہیں کہ وہ ایماندار، سچے اور مستحکم ارادے کے ہوں؛ عیاش، دولت منداور خوشامدی اولاد سے انھیں نفرت ہے۔ پریم چند کے ارمانوں کی حد اتنی ہی ہے۔ سمجھا جا سکتا ہے کہ پریم چند کی زندگی اور ان کے خیالوں میں کس قدر سلاست و سادگی ہے! یہاں سادگی اور صلاحیت کے نایاب امتزاج کو دیکھا جا سکتا ہے۔

پریم چند کا دوسرا انٹرویو گجراتی رسالہ 'چتر پَٹ' کے مدیر نے لیا تھا۔ 5 فروری 1934 کو پریم چند کے معروف ناول 'بازارِ حسن' پر فلم سازی کا آغاز بمبئی میں ہوا۔ 'مہالکشمی سنے ٹون کمپنی' کے ذریعے بننے والی اس فلم کے موہورت (فلم سازی کا آغاز) کے وقت پریم چند بھی موجود تھے۔ یہاں پروگرام کے آغاز میں پریم چند کی ایک تقریر ہوئی جسے فلم کے آغاز میں جوڑ دیا گیا۔ اسی موقعے پر پریم چند کا انٹرویو مذکورہ رسالہ کے مدیر نے لیا تھا جس کا ہندی ترجمہ پریم چند کے ہفتہ وار خبر نامہ 'جاگرن' کے 16 فروری 1934 کے شمارے میں شائع ہوا۔ 'چتر پٹ' کا انٹرویو فقط چار سوالوں پر مرکوز ہے اور یہ چاروں سوال پوری طرح فلمی دنیا سے متعلق ہیں۔ پہلا سوال دیکھیے:

''چتر پٹ کلا کے وشے (فلم سازی کے موضوع) میں آپ کے کیا وچار (خیال) ہیں؟'' (ص 482)

اب پریم چند کا جواب ملاحظہ کریں:

''اس وشے (موضوع) میں میں کوئی وشیش ابھیاس (خصوصی مطالعہ) نہیں رکھتا، کنتو (لیکن) میرا ویکتی گت وچار (ذاتی خیال) تو یہ ہے کہ چترپٹ کلا (فن فلم سازی) میں کلا (فن) کا تو ابھی نام بھی نہیں دکھلائی پڑ رہا ہے.... کلا (فن) تو دور رہی، کنتو (لیکن) چترپٹوں (فلم) میں ساہتیہ (ادب) کی چھایا بھی تو نہیں دکھلائی پڑتی۔ ساہتیک درشٹی سے سَروپری (ادبی نقطۂ نظر سے اعلا ترین) کہے جا سکیں، ایسے چترپٹ (فلم) کہیں کوئی بناتا ہے؟.... میں تو ایسی استھیتی (حالت) دیکھنا چاہتا ہوں کہ یہ کلا (فن) سؤ شکشت منشیوں (بہتر تعلیم یافتہ منشی) کے ہاتھ میں آ جائے۔ سو شکشت منشیوں کے اترکت (علاوہ) کلا اتھوا ساہتیہ (فن یا ادب) کی آشا (امید) رکھنی مور کھتا ہے۔'' (ص 482-483)

پریم چند کا سب سے بڑا ارمان جنگ آزادی میں کامیاب ہونے کا ہے۔ وہ دو چار اعلیٰ درجے کا ناول لکھنا چاہتے ہیں مگر اس کا مقصد بھی حصول آزادی ہی ہے۔ وہ ادب اور اپنے وطن کے لیے مسلسل کچھ نہ کچھ کرنا چاہتے ہیں۔ انھیں موٹر اور بنگلے کا لالچ نہیں ہے۔ فقط عام خوراک اور معمولی کپڑے میسر ہوں، یہی ان کی خواہش ہے۔ اپنی اولاد کے متعلق وہ چاہتے ہیں کہ وہ ایماندار، سچے اور مستحکم ارادے کے ہوں؛ عیاش، دولت منداور خوشامدی اولاد سے انھیں نفرت ہے۔ پریم چند کے ارمانوں کی حد اتنی ہی ہے۔ سمجھا جا سکتا ہے کہ پریم چند کی زندگی اور ان کے خیالوں میں کس قدر سلاست و سادگی ہے! یہاں سادگی اور صلاحیت کے نایاب امتزاج کو دیکھا جا سکتا ہے۔

یہاں پریم چند نے آغاز میں ہی واضح کر دیا ہے کہ انھیں اس شعبہ کا کوئی خاص علم نہیں ہے۔ شاید اسی لیے پریم چند فن کو بے حد محدود دائرے میں دیکھتے ہیں۔ پریم چند فن کے مرکز میں ادب کو جگہ دیتے ہیں۔ اس لیے قصے سے ہٹ کر ان کی نظر نہیں جا پاتی ہے۔ جب کہ فلم میں کئی فنون مثلاً ـــــ گلو کاری، موسیقی، رقص، ادا کاری، ہدایت کاری، مکالمہ، انتخاب مناظر، روشنی کا توازن، آرایش شکل وصورت (Make up)، ویڈیوگرافی (Videography) وغیرہ ـــــ کا ایک ساتھ امتحان مقصود ہوتا ہے۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ کسی فلم کو کتنے ناظرین مل سکے، اس سے اس کی کامیابی کا اندازہ لگایا جاتا ہے۔ فلم سازی کا عمل اور نمائش کے ساتھ سینکڑوں لوگوں کا مستقبل ڈوبتا اور طلوع ہوتا ہے۔ جس صنف میں فنون کا اتنا گہرا امتزاج ہو، پریم چند نے وہاں ادبیت کو مرکز میں رکھ کر بالکل سطحی خیال ظاہر کیا ہے۔ یہ ضروری نہیں کہ ادیب کی زندگی میں ہی اس کی تخلیق کو عزت و ثروت حاصل ہو۔ کوئی تخلیق وجود میں آنے کے برسوں بعد بھی اہمیت حاصل کر سکتی ہے مگر فلم کے ساتھ ایسا ہونا تو اب تک ناممکن ہے۔ کوئی فلم اپنی پہلی نمائش (Release) کے ساتھ ہی کامیاب یا ناکام ہو جاتی ہے۔ آئندہ زمانے میں فلموں کی کامیاب یا ناکام حیثیت میں کوئی تبدیلی نہیں آتی۔ اب جب کہ پریم چند نے ابتدا میں ہی اس موضوع کے تئیں اپنی لاعلمی قبول کر لی ہے تو پریم چند کی ان باتوں کو منہا کر کے آگے بڑھنا مناسب ہوگا۔

اس انٹرویو کا دوسرا سوال ہندستانی سنیما کی مغربی فلموں کی کورانہ تقلید سے متعلق ہے۔ اس 'کورانہ تقلید' کے سود و زیاں پر پریم چند کہتے ہیں کہ ''یدی (اگر) بھاؤ (خیال) اچھا ہو، تو انوکرن (تقلید) کچھ ہانی کارک (نقصان دہ) نہیں ہے، کنتو (لیکن) انوکرن (تقلید) کے پیچھے روپے کمانے کا ہیتو (مقصد) نہ ہونا چاہیے۔'' (ص 483) فلم سازی میں حصول دولت مقصد نہ ہو، یہ ناممکن ہے۔ اب اس مقصد کو پورا کرنے کے لیے جو کچھ کرنا پڑے، وہ سب صانع (Producer) اور ہدایت کار (Director) کیا کرتے ہیں۔ اس بات کو پریم چند کی سادگی پر محمول کرنا بہتر ہوگا۔ حالانکہ پریم چند، بنارسی داس چترویدی کو دیے گئے انٹرویو میں ادب کو کاروبار کے طور پر قبول نہیں کیے جانے پر افسوس ظاہر کر رہے تھے۔ مگر فلموں کے معاملے میں اس کاروباری پن کو وہ اہمیت نہیں دیتے۔

پریم چند کی نظر میں کون سی فلمیں اچھی ہیں اور 'بازارِ حسن' کے قصے کے مطابق فلم بن سکے گی ـــــ انھیں دو باتوں سے اس انٹرویو کے آخری دونوں سوال جڑے ہیں۔ ان کے جواب میں پریم چند نے جو کچھ کہا ہے، وہ معمولی باتیں ہیں۔ اس لیے یہاں تفصیل میں جانے کی ضرورت نہیں ہے۔

تیسرا انٹرویو بھی 'چتر پٹ' رسالہ سے ہی جڑا ہوا ہے مگر یہ ہندی میں شائع ہوتا تھا (اس سے پہلے کا مذکورہ 'چترپٹ' گجراتی زبان سے متعلق ہے)۔ یہ انٹرویو معروف ہندی مصنف 'رِی سَبھ چَرن جَین' نے لیا تھا جو 13 اپریل 1934 کے شمارہ میں شائع ہوا۔ اس کی اہمیت مضمون نما غیر رسمی گفتگو کی ہے۔ اس گفتگو میں 'بازارِ حسن' پر بن رہی فلم اور اس سے منسلک اشخاص سے متعلق بے حد معمولی قسم کی باتیں ہیں۔ اس کا دائرہ ایسا ہے کہ اسے انٹرویو کہنا غیر مناسب معلوم ہوتا ہے۔ اس لیے یہاں سے آگے بڑھتے ہوئے چوتھے انٹرویو پر آتے ہیں۔

معروف ہندی نقاد 'اندر ناتھ مَدان' کے ہاتھوں تکمیل شدہ چوتھے مکتوباتی انٹرویو کے دو حصے ہیں۔ دونوں

حصوں میں دس دس سوالوں کے جواب ملتے ہیں۔ پریم چند نے یہ جواب 7 ستمبر 1934 اور 26 دسمبر 1934 کو بالترتیب ہندی اور انگریزی زبان میں دیا تھا۔ اندر ناتھ مَدان کے انٹرویو کے حصۂ اوّل کے کچھ سوال پورے طور پر پریم چند کی ذاتی زندگی سے متعلق ہیں، کچھ تخلیقی کاوشوں سے اور ایک سوال عورتوں کے متعلق ان کے آدرش پر مرکوز ہے۔ ذاتی زندگی سے متعلق سوالات اس طرح ہیں:

''1. آپ اپنے بچپن کی اسمرتیوں (یادوں) کو کس روپ میں پرستت (پیش) کرتے ہیں؟

2. کیا آپ کے جیون (زندگی) میں کوئی پریم (عشق) ہوا؟

3. اپنے دمپتیہ جیون (ازدواجی زندگی) کے رومانس تتھا انے [اَنیہ] (نیز دیگر) کچھ تتھیوں (باتوں) کے بارے میں کچھ بتائیں؟

4. زندگی کیا آپ کے لیے وہی ہے؟ کیا آرتھک درشٹی سے (معاشی اعتبار سے) آپ سنتشٹھ (مطمئن) رہے ہیں؟ (ص 487-486)

مندرجہ بالا سوالات اسی سلسلے سے انٹرویو میں نہیں آئے ہیں۔ پریم چند کے بچپن کی یادوں میں سب سے بڑا مقام ماں کا ہے جو انھیں محض آٹھ سال کی عمر میں اس دنیا سے چھوڑ کر چلی گئی۔ 'عشق' کے لیے پریم چند کی زندگی میں مہلت نہیں ملی۔ ان کی ازدواجی زندگی میں رومانس کے لیے جگہ نہیں تھی۔ 1904 میں پہلی بیوی کے انتقال کے بعد ایک بیوۂ طفلی سے ان کی دوسری شادی ہوئی۔ دوسری بیوی بے خوف اور دلیر فطرت کی تھیں جنھوں نے تحریک عدم تعاون میں جیل کا سفر بھی کیا۔ پریم چند کے لیے زندگی مسلسل کام ہی رہی اور مالی اعتبار سے وہ ہمیشہ ناکام رہے۔ یہی ہے پریم چند کی ذاتی زندگی سے متعلق جوابات کا نچوڑ۔

اب پریم چند کی تخلیقی کاوشوں سے جڑے سوالات پر آتے ہیں۔ اس سلسلہ کا پہلا سوال ہے:

''آپ اپنے پرارمبھک لیکھن کار [کاریہ] (ابتدائی قلمی زندگی) کے بارے میں بتائیں۔ آپ نے کب اور کیسے لکھنا شروع کیا اور اردو سے ہندی میں کس پرکار (طرح) آئے۔'' (ص 486)

اس کے جواب میں پریم چند نے کہا ہے کہ اس وقت کے اردو اخبارات میں مضمون نویسی سے ان کے قلمی سفر کا آغاز ہوا۔ پریم چند کے مطابق ان کا پہلا مضمون 1901 میں شائع ہوا اور پہلی کتاب 1903 میں۔ 1914 میں ان کی کہانیوں کا دوسرے لوگوں کے ذریعہ ہوا ترجمہ ہندی رسالوں میں شائع ہوا۔ اسی دوران ہندی رسالہ 'سرسوتی' میں لکھنے لگے۔

درج بالا جوابات کی کچھ باتیں قابل غور ہیں۔ پریم چند کا قول ہے کہ ان کا پہلا مضمون 1901 میں شائع ہوا اور پہلی کتاب 1903 میں۔ مگر پریم چند نے یہ نہیں بتایا کہ اس پہلے مضمون کا عنوان کیا تھا اور وہ کہاں سے شائع ہوا؟ کتاب کے معاملے میں بھی انھوں نے نہ تو کتاب کا نام اور موضوع بتایا ہے اور نہ ہی ناشر یا مقام اشاعت کے متعلق کوئی اطلاع دی ہے۔ 1914 میں ان کی کن کہانیوں کا ہندی میں ترجمہ ہوا اور اس کے مترجم نیز رسالوں کے ناموں کی اطلاع بھی یہاں درج نہیں ہے۔ قابل ذکر ہے کہ بنارسی داس چترویدی کو دیے گئے انٹرویو میں پریم چند نے واضح طور پر لکھا تھا کہ انھوں نے 1907 میں افسانہ نگاری کا آغاز کیا اور اسی سال 'سوز وطن' نام سے ان کا پہلا افسانوی مجموعہ 'زمانہ پریس' سے شائع ہوا۔ بنارسی داس چترویدی نے ان کا یہ انٹرویو 1930 میں لیا تھا۔ جب کہ اس کے چار برس بعد 1934 میں اسی نوعیت کے سوال کا پریم چند غیر واضح جواب دیتے ہیں۔ اب پریم چند نے جو غیر واضح اطلاعات دی ہیں، ان کی بنا پر تحقیقی نتائج میں اختلاف ہونا فطری ہے۔ کہہ سکتے ہیں کہ پریم چند کی تحریروں کے متعلق جو عدم وضاحت اور اختلافات خیالات ملتے ہیں، اسے پھیلانے میں خود پریم چند کا بھی رول ہے۔ تخلیقی کاوشوں سے جڑے ہوئے آئندہ دو سوالات 'پلاٹ کی تعمیر' اور 'کرداروں' سے متعلق ہیں۔ پلاٹ کی تعمیر کے متعلق پریم چند کہتے ہیں کہ ''..... میں ہمیشہ کہانیوں کے پلاٹ سوچتا ہوں۔ یہ ایک پیچیدہ طریقہ ہے۔ مجھے ایسا کرنے کی تحریک کبھی کسی آدمی یا حادثے یا خواب سے ہوتی ہے.... '' (ص 488) کرداروں کے مخرج کے متعلق ان کا کہنا ہے کہ ''میرے اکثر کردار حقیقی زندگی سے لیے گئے ہیں جب کہ ان کی حقیقت پر پردہ پڑا رہتا ہے۔ جب تک کردار کی بنیاد حقیقی نہ ہو، وہ غیر حقیقی، غیر یقینی اور بھروسا نہیں کرنے کے لائق ہوتا ہے۔'' (ص 488) پلاٹ اور کردار کے متعلق پریم چند کی یہ باتیں ان اشخاص کی رہ نمائی کریں گی جو تخلیقی خامہ فرسائی خصوصاً فکشن سے جڑاو رکھتے ہیں۔

اس انٹرویو کے آخری سوال کے جواب میں پریم چند بتاتے ہیں کہ 'گئو دان' نام سے ان کا نیا ناول جلد ہی چھپنے جا رہا ہے۔ 1936 میں شائع ہونے والے اس ناول کے لکھے جانے کی اطلاع 1934 میں عام ہو چکی تھی۔ اس سے بہ آسانی ہم اس دور میں پریم چند کی مقبولیت کا اندازہ لگا سکتے ہیں۔ اس انٹرویو کا ایک بے حد اہم سوال عورتوں سے متعلق ہے۔ اقتباس دیکھیے:

''مَدان: استری کے سمبندھ (عورت کے متعلق) میں آپ کا آدرش کیا رہا ہے؟

پریم چند: میری نظر میں عورت کا آدرش ایثار، خدمت اور پاک دامنی کا عکاس ہونا چاہیے۔ ایثار ہو مسلسل، خدمت بلاشکوہ اور پاک دامنی سیزر کی بیوی کے ہم پلہ، جس پر کوئی انگلی نہ اٹھا سکتا ہو۔'' (ص 487)

المختصر یہ کہ پریم چند ایک عورت میں 'سیتا' اور 'ساوتری' کا عکس دیکھنا چاہتے ہیں۔ صرف انھوں نے سیتا اور ساوتری کی جگہ پر 'جولیس سیزر' کی اہلیہ کا حوالہ دیا ہے۔ قصے کہانیوں میں تو اتنی خوبیوں والی عورتوں کا وجود ممکن ہے، لیکن حقیقی زندگی میں اس کی گنجائش کتنی ہے؟ پریم چند خود حقیقت پسند مصنف ہیں لیکن یہاں اس حد تک مثالیت پسند (Idealist) ہو گئے ہیں کہ حقیقت پسندی پوری طرح غائب ہو گئی ہے۔ یہ امر مسلّم ہے کہ پریم چند سے ادب نگاری کے نئے جہان کی تخلیق ہوتی ہے۔ لیکن تمام تر جدت کے باوجود وہ روایت سے حاصل شدہ خیالات سے پورے طور پر خود کو علاحدہ نہیں کر سکے۔ اس کے علاوہ اسی انٹرویو میں ایک جگہ اپنی ازدواجی زندگی کے متعلق پریم چند نے کہا ہے کہ ''حالاں کہ اس سے (اہلیہ اوّل) مطمئن نہ تھا پھر بھی روایتی شوہروں کی طرح اس سے نباہ کرتا رہا۔'' (ص 487) اس جملے کو دیکھ کر ایسا لگتا ہے کہ پہلی بیوی کے ساتھ زندگی گزارنے میں پریم چند کو اچھی خاصی ترشی کا تجربہ ہوا۔ ایسی حالت میں پریم چند روایت پرست ہو گئے تو یہ حیرت کی بات بالکل نہیں ہے۔ یہ بات قابل غور ہے کہ نسوانیت (Feminism) کے اس دور میں پریم چند کی مندرجہ بالا باتوں کو کس نظر سے دیکھا جاتا؟ بلا شبہ پریم چند، مرد اساس مصنف کا خطاب پاتے۔ ویسے یہ سوال تو سامنے آتا ہی ہے کہ اس زمانے میں عورتوں سے وہ جیسی امیدیں لگا رہے ہیں، کیا ویسی ہی امید وہ مردوں سے بھی کرتے؟ یہ سوال ہمیشہ کے لیے تشنہ رہ گیا۔

اس کے بعد اندر ناتھ مَدان نے پریم چند کا جو دوسرا انٹرویو لیا تھا، وہاں تک آتے ہیں۔ 'چوگان ہستی' پریم چند کی بہترین تخلیق ہے، ایسا وہ خود پہلے سوال کے جواب میں کہتے ہیں۔ یہاں بنارسی داس چترویدی کو دیے گئے انٹرویو کے دوسرے سوال کو پھر سے یاد کرتے ہیں۔ اس میں چترویدی جی نے پریم چند سے پوچھا تھا کہ ''اپنی کون کون سی گلپ (افسانہ) آپ کو سروتم (بہترین) لگتی

ہے؟'' (ص 479) اس کا جواب دینے میں پریم چند کے سامنے گومگو کی حالت تھی اور انھوں نے ایک ساتھ پندرہ افسانوں کے عنوان گنوا دیے تھے۔ مگر ناول کے معاملے میں انھیں ایسی کسی پریشانی سے دوچار نہیں ہونا پڑتا ہے۔ حالانکہ اندر ناتھ مدان نے ان سے سوال کیا تھا کہ '' آپ اپنی تخلیقات میں کسے سب سے عمدہ سمجھتے ہیں؟'' (ص 488) اب تخلیق میں تو ناول اور افسانہ دونوں ہی شامل ہیں۔ پھر جواب میں ناول کا انتخاب کیوں؟ ایسا لگتا ہے کہ افسانہ کے مقابلے میں ناول پریم چند کو زیادہ مستحکم اور پراثر معلوم ہوتا تھا۔

اندر ناتھ مدان نے ایک دوسرے سوال میں جب ان کے ناولوں کے مثالی کرداروں کے متعلق اطلاع مانگی تو پریم چند نے گوشۂ عافیت میں 'گیان شنکر'، چوگان ہستی میں 'سور داس'، پردۂ مجاز میں 'چکر دھر' اور میدان عمل میں 'امر کانت' کا نام لیا۔ یہاں پریم چند کہتے ہیں کہ ان کے تمام ناولوں میں ایک معیاری کردار ہوتا ہے۔

اس انٹرویو کا ایک سوال 'پریم چند کی تخلیقات پر غیر ملکی مصنفین کے اثرات سے متعلق ہے۔ جواب میں پریم چند نے 'ٹالس ٹائے'، 'وکٹر ہیوگو'، اور 'روماں رولاں' کا نام لیا ہے۔ افسانہ نویسی کے ابتدائی دور میں رویندر ناتھ ٹیگور سے رہ نمائی حاصل کرنے کی بات پریم چند کرتے ہیں۔ یہاں پھر سے بنارسی داس چترویدی کے انٹرویو کی جانب لوٹتے ہیں۔ چترویدی جی کا تیسرا سوال تھا کہ '' آپ کی لیکھن شیلی (اسلوب نگارش) پر دیسی یا بدیسی کن کن گلپ لیکھکوں (افسانہ نگاروں) کی رچنا (تخلیقات) کا پربھاؤ (اثر) پڑا ہے؟'' (ص 479) اس کے جواب میں پریم چند نے کسی غیر ملکی مصنف کا نام نہیں لیا تھا۔ انھوں نے پنڈت رتن ناتھ لکھنوی اور رویندر ناتھ ٹھاکر کا کم و بیش اثر قبول کرنے کی بات کہی تھی۔ چترویدی جی کے انٹرویو کے محض چار برس بعد پریم چند نے اپنی تحریروں پر بدیسی مصنفین کے اثرات قبول کرنے کا اقرار کر لیا۔ پنڈت رتن ناتھ لکھنوی کا نام یہاں سے غائب ہے جب کہ رویندر ناتھ ٹھاکر کا نام دونوں انٹرویو میں آیا ہے۔ اب دشواری یہ ہے کہ یکساں نوعیت کے سوال کا ایک ہی شخص کے مختلف اوقات میں دیے گئے دو علاحدہ جوابات میں سے کسے اوّلیت دی جائے؟ یہاں اتنا ہی کہا جا سکتا ہے کہ پریم چند ہمیشہ یکساں باتوں کا پوری تندہی کے ساتھ جواب نہیں دیتے۔

سنیما کے متعلق پریم چند کے تجربات سے منسلک سوال کے جواب میں وہ کہتے ہیں کہ ایک ادیب کے لیے سنیما مناسب جگہ نہیں ہے۔ مالی اطمینان حاصل کرنے کے لیے پریم چند فلمی دنیا سے جڑے تھے، مگر ان کا یہ خیال غلط ثابت ہوا۔ اس انٹرویو کے 'آخری تین سوالات' بے حد سنجیدہ نوعیت کے ہیں۔ ان سے پریم چند کے خیالات و تصورات کو گہرائی سے جاننے سمجھنے کا موقع ملتا ہے۔ اس قبیل کا پہلا سوال اس طرح ہے:

'' کیا آپ انقلاب کے ذریعے سماجی تبدیلیاں بر لانے میں یقین رکھتے ہیں؟'' (ص 490)

پریم چند کا جواب دیکھیے:

'' میں ساماجک سدھار (سماجی اصلاح) پر یقین رکھتا ہوں۔ ہمارا مقصد رائے عامہ کو بیدار کرنا ہونا چاہیے۔ انقلاب سنجیدہ طریقوں کے [کی] ناکامی کی دلیل ہوتا ہے..... ہمارے انقلاب کا انجام کیا ہوگا، کوئی پختہ طور پر نہیں کہہ سکتا۔ اس کا نتیجہ بہترین قسم کی ڈکٹیٹر شپ ہو سکتا ہے۔ جس میں انفرادی آزادی بالکل ختم ہو جائے۔ میں اصلاح چاہتا ہوں۔ تباہی نہیں۔ اگر مجھے کسی طرح یہ پہلے ہی پتہ لگ جائے کہ تباہی کا نتیجہ ہمارے لیے اچھا ہوگا تو میں تباہی کی بھی مخالفت نہ کروں گا۔'' (ص 490)

جب انٹرویو لینے والا انقلاب کی بات کر رہا ہے تو شاید وہ یہ بات 1917 کے روسی انقلاب سے متاثر ہو کر کر رہا ہے۔ روسی انقلاب کی طرف توجہ اس لیے بھی جاتی ہے کہ انٹرویو کے سنہ (1934) سے وہ بے حد قریب کا زمانہ ہے اور 1917 سے 1934 کے درمیان دنیا کے کسی دوسرے خطے میں اس قدر وسیع عالمی اثرات مرتب کرنے والا انقلاب نہیں آیا تھا۔ انقلاب کی جانب انٹرویو کرنے والے کی توجہ مبذول ہونے کا ایک دوسرا سبب یہ بھی ہو سکتا ہے کہ تحریک آزادی میں تشدد پسند حلقے کے نوجوان ملک بھر میں تحریک عدم تعاون (1922-1920) کی ناکامی کے بعد اسلحہ بند گول بندی کی فعال کوشش کر رہے تھے اور انھوں نے کچھ سیاسی قتل اور ڈکیتیاں بھی اپنے مقاصد کو حاصل کرنے کے لیے کی تھیں۔ انٹرویو کے سال (1934) سے صرف تین برس قبل عظیم انقلابی بھگت سنگھ کو پھانسی (23 مارچ 1931) دی گئی تھی۔ اپنی سہولت کے لیے ہم روسی انقلاب اور ہندستان میں تشدد پسندوں کی حرکات کے مشترکہ اثرات کو اس سوال کی اصل سمجھ سکتے ہیں۔ اب پریم چند کے جواب پر آتے ہیں۔ پریم چند نے یہاں پہلے جملے میں ہی کہہ دیا ہے کہ '' میں سماجی اصلاح میں یقین رکھتا ہوں۔'' یعنی وہ بہ ذریعہ انقلاب سماجی تبدیلی کے مخالف ہیں۔ 'مخالف' اس بنیاد پر کہا جا سکتا ہے کہ 'سماجی اصلاح' اور 'انقلاب' میں متضاد رشتہ ہے۔ یہ دونوں دھارے کبھی بھی ایک ساتھ نہیں چل سکتے۔ انقلاب کے وجود میں آنے کا جو سبب پریم چند نے بتایا ہے، اس سے نااتفاقی ظاہر کرنا ناممکن ہے۔ جب پریم چند کہتے ہیں کہ ''انقلاب سنجیدہ طریقوں کی ناکامی کی دلیل ہوتی ہے'' تو فوراً محسوس ہوتا ہے کہ انھوں نے دنیا بھر میں ہوئے انقلابات کا وسیع مطالعہ کر رکھا ہے اور اس کے بعد مندرجہ بالا نتیجے تک وہ پہنچے ہیں۔ بڑے تخلیق کار کا دائرۂ مطالعہ کس قدر وسیع ہوتا ہے، اس کا اندازہ پریم چند کے مذکورہ خیال سے لگایا جا سکتا ہے۔ پریم چند نے یہ بات بھی بالکل درست کہی ہے کہ انقلاب کا نتیجہ مستند طور پر کوئی نہیں بتا سکتا۔ یہ بات پریم چند غالبًا 1789 کے فرانسیسی ریاستی انقلاب کے نتیجوں سے متاثر ہو کر کہہ رہے ہیں۔ فرانسیسی انقلاب کی پیداوار نپولین ہی قاتل انقلاب بن گیا اور اس نے '' آزادی، مساوات اور بھائی چارگی'' کے جذبے کو مسمار کرتے ہوئے فرانس میں دوبارہ راج شاہی قائم کر دی۔ پریم چند آئندہ سطروں میں پھر 'اصلاح' کی بات کرتے ہیں۔ پریم چند انقلاب کی حمایت کے لیے فقط اس شرط پر تیار ہوتے ہیں کہ انھیں پہلے سے پتا لگ جائے کہ اس کا نتیجہ اچھا ہی ہوگا۔ اب پریم چند نے حمایت انقلاب کے لیے ایسی شرط رکھی ہے جو کبھی پوری نہیں ہوگی۔ یعنی یہاں بھی پریم چند انقلابی کے بجائے اصلاح پسند ہی ہیں۔ پریم چند نے 'اصلاح' پر جس قدر زور دیا ہے، اس سے لگتا ہے کہ مہاتما گاندھی کے تصورات سے وہ اس معاملے میں بے حد متاثر ہیں۔ ویسے بھی ہندستان میں 'اصلاح' بنام 'انقلاب' کے سوال پر لازماً 'اصلاح' کا حصہ مہاتما گاندھی کے ہی نام ہوگا۔

پریم چند کا پانچواں اور آخری انٹرویو نوجوان مراٹھی قلم کار 'شری۔ را۔ ٹکے کر' نے ان کے قیام بمبئی کے اثنا میں لیا تھا۔ یہ مراٹھی دو ہفتہ وار رسالہ 'پر تبھا' کے 4 جنوری 1934 اور 1 فروری 1934 کے شمارے میں شائع ہوا تھا۔ یہ بات پہلے آ چکی ہے کہ پریم چند کی تخلیقات کا ترجمہ مراٹھی میں بھی ہوا تھا۔ یہ انٹرویو 'مضمون نیز سوال و جواب' کی شکل میں ہے۔

اس انٹرویو کی ابتدا میں ٹکے کر نے مراٹھی ادیب 'پھڑکے' اور 'کھانڈے کر' کے ساتھ پریم چند کا موازنہ کرتے ہوئے قارئین کے سامنے پریم چند کا تعارف ایک معتبر مصنف کے طور پر پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ یہاں ٹکے کر کے کچھ اہم سوالوں پر خود کو مرکوز کرتے ہیں۔ ٹکے کر کا ایک سوال ہے:

''.... اپنیاس لکھنے کے لیے آپ نے پرارمبھ (آغاز) کیسے کیا؟ اس کی پریرنا (تحریک) آپ کو کیسے

مندرجہ بالاتمام انٹرویو کو ایک ساتھ دیکھنے پر پریم چند کی تصنیفی زندگی، ادب، سنیما، عورت، انقلاب، ما فوق القوت، بین ذات شادی، کمیونزم وغیرہ پر ان کے خیالوں سے واقف ہونے کا موقع ملتا ہے۔ کہیں ان میں وسعت اور مادی نظریہ کی کارفرمائی ملتی ہے تو کئی مقامات پر ان کی حدود بھی واضح طور پر نظر آتی ہیں۔ اس مطالعے سے پریم چند کے داخلی اور خارجی ماحول سے بھی ہمارا سابقہ پڑتا ہے۔ پریم چند نے اپنے تصورات کی دنیا کو مسلسل بڑھانے، پھیلانے کی کوشش کی۔ اس سے ان میں جدت بھی آئی اور ان کی تخلیقات بہتر ہوتی چلی گئیں۔ ان انٹرویو کے علاوہ پریم چند کے مضامین، خطوط اور خطبات کا جب وسیع مطالعہ کیا جائے گا تبھی پریم چند کا فطری جہان تصورات پوری طرح ظاہر ہو سکے گا۔ یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ ادبیات پریم چند کے احتساب میں یہ انٹرویو بے حد افادہ بخش ہیں۔

اور کب ملی۔'' (ص 493)

پریم چند کا جواب تھا کہ 'دیوکی نندن کھتری' اور 'پنڈت رتن ناتھ دھر (سرشار)' کی کتابوں کا انھوں نے مطالعہ کیا تھا۔ پریم چند کے مطابق پنڈت رتن ناتھ دھر کو اردو ناول کا بنیاد گزار کہنا چاہیے۔ ناول نویسی سے جڑے ایک دوسرے سوال میں پریم چند نے عبدالحلیم شرر کا بھی نام لیا ہے۔ ان تین مصنفین سے تحریک حاصل کر کے پریم چند ناول نگار بنے۔ انٹرویو کرنے والے نے اپنی زبان میں لکھا ہے کہ 'کشنا' نام سے ان کا پہلا ناول 1902 میں شائع ہوا۔

پریم چند نے بنارسی داس چترویدی کو دیے گئے انٹرویو میں بتایا تھا کہ ان کی افسانہ نگاری پر 'پنڈت رتن ناتھ لکھنوی' اور 'ڈاکٹر رویندر ناتھ ٹھاکر' کا اثر پڑا۔ اندر ناتھ مدان کو دیے انٹرویو میں بھی انھوں نے اپنی تخلیقات پر رویندر ناتھ ٹھاکر کے اثر کی بات قبول کی ہے۔ جب ناول نگاری کی بات چلی تو دو نئے نام 'دیوکی نندن کھتری' اور 'عبدالحلیم شرر'، پریم چند کی ناول نگاری پر اثرات مرتب کرنے والوں میں شامل ہو گئے۔ اس انٹرویو میں بھی رویندر ناتھ ٹھاکر کا نام افسانہ نگاری کے محرک کے حوالے سے سامنے آیا ہے۔ اب ان تین انٹرویو میں جس طرح سے کہانی اور ناول لکھنے میں پریم چند کو متاثر کرنے والے مصنفین کے نام ایک انٹرویو میں آ کر دوسرے میں غائب ہوتے ہیں اور آئندہ انٹرویو میں دوبارہ کسی نئے نام کے ساتھ کچھ پرانے نام سامنے آ جاتے ہیں، اس کی بنیاد پر تو اتنا ہی کہا جا سکتا ہے کہ پریم چند نے ان انٹرویو میں اپنی یادداشت کا غیر مناسب استعمال کیا۔ یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ رویندر ناتھ ٹھاکر اور پنڈت رتن ناتھ لکھنوی/ دھر (سرشار) نے انھیں زیادہ متاثر کیا ہے۔ شاید اسی لیے ان کا نام ایک سے زیادہ انٹرویو میں آیا ہے۔

جب نگمے کرنے پریم چند سے ان کی 'مثالی دنیا' کے متعلق دریافت کیا تو پریم چند نے کہا:

''..... میری سرشٹی (دنیا) میں زمیندار رہے گا ہی نہیں۔ دھیرے دھیرے اس کا ہردے پریورتن (تبدیلی قلب) کر کے کسان کے پاس ساری زمین کا ادھیکار (اختیار) آ جائے گا..... مہاتما جی جس پرکار (طرح) سے کہتے ہیں، اس پرکار (طرح) 'چینج آف ہارٹ' پر میرا زور ہے..... زمیندار سویم (خود) ہی زمین پر سے اپنا ادھیکار (حق) چھوڑ دیں، تو پھر جھگڑا رہا کہاں ہے؟''
(ص 498)

تبدیلی قلب (Change of Heart) کی بات سن کر نگمے کرنے جب یہ سوال کیا کہ کیا وہ مہاتما گاندھی کے تمام تصورات سے متفق ہیں تو پریم چند نے اس کا نفی میں جواب دیتے ہوئے صرف تبدیلی قلب (Change of Heart) کو ہی قابل قبول بتایا۔ تاریخ شاہد ہے کہ مہاتما گاندھی کے نقش قدم پر چلتے ہوئے پریم چند نے جس 'چینج آف ہارٹ' کی بات کی تھی، وہ کھوکھلی ثابت ہوئی۔ زمینداروں کا چینج آف ہارٹ کبھی ہو ہی نہیں سکا۔ حصول آزادی کے بعد حکومت ہند کو زمینداری کے خاتمے کے لیے دوسرے قانونی ذرائع استعمال میں لانے پڑے۔ مہاتما گاندھی اور پریم چند جیسے بھلے لوگوں کا 'چینج آف ہارٹ' ہو سکتا ہے، خون چوسنے والے زمینداروں کا نہیں۔ اس خیال کو پریم چند کی شرافت سمجھنا بہتر ہوگا۔ اس کے بعد پریم چند خود ہی اپنے آپ کو 'مختلف قسم کا کمیونسٹ' بتاتے ہیں۔ اس پر نگمے کرنے ان سے سوال کیا:

'' 'کمیونزم' کہنے پر اس شبد کا ارتھ (لفظ کا معنی) ایک ہی ہے۔ گاندھی جی کا کمیونزم، انگلینڈ کا کمیونزم، رشین کمیونزم..... اس [کے] ایسے پرکار (اقسام) بالکل نہیں ہو سکتے..... آپ زمین داروں کو بدلنے کی آشا (امید) رکھتے ہیں، ایسی استھتی (حالات) میں آپ کو کمیونسٹ کیسے کہا جائے؟'' (ص 498)

اب پریم چند کا جواب دیکھیے:

''کیوں بھلا میرا کمیونزم اس پرکار (قسم) کا ہے؟ ہمارے سماج میں زمیندار، ساہوکار، یا کسان کا سوشن (استحصال) کرنے والا سماج بالکل رہے گا ہی نہیں۔'' (ص 498)

کمیونزم کے معاملے میں سوال کرنے والے نگمے کر کی باتیں زیادہ پختہ ہیں۔ ایسا لگتا ہے کہ انھوں نے کمیونزم کا باضابطہ مطالعہ کیا ہے جب کہ پریم چند کی باتوں میں اس کی کمی نظر آتی ہے۔ یہ بھی محسوس ہوتا ہے کہ پریم چند انٹرویو لینے والے کا اشارہ سمجھ نہیں پائے۔ فقط غیر استحصالی سماج کی بات کرنے سے کوئی کمیونسٹ کہے جانے کا حق دار نہیں ہو جاتا۔ بنیادی سوال یہ ہے کہ غیر استحصالی سماج کی تعمیر کیسے ہوگی؟ اس کے لیے کمیونسٹ انقلاب کو لازمی قرار دیتے ہیں۔ پریم چند کے تعمیر سماج میں یہ لازمہ غائب ہے۔ پھر بھی وہ خود کو کمیونسٹ کہے جانے پر مصر ہیں۔ یہ پریم چند کے کمیونزم سے متعلق خیالوں کی حد ہے۔

پلے ٹو (Plato) کے تصور ریاست کی طرح ہی پریم چند نے بھی ایک ریاست کا تصور اس انٹرویو میں پیش کیا ہے جس میں وکیل، برہمن، زمین دار، ساہوکار کے لیے جگہ نہیں ہوگی۔ راقم الحروف کے پیش نظر پریم چند کے دستیاب آخری انٹرویو کی یہ کچھ اہم باتیں تھیں۔

مندرجہ بالا تمام انٹرویو کو ایک ساتھ دیکھنے پر پریم چند کی تصنیفی زندگی، ادب، سنیما، عورت، انقلاب، مافوق القوت، بین ذات شادی، کمیونزم وغیرہ پر ان کے خیالوں سے واقف ہونے کا موقع ملتا ہے۔ کہیں ان میں وسعت اور مادی نظریہ کی کارفرمائی ملتی ہے تو کئی مقامات پر ان کی حدود بھی واضح طور پر نظر آتی ہیں۔ اس مطالعے سے پریم چند کے داخلی اور خارجی ماحول سے بھی ہمارا سابقہ پڑتا ہے۔ پریم چند نے اپنے تصورات کی دنیا کو مسلسل بڑھانے، پھیلانے کی کوشش کی۔ اس سے ان میں جدت بھی آئی اور ان کی تخلیقات بہتر ہوتی چلی گئیں۔ ان انٹرویو کے علاوہ پریم چند کے مضامین، خطوط اور خطبات کا جب وسیع مطالعہ کیا جائے گا تبھی پریم چند کا فطری جہان تصورات پوری طرح ظاہر ہو سکے گا۔ یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ ادبیات پریم چند کے احتساب میں یہ انٹرویو بے حد افادہ بخش ہیں۔

■

Mani Bhushan Kumar
Dept. of Urdu
A.N.College,
Boring Road,
Patna- 800013 (Bihar)
Mob.: 7980227954
E-mail: manibhushan741@gmail.com

محمد شاداب شمیم

اردو میں تحشیہ و تعلیق

مسائل اور حل

لغت میں تحشیہ کے کئی معنی ملتے ہیں جیسے حاشیہ چڑھانا، کسی کتاب وغیرہ کا حاشیہ لکھنا، کنارہ یا حاشیہ بنانا وغیرہ اور ادبی اصطلاح میں کسی شعر، شہر، لفظ، کتاب اور اشخاص وغیرہ کے مختصر بیان یا وضاحت کو کہا جاتا ہے، عام طور پر حاشیہ میں وہی چیزیں تحریر کی جاتی ہیں جنھیں متن کا حصہ نہیں بنایا جاسکتا۔ اس کا مادہ ح و ش ہے۔قدیم زمانے سے اس کا چلن رہا ہے۔ خاص طور پر عربی کی درسی کتابوں میں اس کا رواج تو عام ہے۔اس کے ذریعے اصل ماخذ کی نشاندہی اور مختلف نکات کی توضیح بھی کی جاتی ہے۔ حاشیہ کو متنی حواشی، غیر متنی حواشی، ترتیبی حواشی میں تقسیم کیا گیا ہے اور ان کی کئی ذیلی اقسام بھی ہیں۔ اسی طرح تعلیق کا استعمال بھی حاشیہ کی طرح ہی ہوتا ہے۔اس کے لغوی معنی لٹکانا، کسی چیز کو دوسری چیز سے متعلق کرنا، حاشیہ، فٹ نوٹ، وضاحت وغیرہ ہیں۔اس کے تحت متن سے متعلق اضافی معلومات تحریر کی جاتی ہیں۔اس کی بھی کئی قسمیں ہیں۔ استشہادی تعلیق، ارتباطی تعلیق، اضافیاتی تعلیق اور افادیاتی تعلیق وغیرہ ۔بعض محققین تحشیہ اور تعلیق کو الگ الگ استعمال کرتے ہیں اور بعض نے ان دونوں کو مترادف بتایا ہے۔ ڈاکٹر نذیر احمد تصحیح و تحقیق متن میں لکھتے ہیں:

''فرہنگ نامہ دہخدا سے معلوم ہوا کہ حاشیہ اور تعلیقہ بہ اعتبار معنی و مفہوم یکساں ہیں، لیکن استعمال کے لحاظ سے ان میں کچھ فرق ہے، تعلیقہ معقولات اور فلسفہ کی کتابوں کے حاشیہ کو کہتے ہیں اور دوسرے فنون کی کتابوں میں تعلیقہ یا تعلیقات، حواشی یا حاشیہ کہلاتے ہیں۔''

(تصحیح و تحقیق متن:ص 53)

حواشی و تعلیقات کے استعمال کے متعلق خلیق انجم لکھتے ہیں:

''اب تک تعلیقات اور حواشی کا جو مفہوم بیان کیا گیا ہے اس سے حواشی اور تعلیقات کے مفاہیم میں فرق کرنا مشکل ہو جاتا ہے، اس لیے میں سمجھتا ہوں کہ اگر ہم لغوی، فرہنگی اور ادبی امور کی وضاحتوں کے سلسلے میں کچھ لکھیں تو ہماری تحریریں حواشی کے دائرے میں آئیں گی اور اگر متن کے تاریخی، سماجی یا ادبی واقعات کی تفصیل بیان کی جائے یا ان افراد کے حالات بیان کیے جائیں جن کا ذکر متن میں آیا ہے تو وہ تعلیقات کہلائے جائیں گے۔''(متنی تنقید ص 103.104)

ادبی تحقیق میں تحشیہ اور تعلیق کی بہت اہمیت ہے۔ اس کے بغیر اچھی اور معیاری تحقیق کا تصور ہی نہیں کیا جا سکتا۔ آج تحقیق کے نام پر تبصرہ، تنقید اور تجزیہ کو پیش کیا جا رہا ہے۔اس لیے کہ جب ہم آج کی تحقیق کو ادبی تحقیق کے معیار پر جانچتے اور پرکھتے ہیں اور یونیورسٹیز میں پی ایچ ڈی کے موضوعات کو دیکھتے ہیں تو ہمیں اندازہ ہو جاتا ہے کہ واقعی اچھی اور معیاری تحقیق نہیں ہو رہی ہے۔ہم خود نہیں چاہتے کہ عمدہ اور معیاری تحقیق سامنے آئے۔اسی لیے ہم ایسے موضوعات کا انتخاب کرتے ہیں جن پر یا تو پہلے سے مواد بکثرت موجود ہوتا ہے یا پھر چبے چبائے لقموں کو نئے الفاظ و انداز میں پیش کر دیتے ہیں، اگر آج ریسرچ کا معیار گرا ہے اور دن بہ دن ادبی ریسرچ اپنا وقار کھوتی جا رہی ہے تو اس کے ذمے دار جس طرح ریسرچ اسکالرز ہیں اسی طرح اساتذہ اور نگراں حضرات بھی ہیں۔ وجہ ظاہر ہے کہ آج ہر کوئی سہل پسند ہو گیا ہے، کتابوں کے مطالعے اور نئی نئی چیزوں کو اخذ کرنے کا ان کے پاس نہ تو جذبہ ہے اور نہ ہی وقت، اگر یہی حال رہا تو وہ وقت دور نہیں جب ہماری تحقیق و ریسرچ کی کوئی وقعت و اہمیت نہیں رہے گی اور اسے ردی کے حوالے کر دیا جائے گا۔اس لیے ضروری ہے کہ ہر وہ طریقہ اور راستہ اختیار کیا جائے جس سے معیاری اور عمدہ تحقیق ہمارے سامنے آسکے۔

آج کے اسکالرز حواشی و تعلیقات کی طرف اس لیے بھی متوجہ نہیں ہوتے کہ حواشی و تعلیقات انہی کتابوں پر لکھنے کی ضرورت ہوتی ہے جو کلاسک کا درجہ رکھتی ہیں اور آج سے دو تین سو سال پہلے تصنیف یا تحریر کی گئی ہیں۔ اس وقت اردو زبان و ادب پر فارسی و عربی زبان کا غلبہ تھا، اس لیے اس وقت کی کتابوں اور تحریروں میں بھی ان

زبانوں کا بکثرت استعمال ہوا ہے، یہ کہنا غلط نہیں ہوگا کہ آج کے زیادہ تر اردو اسکالرز فارسی و عربی زبان سے ناواقف ہیں اور اگر واقف ہیں تو محض کچھ لفظوں اور جملوں سے، اور ظاہر ہے کہ ان سے تو فارسی و عربی عبارت کو سمجھ پانا کافی مشکل ہے۔ مثال کے طور پر مکاتیب سر سید، غبار خاطر اور اس طرح کی دوسری کتابوں کا مطالعہ کرتے وقت یہ احساس ہوا کہ ان میں بکثرت فارسی و عربی الفاظ و جملوں کا استعمال کیا گیا ہے اور سرسید کے کچھ خطوط تو ایسے ہیں جو اردو سے شروع ہوتے ہیں اور پھر بیچ میں ایک طویل پیراگراف فارسی زبان میں ہے اور پھر

> **ریسرچ اسکالر کے لیے ایک بہت بڑا مسئلہ وسائل کا بھی ہوتا ہے اس لیے کہ بغیر وسائل کے تحقیقی کام کیا جانا ناممکن امر ہے اور حواشی و تعلیقات ایسا موضوع ہے جس کے وسائل تک پہنچنے کے لیے تحقیق کے طالب علم کو بہت زیادہ تگ و دو اور محنت و مشقت کرنی پڑتی ہے۔**

آخر کا پیراگراف اردو میں ہے،(خط بنام محسن الملک، مکاتیب سرسید جلد 1، ص 155) تو اس سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ جو اسکالر فارسی زبان سے ناواقف ہوگا وہ تو سرسید کے خط کو بھی کما حقہ نہیں سمجھ سکتا، اس لیے یونیورسٹیز میں حواشی وتعلیقات پر زیادہ سے زیادہ توجہ دی جانی چاہیے تا کہ ہم اپنی کلاسیکی اور پرانی کتابوں سے خاطر خواہ استفادہ کرسکیں اور انھیں عوام کے لیے مفید اور قابل استفادہ بناسکیں۔

ہاں یہ بات اپنی جگہ مسلم ہے کہ حواشی وتعلیقات تحریر کرنا ایک مشکل امر ہے لیکن ناممکن نہیں، حواشی و تعلیقات تحریر کرتے وقت بہت سے مسائل سے دوچار ہونا پڑتا ہے سب سے پہلے تو یہی سمجھنے میں کافی پریشانی ہوتی ہے کہ حواشی وتعلیقات ہم معنی لفظ ہیں یا مترادف، اگر ہم معنی ہیں تو ان کا طریقہ کار اور استعمال کہاں، کیسے اور کس طرح ہوتا ہے اور اگر مترادف ہیں تو پھر اس کا طریقۂ استعمال کیا ہے یا کیا ہونا چاہیے، کہاں پر اور کیسے اس کو پیش کیا جا سکتا ہے وغیرہ۔ اسی ضرورت کو محسوس کرتے ہوئے یو جی سی کے ذمے داران نے کورس ورک میں حواشی وتعلیقات کو شامل کیا ہے۔ طلبہ واساتذہ کو اسے بہتر طریقے سے پڑھنا اور پڑھانا چاہیے، جس کا فائدہ یہ ہوگا کہ اسکالرز اس موضوع سے مانوس ہوجائیں گے اور بہتر طریقے سے اس کا حق ادا کرسکیں گے۔

حواشی وتعلیقات پر کام کرنا دشوار گزار اس لیے بھی ہے کہ متعلقہ موضوع پر مواد مختلف انسائیکلوپیڈیاز اور علوم وفنون کی کتب کے اوراق پلٹ کر جمع کرنا ہوتا ہے، اور آج اسکالرز کی سہل پسندی اس چیز کی عادی ہے کہ مواد دو چار کتابوں میں زیادہ سے زیادہ مل جائے اور تحقیق کا کام آسانی سے کم وقت میں پورا ہوجائے۔ حالانکہ مختلف علوم وفنون کی کتابوں کی ورق گردانی ریسرچ اسکالرز کے لیے بہت مفید ہے، نئی نئی چیزوں سے واقفیت ہوتی ہے، مختلف علوم وفنون کی اصطلاحات اور معلومات سے آشنائی ہوتی ہے اور ریسرچ اسکالرز کی معلومات میں گراں قدر اضافہ ہوتا ہے۔

حواشی وتعلیقات تحریر کرنے کے لیے رسوم ورواج اور الفاظ ومحاورات کی معلومات بھی بہت ضروری ہے، اس لیے کہ وہ کتابیں جو کلاسک کا درجہ رکھتی ہیں ان میں اردو کے ساتھ عربی و فارسی الفاظ ومحاورات کا بکثرت استعمال ہوا ہے، محقق کے لیے ضروری ہے کہ اس کی نگاہ ان تمام چیزوں پر ہو، جس سے کہ ان کے متعلق لکھنے میں اسے کوئی دشواری نہ ہو، اسی طرح پرانے زمانے میں جو علوم اور رسم ورواج رائج تھے اور اس وقت کی تہذیب اور طرز معاشرت کیا تھی اس پر بھی خاطر خواہ نگاہ ہونی چاہیے، اس لیے کہ بہت سے ایسے طریقے اور رسوم ورواج ہیں جو اس وقت تو رائج تھے لیکن آج ان کا چلن نہیں ہے، اس وقت وہ انسانی تہذیب وکلچر کا حصہ تھے آج نہیں ہیں۔ اس لیے حواشی وتعلیقات تحریر کرنے لیے مختلف علوم وفنون سے واقفیت ضروری ہے۔

اسی طرح پہلے کی کتابوں میں جو نام مندرج ہوتے ہیں ان میں سے کچھ تو بہت مشہور ومعروف ہوتے ہیں جن کی تفاصیل حاصل کرنا چنداں مشکل نہیں۔ لیکن کچھ ایسے اسما بھی ہوتے ہیں جن تک رسائی بہت دشوار ہوتی ہے۔ مثال کے طور پر مکاتیب سرسید کے مکتوب الیہم کچھ تو بہت مشہور ومعروف ہیں اور کچھ حضرات غیر معروف ہیں اسی طرح خط کے درمیان کچھ ایسے اصحاب کا نام آگیا ہے جو اس وقت مکتوب نگار اور مکتوب الیہم کے لیے معروف تھے لیکن آج ان کے سلسلے میں معلومات ملنا بہت مشکل ہے، اس لیے کہ امتداد زمانہ کی وجہ سے وہ لوگ پردۂ خفا میں چلے گئے، اس عدم واقفیت کی بنا پر ایسی تحریروں کو پڑھتے وقت قاری متفکر رہتا ہے کہ یہ لوگ کون ہیں اور ان سے مکتوب نگار کا رشتہ یا تعلق کیا تھا۔ اسی طرح کبھی کبھی صرف تخلص تحریر کیا جاتا ہے اس سے بھی پریشانی ہوتی ہے کہ اگر صاحب تخلص مشہور ومعروف ہے تب تو اس کے متعلق معلومات آسانی سے مل سکتی ہیں لیکن غیر معروف ہونے کی صورت میں اس کی معلومات بہم پہنچانا کافی مشکل ہوجاتا ہے، اگر آج بھی ان شخصیات کے بارے میں معلومات فراہم نہیں کی گئیں تو جو چیز معلوم کرنا آج مشکل ہے آنے والے دنوں میں وہی ناممکن ہوجائے گا اور پھر کسی بھی صورت ان اشخاص کی شناخت ممکن نہ ہوگی، اس سے اردو ادب کا بڑا خسارہ ہوجائے گا اور پتا نہیں حوادث زمانے کا شکار ہوکر کتنے علوم وفنون، اشخاص و مقامات ضائع ہوجائیں گے۔

حواشی وتعلیقات کا تعلق پرانی کتب اور اخبارات و رسائل سے بھی ہے۔ بہت سی کتابوں کا ذکر پرانی کتابوں میں تو ملتا ہے لیکن آج وہ ناپید ہیں۔ اسی طرح مختلف اخبارات ورسائل جو اس وقت موجود تھے اور جن میں ادبا وشعرا کی تخلیقات وغیرہ شائع ہوتی تھیں ان میں سے کچھ کے حالات و واقعات تو موجود ہیں اور کچھ کا ذکر صرف اس وقت کی کتابوں اور رسائل میں ہے، اگر ان کے سلسلے میں مزید معلومات حاصل کرنا چاہیں تو پھر دو چار قدم چل کر ہی قلم خاموش ہوجاتا ہے۔ اس لیے کہ زیادہ تفصیل نہیں ملتی۔ بہت سی اہم کتابوں کا علم تو تذکرہ اور خطوط وغیرہ جیسی کتابوں کے مطالعے سے ہی ہوتا ہے۔

اس وقت کی تحریروں میں بہت سے حادثات، واقعات اور تحریکات کا ذکر ملتا ہے، اور ان کے متعلق بہت سے واقعات بھی مذکور ہیں، لیکن جب اس طرح کے واقعات وحادثات کی تحقیق کی جاتی ہے تو پھر راستے مسدود ہوجاتے ہیں اور چند قدم چل کر ہی محقق ہانپنے لگتا ہے۔ اس لیے کہ واقعات کا ذکر تو کتابوں میں ہے لیکن ان کی اصل تفصیل نہیں ملتی کہ یہ واقعہ کب، کہاں اور کیسے رونما ہوا، اور اس کے اسباب وعلل کیا تھے۔ اس لیے کہ جس طرح جستہ جستہ اردو زبان وادب ترقی اور عروج کے منازل طے کر رہی تھی اسی طرح مغل حکمراں اور مغل حکومت اپنی زندگی کی آخری سانسیں گن رہی تھی۔ انگریزوں اور مغلوں میں بہت سی ایسی جھڑپیں ہوئی ہیں جن کا تذکرہ جابہ جا ملتا ہے اسی طرح 1857 کا واقعہ بھی بہت مشہور ہے اور اس کے چشم دید تو غالب اور سرسید بھی ہیں لیکن پھر بھی ان کے مکاتیب میں کہیں کہیں کچھ ایسے اشارے ملتے ہیں جن کی تفصیل جانے بغیر مطلوب تک

رسائی مشکل ہی نہیں ناممکن ہے۔

ریسرچ اسکالر کے لیے ایک بہت بڑا مسئلہ وسائل کا بھی ہوتا ہے اس لیے کہ بغیر وسائل کے تحقیقی کام کیا جانا ناممکن امر ہے اور حواشی وتعلیقات ایسا موضوع ہے جس کے وسائل تک پہنچنے کے لیے تحقیق کے طالب علم کو بہت زیادہ تگ و دو اور محنت و مشقت کرنی پڑتی ہے۔ ان وسائل میں سب سے پہلے ذہن مواد کی فراہمی کی طرف منتقل ہوتا ہے چاہے وہ کسی بھی نوعیت کا ہو، مواد کتابی شکل میں بھی ہوسکتا ہے اور رسائل و جرائد، اخبارات، قدیم مخطوطات، کتبے اور دیگر اشکال میں بھی۔ اس لیے کہ کسی بھی کتاب پر تعلیقات یا حواشی لکھنے کے لیے بنیادی ضرورت یہ ہوتی ہے کہ اس کے اصل مراجع ومصادر تک پہنچا جائے اور ان تک پہنچنے کا واحد ذریعہ مواد ہوتا ہے۔ یہاں طالب علم کو دوطرح کی دشواری ہوتی ہے پہلی تو مواد کی طرف نشاندہی کے سلسلے میں ہوتی ہے کہ ریسرچ اسکالر جس موضوع پر کام کر رہا ہے اس سے متعلق مواد تک کیسے پہنچے؟ اور دوسری دشواری مواد تک پہنچنے کے بعد کی ہوتی ہے کہ اس مواد سے استفادہ کیسے کیا جائے؟ کبھی تو وہ تحقیقی مواد اپنی زبان میں صاف وشفاف حالت میں مل جاتا ہے اور کبھی اس کی زبان کچھ اور ہوتی ہے یا اس کا خط کچھ اور ہوتا ہے جو اس زمانے میں رائج نہیں، اس وقت تحقیق کا طالب علم بہت سی پریشانیوں سے دوچار ہوتا ہے۔

اسی طرح وسائل میں کتابیں بھی شامل ہیں اس لیے کہ تحشیہ اور تعلیق کے لیے بہت سی کتابوں کی ضرورت ہوتی ہے اور پرانی کتابوں میں ہمیں کئی زبانوں کی اصطلاحات، رسوم ورواج اور واقعات ملتے ہیں، ان کی توضیح وتشریح اس زبان کی کتابوں کو پڑھ کر ہی ممکن ہے اس لیے کتابیں بہ سہولت فراہم ہونی چاہئیں، تحقیق میں مواد کی فراہمی ہر جگہ ضروری ہوتی ہے مگر حواشی وتعلیقات میں بغیر مواد کے ایک قدم بھی نہیں چلا جا سکتا، جس شخصیت، کتاب یا واقعے کے بارے میں لکھا جارہا ہے اس کے مستند ہونے کے لیے حوالہ وماخذ کی اشد ضرورت ہے۔

عصر حاضر میں جب کہ کتابوں کے پڑھنے کا رواج کم ہو رہا ہے، ہر چیز ڈیجیٹلائز کی جارہی ہے ایسے میں حواشی وتعلیقات کی ضرورت و اہمیت دو چند ہو گئی ہے۔ ان تمام چیزوں کو مدنظر رکھتے ہوئے اساتذہ کو اس بات کی طرف دھیان دینا چاہیے کہ عربی و فارسی سے واقف طلبہ کے سامنے حواشی وتعلیقات کی اہمیت وافادیت کو اجاگر کریں اور انھیں اس سلسلے میں کام کرنے پر رغبت دلائیں۔ ایم فل، پی ایچ ڈی کے انٹرویو میں طالب علم سے عربی وفارسی کی واقفیت دریافت کر کے کلاسیکی ادب کے حواشی وتعلیقات پر کام کرنے کا موقع فراہم کریں اور ایسے اساتذہ جو عربی وفارسی سے واقف ہوں یا جنہوں نے قدیم متون پر کام کیا ہے وہ ایسے طلبہ کی رہنمائی کریں تاکہ ہمارے شعبوں کی تحقیق افسانہ وناول تک محدود رہ کر آنے والے وقت میں خود افسانہ نہ بن جائے اور اس میں ان متون اور کلاسیکی ادب کی کوئی جگہ نہ رہے، جو اردو زبان وادب کا گراں قدر اور اصل سرمایہ ہے۔

> **حواشی و تعلیقات بہت ہی قدیم فن ہے، چونکہ اردو زبان کا تعلق عربی اور فارسی سے بہت گہرا ہے، یہی وجہ ہے کہ اردو نے عربی اور فارسی کے بہت سے اثرات قبول کیے ہیں، الفاظ و محاورات کے علاوہ بہت سی اصناف میں اردو نے ان زبانوں کی پیروی کی ہے، عربی اور فارسی میں اس کا رواج بہت پہلے سے رہا ہے، خاص طور پر عربی کی درسی کتابوں کے حواشی بہت مقبول ہوئے ہیں۔**

حواشی وتعلیقات پر کام کرنے والے ریسرچ اسکالرز اور محققین کے لیے مختلف اداروں کے ذریعے تیار کی جانے والی انسائیکلوپیڈیاز جیسے اردو دائرہ معارف اسلامیہ 25 جلدیں، تاریخ ادبیات مسلمانان پاکستان و ہند، اردو جامع انسائیکلوپیڈیا، اردو انسائیکلوپیڈیا، جغرافیائی معلومات انسائیکلوپیڈیا اور اسلامی انسائیکلوپیڈیا وغیرہ بڑی کارآمد ہوتی ہیں، لغات، تذکرے، تاریخ ادب اردو کی کتب وغیرہ بھی اس سلسلے میں اہم وسیلے ہیں، اس کے علاوہ قاموس المشاہیر اور ماہنامہ نقوش کا شخصیات نمبر، الاعلام للزرکلی (خیر الدین زرکلی)، اردو محاورے، اردو میں مستعمل محاورے اور دہلی میں محاورے وغیرہ اہم کتابیں ہیں جن کے ذریعے محقق حواشی وتعلیقات میں بھرپور استفادہ کرسکتا ہے، مختلف علوم وفنون کی اصطلاحات والفاظ کے سلسلے میں اس شعبے کے اساتذہ اور ماہر فن سے ضرور استفادہ کرنا چاہیے، آج ہر یونیورسٹی میں مختلف شعبہ جات موجود ہیں ہماری کوتاہی یہ ہے کہ ہم جس شعبے میں تحقیق کر رہے ہوتے ہیں دوسرے شعبے کے اساتذہ وماہرین کو اپنے موضوع سے غیر متعلق خیال کرتے ہیں مگر حواشی وتعلیقات میں ان سے اہم اور مفید معلومات فراہم ہوسکتی ہیں، لہٰذا اس سلسلے میں ہمیں فراخدلی اور سیر چشمی سے کام لینا چاہیے۔

مواد اور کتابوں کی دستیابی کے بعد ریسرچ اسکالر کا مرحلہ آسان ضرور ہو جاتا ہے مگر منزل ابھی بھی دور ہوتی ہے، مواد کی فراہمی کے بعد ضرورت ہوتی ہے تجربہ کار اور عالم و فاضل رہنما کی، حواشی وتعلیقات تحریر کرتے وقت ہر قدم پر نگراں کے مشورے اور ان کی رہنمائی کی ضرورت ہوتی ہے۔ اس لیے کہ مواد کی تراش خراش اور اس کے انتخاب میں باریک بینی اور دقت نظری بہت اہم چیز ہے۔ ان مراحل سے گزرنے کے بعد شرط ہے کہ ریسرچ اسکالر محنت اور جانفشانی سے کام کرے اور زیادہ سے زیادہ وقت تحقیقی کام کو دے، یہ ایسا موضوع ہے جسے جتنا بھی وقت دیا جائے کم ہے، عام طور پر تحقیق کے متعلق کہا جاتا ہے کہ یہ بہت خشک ہوتا ہے، اور اس کے لیے یکسوئی کی اشد ضرورت ہوتی ہے۔ اس کے بغیر عمدہ تحقیق کا تصور بھی نہیں کیا جاسکتا۔

حواشی وتعلیقات بہت ہی قدیم فن ہے، چونکہ اردو زبان کا تعلق عربی اور فارسی سے بہت گہرا ہے، یہی وجہ ہے کہ اردو نے عربی اور فارسی کے بہت سے اثرات قبول کیے ہیں، الفاظ ومحاورات کے علاوہ بہت سی اصناف میں اردو نے ان زبانوں کی پیروی کی ہے۔ عربی اور فارسی میں اس کا رواج بہت پہلے سے رہا ہے۔ خاص طور پر عربی کی درسی کتابوں کے حواشی بہت مقبول ہوئے ہیں۔ اس کے علاوہ حدیث کی تقریباً تمام کتابوں کے حواشی تحریر کیے گئے ہیں، اور بہت سے محشی صرف حواشی تحریر کرنے کی وجہ سے علمی وادبی دنیا میں کافی مقبول ومعروف ہوئے ہیں، علم حدیث میں امام ابن حجر عسقلانی نے تحفۃ الباری، نووی نے المنہاج فی شرح صحیح مسلم، علامہ قسطلانی نے ارشاد الساری فی شرح صحیح بخاری اور بدرالدین عینی نے عمدۃ القاری اور طبقات الشعرا وغیرہ کتابیں تصنیف کی ہیں، اسماء الرجال اور سوانح میں جمال الدین مزی نے تہذیب الکمال اور امام شمس الدین ذہبی نے سیر اعلام النبلاء وغیرہ جیسی اہم کتابیں یادگار چھوڑی ہیں، اور عربی ادب میں ثعالبی نے یتیمہ الدہر فی محاسن اہل العصر اور اصمعی نے الاصمعیات اور فحول الشعرا وغیرہ کے نام سے حواشی تحریر کی ہے۔ اسی طرح فارسی کی بہت سی کتابوں پر بھی اس کے محققین نے بہت ہی قیمتی اور نادر حواشی تحریر کیے ہیں، محمد معین الدین نے حاشیہ چہار مقالہ، فتح اللہ مجتبائی نے حاشیہ طوطی نامہ، قاضی سجاد حسین نے حاشیہ دیوان حافظ اور مثنوی معنوی اور محمد علی فروغی نے حاشیہ گلستان سعدی

وغیرہ تحریر کیا ہے۔ان لوگوں نے بہت ہی محنت اور تحقیق کے بعد حواشی وتعلیقات تحریر کیے ہیں،اور بہت سی ایسی معلومات کو حواشی وتعلیقات کے ذیل میں یکجا کر دیا ہے جسے حوادث زمانہ نے بھلا دیا تھا یا پھر اس پر گذرتے وقت کی دھول جم گئی تھی۔

اردو میں کئی محقق اور متنی نقاد گذرے ہیں جنہوں نے بہت ہی اہم اور معلوماتی حواشی وتعلیقات تحریر کیے ہیں، امتیاز علی خاں عرشی نے دیوان غالب اور مکاتیب غالب، مالک رام نے غبار خاطر، تذکرہ، رشید حسن خاں نے باغ وبہار، سحر البیان، گلزار نسیم، زہر عشق، پروفیسر نذیر احمد نے دیوان سراجی خراسانی اور خلیق انجم نے مکاتیب غالب کے حواشی وتعلیقات لکھے ہیں،ان لوگوں نے قابل تقلید نمونے ہمارے سامنے پیش کیے ہیں،جس سے کہ ہم دیگر کلاسک کتابوں کے حواشی لکھ سکتے ہیں،مثال کے طور پر مکاتیب غالب (نسخہ عرشی) میں صفحہ نمبر 61 پر ''میاں انجو، جامع فرہنگ جہانگیری، شیخ رشید راقم فرہنگ رشیدی عظماء عجم میں سے نہیں'' لکھا ہوا ہے،لیکن اس وقت کے قاری کے لیے انجو اور رشید نا معلوم ہیں،صرف انجو اور رشید سے شاید ہی کوئی ان کو پہچان سکے اور ان کے کارنامے کو جان سکے،اس لیے ان کی تفصیل ضروری ہے، تا کہ قاری کو اندازہ ہو کہ یہ کون ہیں اور ان کی شناخت کیا ہے،اس لیے ان کے متعلق تعلیقے کے طور پر امتیاز علی خاں عرشی لکھتے ہیں:

''انجو کا نام جمال الدین حسین بن شاہ حسن انجوی شیرازی اور لقب عضد الدولہ ہے،ان کے آبا و اجداد فارس کے شہرۂ آفاق شہر شیراز کے باشندے تھے، یہ وہیں پیدا ہوئے، بعد ازاں تلاش روزگار ہندوستان آئے اور بقول

> ”
> **اردو میں کئی محقق اورمتنی نقاد گذرے ہیں جنھوں نے بہت ہی اہم اورمعلوماتی حواشی و تعلیقات تحریرکیے ہیں، امتیازعلی خاں عرشی نے دیوان غالب اورمکاتیب غالب، مالک رام نے غبار خاطر، تذکرہ، رشیدحسن خاں نے باغ وبہار، سحرالبیان، گلزارنسیم، زہرعشق، پروفیسر نذیر احمدنے دیوان سراجی خراسانی اورخلیق انجم نے مکاتیب غالب کے حواشی وتعلیقات لکھے ہیں،**
> “

> **عہد حاضر میں حواشی و تعلیقات کی اہمیت و افادیت پہلے سے کہیں زیادہ ہو گئی ہے،کیوں کہ جب ہم کلاسک کتابوں کا مطالعہ کرتے ہیں تو اس میں مصنف کے معاصرین اور ان کے خاندان کے دیگر افراد کا ذکر ملتا ہے، قدیم زمانے کی تحریروں میں بڑی تعداد میں ایسے الفاظ، محاورات، اشخاص و مقامات، قرآنی آیات، عربی و فارسی کے الفاظ و محاورات، فقہی اصطلاحات اور عقلی و منطقی دلائل و براہین کا استعمال ہوا ہے جن کو بہ آسانی ہر طالب علم نہیں سمجھ سکتا**

محمد حارثی بدخشی 1626 میں آگرے میں انتقال کیا،فرہنگ جہانگیری اکبر کے عہد میں شروع ہو کر نور الدین جہانگیر کی حکومت میں انجام کو پہنچی،اس لیے اس کے نام معنون کی گئی،انجو کو از راہ تحقیر میاں لکھا ہے،جیسے ایک جگہ فیضی کو لکھتے ہیں اہل ہند میں سوا خسرو دہلوی کے کوئی مسلم الثبوت نہیں، میاں فیضی کی بھی کہیں کہیں ٹھیک نکل جاتی ہے''

''رشید کا نام عبد الرشید حسنی ہے،ان کے آبا و اجداد مدینہ منورہ کے رہنے والے تھے،یہ خود شہر ٹھٹھ میں پیدا ہوئے،منتخب اللغۃ اور فرہنگ رشیدی ان کی مصنفہ ہیں، شاعر بھی تھے اور رشیدی تخلص کرتے تھے،انھوں نے تحفۂ رشیدی کے نام سے شعراء فارسی کا ایک تذکرہ بھی لکھا ہے، اس کا ایک نسخہ ایشیاٹک سوسائٹی بنگال کے کرزن کلکشن میں محفوظ ہے،مرزا امیر بیگ بنارسی کے تذکرہ حدائق الشعرا کا یہ ماخذ ہے،خزانۂ عامرہ نولکشور پریس میں ان کا سال وفات 1866 لکھا ہے،غالب نے انھیں حقارت کی راہ سے شیخ لکھا ہے،ورنہ وہ جانتے تھے کہ عبد الرحمٰن حسنی سید ہیں۔ (مکاتیب غالب،امتیاز علی خاں عرشی،ص 174،175)

مالک رام کا شمار ممتاز محقق اور اہم متنی نقاد میں ہوتا ہے،انھوں نے غبار خاطر پر حاشیہ لگایا ہے،غبار خاطر کے خط نمبر پانچ میں ایک جملہ ہے''تھکا ماندہ قیام گاہ پر پہنچا، تو صاحب مکان کو منتظر اور کسی قدر متفکر پایا، یہ صاحب کچھ عرصہ سے بیمار ہیں،اور ایک طرح کی دماغی الجھن میں مبتلا رہتے ہیں'' صاحب مکان کے متعلق مالک رام لکھتے ہیں:

''صاحب مکان سے مراد شری بھولا بھائی ڈیسائی ہیں،جن کے ساتھ مولانا ٹھہرا کرتے تھے،ان کا 6 مئی 1946 کو دل کی حرکت بند ہو جانے سے انتقال ہوا، آخری عمر میں وہ کچھ دماغی پریشانیوں کا شکار رہنے لگے تھے۔'' (غبار خاطر، مالک رام،ص 295)

ان محققین کا ذکر اور ان کی کتابوں سے مثال دینے کا اصل مقصد یہ ہے کہ نئے لوگ جو اس موضوع پر کام کرنا چاہتے ہیں وہ دیکھیں کہ کس طرح حواشی وتعلیقات تحریر کیے جاتے ہیں،اور کن چیزوں کا ذکر کرنا اس میں ضروری ہوتا ہے،عہد حاضر میں حواشی وتعلیقات کی اہمیت وافادیت پہلے سے کہیں زیادہ ہو گئی ہے، کیوں کہ جب ہم کلاسک کتابوں کا مطالعہ کرتے ہیں تو اس میں مصنف کے معاصرین اور ان کے خاندان کے دیگر افراد کا ذکر ملتا ہے ،قدیم زمانے کی تحریروں میں بڑی تعداد میں ایسے الفاظ، محاورات، اشخاص و مقامات، قرآنی آیات، عربی و فارسی کے الفاظ و محاورات، فقہی اصطلاحات اور عقلی و منطقی دلائل و براہین کا استعمال ہوا ہے جن کو بہ آسانی ہر طالب علم نہیں سمجھ سکتا، نیز ان کتابوں میں استعمال شدہ بہت سے الفاظ و اصطلاحات اب متروک قرار پا چکے ہیں ایسے میں حواشی وتعلیقات کی ضرورت مزید بڑھ گئی ہے، ورنہ خدشہ ہے کہ یہ پرانی اور کلاسیکی کتابیں خود اردو والوں کے لیے ہی قصۂ پارینہ نہ بن جائیں۔ نیز ان کتابوں میں اس زمانے میں مستعمل کتب و رسائل، اشیا اور دیگر چیزوں کے نام ملتے ہیں جو بعد میں حوادث زمانہ کا شکار ہو کر ناپید ہو گئی ہیں۔ اسی طرح اس زمانے کے بہت سے محاورات بھی آج کے لیے نا قابل فہم ہیں، تاریخی نقطہ نظر سے ان کی تفصیل و معلومات کو حاصل کر کے حواشی وتعلیقات میں جمع کرنے سے ہم تاریخی، فنی اور معروضی اعتبار سے مضبوط و مالا مال ہو جاتے ہیں، آج جب ہم مکاتیب غالب و سرسید اور اس جیسی دیگر کتابوں کا مطالعہ کرتے ہیں تو ان میں موجود اسما، اماکن، کتب و حوادث کی از سر نو تفہیم کی ضرورت پڑتی ہے، کیوں کہ فی زمانا اس کی زیادہ تر چیزیں پردۂ خفا میں ہیں، جن کی عدم تفہیم کی وجہ سے ہم غالب و سرسید کی تحریروں سے خاطر خواہ استفادہ نہیں کر سکتے ،اس لیے ضرورت ہے کہ حواشی وتعلیقات کے ذریعے نسل نو کے لیے ان کی تفہیم کو آسان بنائیں۔

■

Md Shadab Shamim
D-35, Fourth Floor
Shaheen Bagh, Jamia Nagar
New Delhi- 110025
Mob.:9643885605

سعدیہ صدف

اکبر الہ آبادی
رباعی گو درویش

اکبر کی شاعری کے مطالعے سے یہ ظاہر ہوجاتا ہے کہ ان کا زاویۂ نظر اوروں سے مختلف تھا۔ اس کی وجہ یہ بھی ہوسکتی ہے کہ فطرت نے ان کے اندر حس مزاح کوٹ کوٹ کر بھردی تھی۔ اسی فطری عنصر کی مہربانی رہی کہ انھوں نے بڑی سے بڑی بات بھی مزاح کے توسط سے کہہ دی کہ سننے والے کو گراں نہ گذری اور ان کا مقصد بھی پورا ہوگیا۔ مقصد پورا ہونے سے یہ مراد ہے کہ اکبر بحیثیت ایک انسان کے اپنی قوم و ملت کے لوگوں کے برے حال پر کف افسوس تو مل رہے تھے۔

اکبر نے 1846 کو بارہ، ضلع الہ آباد میں آنکھیں کھولیں۔ ابتدائی تعلیم گھر پر حاصل کی۔ 1874 میں وکالت کی ڈگری حاصل کی۔ 1988 میں سب جج مقرر ہوئے۔ پھر ساری زندگی وکالت کرتے رہے۔ اس قدر علم کے حصول کے باوجود اکبر نہایت ہی خلیق، منکسر المزاج، مشفق و مہربان شخص تھے۔ صداقت و ہمدردی، شوخی و ظرافت کے ساتھ ان کے مزاج میں رچی بسی ہوئی تھی۔ زودگوئی بھی ان کے افکار پر دال ہے کہ انھوں نے چار کلیات یادگار چھوڑی۔ جن میں غزلوں، مثنویوں، قطعات کے ساتھ ساتھ رباعیاں بھی شامل ہیں۔ ان کی غزلوں میں رومان کے ساتھ طنز کی ٹیس بھی ملتی ہے۔ یہی حال ان کے قطعات کا بھی ہے۔ لیکن طنز کی ٹیس سے زیادہ مزاح کا پہلو ہے۔ جو قاری کو مسکراہٹ کے ساتھ ساتھ یہ سوچنے پر مجبور کرتا ہے کہ واقعی ہماری تہذیب کی جڑیں اکھڑنے پر آچکی ہیں، بعض اوقات یہ کہنا ہی پڑتا ہے کہ اکھڑ چکی ہیں۔

صنف رباعی کی بات کریں تو تصوف و اخلاق ان کا خاص وصف ہے۔ بے ثباتیِ دنیا اور نصیحت کے پہلو بھی اس میں شامل ہیں۔ اکبر نے بھی اپنی رباعیوں میں ان مضامین کو پیش کیا لیکن ان کے ساتھ طنز و مزاح کا تڑکا بھی لگایا۔ یہ اور بات کہ کہیں کہیں طنز کی کاٹ اتنی شدید ہے کہ مزاح کا پہلو اس کے پس پشت ہوگیا ہے۔ اکبر کی رباعیوں کی تعداد 260 ہے۔ جو ان کے تینوں کلیات میں شامل تھیں۔ ان رباعیوں کو 'رباعیات اکبر' کے نام سے ادب اطفال کے معروف و خوش فکر شاعر عادل اسیر دہلوی مرحوم نے 2013 میں مرتب کیا۔ ان رباعیوں کے مطالعے سے اکبر بحیثیت انشا پرداز و صوفی بزرگ کے ہمارے سامنے آتے ہیں۔ یعنی ایک ایسے شخص کی صورت میں جو نہایت ہی مذہبی ہے۔ اور اسی وصف کے ساتھ معاشرے کو بارہا یہ پیغام دیتا ہوا، یہ نصیحتیں کرتا نظر آتا ہے کہ دنیا سے دل لگی ٹھیک نہیں۔ فکر آخرت میں ہی نجات مضمر ہے۔ آیئے ان کی رباعیاں ملاحظہ فرمائیں۔

کیا تم سے کہیں جہاں کو کیسا پایا
غفلت ہی میں آدمی کو ڈوبا پایا
آنکھیں تو بے شمار دیکھیں لیکن
کم تھیں بخدا جن کو بینا پایا

دنیا کرتی ہے آدمی کو برباد
افکار سے رہتی ہے طبیعت ناشاد
دو ہی چیزیں ہیں بس محافظ دل کی
عقبٰی کا تصور اور اللہ کی یاد

ان رباعیوں کے مطالعے سے اکبر کی شبیہ ایک شاعر کی جگہ ایک بزرگ کے طور پر ابھرتی ہے۔ یعنی ایک ایسا تجربہ کار شخص جس نے دنیا کو بڑے قریب سے دیکھا اور اس کی ناپائیداری سے خوب واقف بھی ہے۔ اس کے تجربے نے اسے اتنا پختہ کار بنادیا ہے کہ وہ بہ بانگ دہل یہ کہنے پر بضد ہے۔

جگہ دل لگانے کی دنیا نہیں ہے
یہ عبرت کی جا ہے تماشا نہیں ہے

بے ثباتیِ دنیا کو کس خوبصورتی سے اس رباعی میں پیش کیا ہے۔

دنیا سے میل کی ضرورت ہی نہیں
مجھ کو اس کھیل کی ضرورت ہی نہیں
درپیش ہے منزل عدم اے اکبر
اس راہ میں ریل کی ضرورت ہی نہیں

اکبر کی شاعری کے مطالعے سے یہ ظاہر ہوجاتا ہے کہ ان کا زاویۂ نظر اوروں سے مختلف تھا۔ اس کی وجہ یہ بھی ہوسکتی ہے کہ فطرت نے ان کے اندر حس مزاح کوٹ کوٹ کر بھردی تھی۔ اسی فطری عنصر کی مہربانی رہی کہ انھوں نے بڑی سے بڑی بات بھی مزاح کے توسط سے کہہ دی کہ سننے والے کو گراں نہ گذری اور ان کا مقصد بھی پورا ہوگیا۔ مقصد پورا ہونے سے یہ مراد ہے کہ اکبر بحیثیت ایک انسان کے اپنی قوم و ملت کے لوگوں کے برے حال پر کف افسوس تو مل رہے تھے۔ لیکن ساتھ ہی وہ انھیں اس پستی و ذلت سے آزاد کرانا چاہتے تھے۔ بس ان کا طرز اظہار جداگانہ تھا۔ یعنی جب ہمیں کوئی بات چبھتی ہے یا معاشرے کا کوئی رنگ ہم پر اثر انداز نہیں ہو پاتا تو ہم اس سے یا تو راہ فرار اختیار کرتے ہیں یا پھر اپنی فطری صلاحیت کو بروئے کار لاتے ہوئے اپنے مقاصد کی تکمیل کا فریضہ

انجام دیتے ہیں۔ کیونکہ دیرینہ توہمات کا خاتمہ کسی اکیلے کے بس کی بات نہیں۔ لیکن یہ بھی سچ ہے کہ ایک آدمی ہی بغاوت کا محرک بھی بنتا ہے۔ اکبر نے بھی اپنے جذبات اور اپنے مطالب کی ترسیل کے لیے شاعری کی راہ اختیار کی۔ یاد رہے کہ جس زمانے میں اکبر طنز و مزاح کی پھلجھڑی جلا رہے تھے اسی زمانے میں شاعر مشرق علامہ اقبال اپنی سنجیدہ شاعری سے اور سرسید احمد خان اپنی تحریک اور اپنے مقالات کے ذریعے سوئی ہوئی قوم کو جگانے کی اور ان کے قلب کو گرمانے کی کوششیں کررہے تھے۔ ان بزرگوں کے طرز ایک دوسرے سے جدا ضرور تھے لیکن مقصد ایک ہی تھا۔ اس اخلاقی فریضے کی ادائیگی اکبر نے اپنی رباعیوں میں بھی کی ہے۔ یعنی انھوں نے اخلاقی مضامین کو اپنے طور پر رباعیوں میں محفوظ کردیا ہے جن کی صداقت سے مفر کسی دور میں بھی ممکن نہیں۔ نمونے کے طور پر چند رباعیاں پیش خدمت ہیں۔

ہو علم اگر نصیب تعلیم بھی کر
دولت جو ملے تو اس کو تقسیم بھی کر
اللہ عطا کرے جو عظمت تجھ کو
جو اہل ہیں اس کے ان کی تعظیم بھی کر

بے سود ہے گنج و مال و دولت کی تلاش
ذلت ہے دراصل جاہ و شوکت کی تلاش
اکبر تو سرور طبع کو علم میں ڈھونڈ
محنت میں کر سکون و راحت کو تلاش

ان رباعیوں میں شاعر نے کتنی اہم باتیں کتنے سہل انداز میں پیش کی ہیں۔ تعلیم حاصل کرنا ہر انسان کا بنیادی حق ہے۔ تعلیم انسانوں کو اچھے اور برے کی تمیز سکھانے کے ساتھ ساتھ زندگی کا شعور بھی عطا کرتی ہے۔ لیکن اکثر انسان علم حاصل تو کرلیتا ہے مگر شعور سے عاری رہ جاتا ہے۔ علم اور دولت دونوں ہی محنت سے تقدیر کے دامن میں جگہ پاتے ہیں۔ لہٰذا علم ہو کہ دولت ان کے حصول کے بعد انھیں دوسروں تک پہنچانا بھی کارِ خیر ہے۔ بے شک اس کی صورت کوئی بھی ہو۔ فائدہ اسی میں ہے کہ خدا کی جانب سے جو بھی نعمتیں ہمیں میسر ہیں انھیں دوسروں تک پہنچائیں۔ جو ان نعمتوں سے محروم ہیں انہیں ان نعمتوں میں شریک کرکے خلق خدا کی خوشنودی حاصل کریں تب ہی خدا کی خوشنودی حاصل ہوسکے گی۔ کیونکہ محبت ہو کہ عزت، عظمت ہو کہ دولت، یہ سب بانٹنے سے گھٹتی نہیں بڑھتی جاتی ہیں، بڑھتی ہی جاتی ہیں۔ اسی سے ثوابِ لطفِ زندگی ہے۔ اسی سے تہذیب معاشرت پنپتی ہے۔ مذہب اور معاشرت بھی ایک دوسرے سے جدا نہیں۔ اگر ان میں اختلاف ہوگا تو معاشرہ ناپائیداری کا شکار ہوجائے گا۔ نتیجتاً خسارہ ہی خسارہ ہاتھ آئے گا۔

مذہب کا معاشرت سے ہے ربط کمال
دونوں جو ہوں مختلف تو آرام محال
پہلے یہ مسئلہ سمجھ لیں احباب
بعد اس کے رفارم کا کریں دل میں خیال

گر جیب میں زر نہیں تو راحت بھی نہیں
بازو میں سکت نہیں تو عزت بھی نہیں
گر علم نہیں تو زور و زر ہے بے کار
مذہب جو نہیں تو آدمیت بھی نہیں

ان رباعیوں میں اکبر نے مذہب کی اہمیت کو واضح کردیا ہے۔ اسی کے ساتھ اکبر کا نظریہ زندگی بھی ہم پر آشکار ہوجاتا ہے کہ مذہب کا معاشرت سے گہرا تعلق ہے یا یہ کہ یہ ایک دوسرے کے لیے لازم وملزوم ہیں۔

اکبر کے طرز سخن سے ان کے زمانے کا رنگ صاف ظاہر ہے۔ یعنی ان کے عہد کی تصویر کشی ان کے کلام سے ہوجاتی ہے۔ یہی وہ زمانہ تھا کہ جس میں سرسید جیسا محبّ قوم بھی اپنی تحریک کا علم تھامے، علی گڑھ کی بنیاد کو مضبوط ترین کرنے میں ہمہ تن مصروف تھا۔ سرسید نے بہت پہلے اس ضرورت کو محسوس کرلیا تھا کہ ہماری قوم توہمات اور دقیانوسیت میں مبتلا ہے۔ قوم کی زبوں حالی اسی وقت خوش حالی میں بدل سکتی ہے جب ہماری قوم جدید تعلیم سے آراستہ و پیراستہ ہو۔ اسی لیے انھوں نے ایسے مقالات لکھے جو اس وقت خفتہ قوم کو بیدار کرنے کے لیے ضروری تھی۔ انگریزوں سے ان کے مراسم اچھے تھے اس سبب انھیں علی گڑھ مسلم کالج کے قیام میں کافی مدد ملی۔ خوش نصیب تھے کہ اپنی جدو جہد کے ذریعے اپنے خواب کو شرمندۂ تعبیر کرلیا۔ نسل در نسل ان کے اس کارنامے سے فیض پاتی رہی ہے اور آگے بھی فیض پاتی رہے گی۔ اس مناسبت سے اپنی قوم کا افتخار بلند کرنے میں سرسید سبقت لے گئے۔ کام بڑا تھا تو دشواریاں بھی بڑی بڑی درپیش تھیں۔ ہم سب واقف ہیں کہ اس دردمند انسان کو کالج کے قیام میں کن کن مصیبتوں کا سامنا کرنا پڑا۔ لیکن ان کا عزم کسی بھی صورت کمزور نہ ہوسکا۔ اکبر سرسید کی کوششوں کا اعتراف تو کرتے ہیں لیکن ان کے طرز زندگی سے ناخوش نظر آتے ہیں۔ کیونکہ سرسید کے مطابق جدید تعلیم سے آراستہ ہونے کے ساتھ ہمیں اپنی زندگی میں بھی جدیدیت کو اپنانے کی ضرورت ہے۔ لیکن اس جدت پسندی کے اختیار سے کسی بھی صورت یہ بات واضح نہیں ہوتی کہ انھوں نے مذہب کو ترک کرنے کی بات کہی ہو۔ ممکن ہے کہ جدیدت کا خمار اس قدر چھایا ہوگا کہ لوگ مذہب بیزاری پر بھی تیار ہوگئے ہوں گے۔ اسی لیے اکبر کے طنز کے نشتر اس پہلو پر بھی پڑے اور انھوں نے سرسید کی تحریک اور خود سرسید سے بھی چھیڑ چھاڑ کی۔

سید صاحب سکھا گئے ہیں جو شعور
کہتا نہیں تم سے میں کہ ہو اس سے نفور
سوتوں کو جگا دیا انھوں نے لیکن
اللہ کا نام لے کے اٹھنا ہے ضرور

سرسید کو فلک نے تھمنے نہ دیا
تہذیب کو پھر دوبارہ جمنے نہ دیا
ملت کی شکست میں مدد دی کامل
بننے لگی قوم جب تو بننے نہ دیا

گرچہ اکبر نے ایک مدت تک سرسید کے نظریات سے اختلاف کیا لیکن انھیں قریب سے جاننے کے بعد وہ ان کے معترف بھی ہوئے اس سلسلے میں عبدالماجد دریابادی جیسے انشاپرداز رقم طراز ہیں کہ:

''اکبر مذہب کے بڑے حامیوں اور مشرقیت کے خاص طرف داروں میں تھے۔ اور یہ بات یاد رہے کہ وہ وقت تھا جب 'رفارم' یا اصلاح وتجدد کا جھنڈا سید احمد خاں مرحوم کے ہاتھ میں تھا۔ اکبر ان کے معاصر تھے۔ گو سن میں کہیں ان سے چھوٹے اور علی گڑھ میں خود منصف رہ کر 'رفارم' یا تجدد کے کرشمے اپنی آنکھوں سے دیکھ چکے تھے۔ کلام میں خوب ہی خوب چٹکیاں لیتے جاتے ہیں لیکن یہ چٹکیاں بھی عموماً گدگدی کے رنگ میں ہوتی ہیں۔''

(اکبر نامہ، مرتب: عبدالعلیم قدوائی، ص:305، ادارۂ انشائے ماجدی، کلکتہ 2008)

یقیناً سرسید اور اکبر کا مقصد ایک تھا۔ گرچہ انھوں نے سرسید کی تحریک اور ان کے مغربی رنگ ڈھنگ پر طنز کے تیر چلائے لیکن علی گڑھ مسلم کالج کے قیام سے وہ بھی متاثر تھے اور پھر سرسید کو قریب سے جاننے کے بعد وہ ان کی اس کامیابی پر خوش بھی تھے۔ اس کی تصدیق 'رباعیات اکبر' کے مرتب عادل اسیر دہلوی صاحب کے ان جملوں سے ہوجاتی ہے:

''سرسید کی تحریک سے اکبر الہ آبادی کو اختلاف تھا جس کا اظہار انھوں نے اپنی شاعری میں جگہ جگہ کیا ہے۔ وہ انگریزوں کی اندھی تقلید کو پسند نہیں کرتے تھے لیکن جب علی گڑھ میں رہ کر سرسید کی تحریک کو قریب سے دیکھنے

کا موقع ملا تو ان کے خیالات بدل گئے۔''

(رباعیاتِ اکبر، مرتب: عادل اسیر دہلوی، ملک بک ڈپو، دہلی، 2013،ص6)

اس لیے اب اکبر اپنی قوم کو یہ پیغام دیتے نظر آتے ہیں کہ بہتر ہے کہ اب ہر طرح سے علی گڑھ کا قصد کیا جائے۔ کیونکہ وہاں ہر طرح کا درس اور علوم کی سبیلیں موجود ہیں۔ ان کے مطابق علی گڑھ کالج مسلمانوں کے گلدان کا گلدستہ ہے۔ قوم کی ترقی کا راز اب یہیں سے افشا ہونا ہے۔ اس طرح اکبر خود بھی سرسید کی تحریک کا حصہ بن جاتے ہیں۔ اور پھر اس اعتراف کے ساتھ سرسید کی تعظیم میں بھی اکبر رطب اللسان نظر آتے ہیں۔ وہ اپنے ہم وطنوں کو یہ درس دیتے ہیں کہ بننا ہے اگر تو سرسید بنو۔ ورنہ انگریزی تعلیم تو ہر کوئی حاصل کر رہا ہے۔ یعنی سرسید کو اپنا آئیڈیل بنانا نئی نسل کے لیے ضروری ہے تاکہ قوم کی ترقی تیز تر ہو سکے۔ یعنی کوئی ایسا کارنامہ انجام دینے کی ٹھانے جس طرح سرسید نے کیا اور علی گڑھ جیسا تحفہ مسلمانوں کو عطا کر دیا۔

بہتر ہے یہی کہ اب علی گڑھ چلیے
رکیے نہ کسی کے واسطے بڑھ چلیے
جس فن کا ہو درس ہو جیے اس میں شریک
جو پیش آئے سبق اسے پڑھ چلیے

ظاہر میں اگرچہ راز سر بستہ ہے
مضمون لطیف و خوب برجستہ ہے
پودا نہیں پھول کا علی گڑھ کالج
گلدان میں مسلموں کا گلدستہ ہے

اعزاز نسب کے مٹتے جاتے ہیں نشاں
اگلے سے خیال ہند میں اب وہ کہاں
سید بننا ہو تو بن سر سید
ہونا ہو خان تو تم ہو انگریزی خواں

اکبر نے طنز کے لیے معاشرے کے کم و بیش تمام پہلوؤں کو اپنے دائرۂ کار میں لیا۔ انھوں نے انسانوں کی بے لگام خواہشات اور ان کی مطلب پرستی کو بھی موضوع بنایا ہے۔ ذیل کی رباعیاں اسی ضمن میں پیش کی جاتی ہیں۔ یہ رباعیاں ان کے تجربے کی دلیل بھی ہیں ساتھ ہی انسانی فطرت کی بے ضمیری پر بھی دال ہیں۔

تکمیل میں ان علوم کے ہو مصروف
ٹیچر کی جو طاقتوں کو کردیں مکشوف
لیکن تم سے امید کیا ہو کہ تمھیں
عہدہ مطلوب ہے وطن مالوف

ہے حرص و ہوس کے فن کی مجھ کو تکمیل
غیرت نہیں میری بزم دانش میں دخیل
ہیں نفس کی خواہشیں بہت مجھ کو عزیز
جب چاہیں کریں خوشی سے مجھ کو ذلیل

اسی طرح اب ان رباعیوں کو بھی دیکھیے۔ ایک تو خواہشات کی غلامی اس پر نقالی۔ ان بری خصلتوں کے سبب قوم کی حالت ابتری کا نمونہ بن چکی ہے۔ اکبر نے ان بشری کمزوریوں سے پاک رہنے کی تلقین اپنے انداز میں یوں کی ہے۔

ہر چند کہ کوٹ بھی ہے پتلون بھی ہے
بنگلہ بھی ہے پاٹ بھی ہے صابون بھی ہے
لیکن یہ میں تجھ سے پوچھتا ہوں ہندی
یورپ کا تری رگوں میں کچھ خون بھی ہے

جو حسرت دل ہے وہ نکلنے کی نہیں
جو بات ہے کام کی وہ چلنے کی نہیں
یہ بھی ہے بہت کہ دل سنبھالے رہیے
قومی حالت یہاں سنبھلنے کی نہیں

اکبر کی مذکورہ رباعیوں کے مطالعے سے ان کے فکر کی کئی گرہیں ہم پر کھلیں جن سے ان کے تخیل کی بلندی کا احساس ہوجاتا ہے۔ خاص کر اس درد مند دل سے شناسائیت کا موقع ملتا ہے جو اپنی قوم کی مفلوک الحالی پر ماتم کناں تھا۔ طنز کے پیرائے میں اکبر نے مذہب و معاشرت کے تمام تر کمزور پہلوؤں پر کاری ضرب لگائی اور خفتہ ذہنوں کو بیدار کرنے کا وہی کام کیا جو سرسید اور علامہ اقبال نے اپنی تخلیقات سے کیا۔ گرچہ ان کے انداز جداگانہ رہے لیکن مقصد بہر حال ایک ہی تھا۔ اکبر کی رباعیاں صاف ظاہر کر دیتی ہیں کہ وہ ایک صوفی شاعر ہیں۔ ان کی رباعیات کا مطالعہ کرنے پر قاری کو مختلف موضوعات، عام طور پر وہ موضوعات جو رباعی کا خاصہ ہیں مثلاً پند و نصیحت، اخلاقی مضامین، بے ثباتی دنیا کا ذکر، زہد و تقویٰ، گناہ و ثواب کے فلسفے اور تصوف کے مضامین ملتے ہیں۔ لیکن ان کی زیادہ تر رباعیوں میں یہ پیغام ملتا ہے کہ زندگی کا سفر بغیر مذہب کی پیروی کے ممکن نہیں۔ مذہب سے دوری یا لاعلمی دنیا و آخرت دونوں کے لیے نقصان دہ ہے۔ چاہے تعلیمی لیاقت کتنی ہی ہو، ہمیں اپنی تہذیب اپنے مذہب کی جڑوں سے لپٹے رہنے میں ہی کامیابی ملے گی۔ کائنات کے ذرے ذرے میں خدائے واحد کی جھلکیاں ہیں جن کو باطنی آنکھ سے ہی دیکھا جا سکتا ہے۔ شاعر خود اپنی رباعیات میں تصوف کے مضامین پرورہا ہے اس کا اعتراف خود اس کی رباعیوں سے ہوجاتا ہے۔

دینی پہلو کو اے برادر دیکھو
کانٹوں سے محترز گلِ تر دیکھو
نظمِ اکبر ہوئی ہے منقوش قلوب
آنکھیں ہوں اگر خدا کا دفتر دیکھو

سوچا نہیں خود غرض کو آئین ثواب
جتنا چھوڑو گے ہم کو تم ہو گے خراب
واللہ یہی نتیجہ ہوگا پیدا
دنیا میں حقارت اور عقبیٰ میں عذاب

ہر ایک کو ایک دن اجل آنی ہے
دنیا گزراں ہے، ہیچ ہے فانی ہے
لیکن مرنا جو عالم وجد میں ہو
گویا کہ شعاعِ نورِ یزدانی ہے

اکبر کی ان رباعیوں میں مذہب و معاشرت کے مختلف رنگ موجود ہیں۔ انھوں نے صنف رباعی کے ذریعے وہ باتیں بھی کہہ دیں جو وہ اپنی غزلوں اور نظموں میں نہ کہہ سکے تھے۔ اکبر اپنی غزلیہ اور نظمیہ شاعری کی طرح رباعی گوئی کے فن میں بھی کامل ہیں۔ نہ صرف موضوعاتی سطح پر اکبر کامل فن ہیں بلکہ فنی اعتبار سے بھی وہ کامیاب ٹھہرتے ہیں۔ ان کی رباعی گوئی کا لوہا اہل فن نے مانا ہے۔ اسی لیے محشر بدایونی جیسے شاعر بھی اکبر کی رباعی گوئی کے معترف نظر آتے ہیں۔

باقی ہے ادب کے ساتھ نامِ اکبر
سرمایۂ اردو ہے پیامِ اکبر
اربابِ نظر سے کوئی محشر پوچھے
گنجینۂ معنی ہے کلامِ اکبر

(مشمولہ: رباعیاتِ اکبر، مرتب: عادل اسیر دہلوی، ملک بک ڈپو، دہلی 2013،ص7)

آخر میں یہی کہوں گی کہ اکبر نے اپنے منفرد انداز کی بدولت صنف رباعی گوئی میں اپنا الگ آستانہ بنا لیا ہے۔ جو انھیں دنیا کی فکر سے بے نیاز کیے ہوئے ہے۔ اسی بنا پر شاعر ایک درویش کی صورت اپنی آخرت کی درستگی کے انتظام میں منہمک نظر آتا ہے۔

■

Sadia Sadaf
67, Kolo Tola Street
Kolkata - 700073 (WB)

وراثت کا تحفظ زندہ قوم کی شناخت ہے

اعجاز رسول

اردو رسائل میں عموماً ان ادبی مباحث اور مسائل پر زیادہ ارتکاز ہوتا ہے جن سے عوام یا معاشرے کا زیادہ گہرا رشتہ نہیں ہوتا۔ اردو زبان کے تعلق سے جو بھی گفتگو ہوتی ہے ان سے حقیقی صورت حال کا ادراک نہیں ہوپاتا۔ زبان کی زمینی صورت حال کیا ہے اس سے آگہی کے لیے ضروری ہے کہ تحریکات و رجحانات کے بجائے ان بنیادی مسائل پر توجہ دی جائے جن کا زبان کے فروغ اور تحفظ سے تعلق ہے۔ عموماً اردو کے حقیقی مسائل سے اجتناب کیا جاتا ہے اور یہ جاننے کی کوشش نہیں کی جاتی کہ کن کن علاقوں میں اردو کی حقیقی صورت حال کیا ہے؟

ماہنامہ 'اردو دنیا' میں سوال نامے کے ذریعے دراصل اردو زبان کے بنیادی مسائل سے واقفیت حاصل کرنے کی کوشش کی جارہی ہے تاکہ یہ اندازہ ہوسکے کہ ملک کے مختلف علاقوں میں تعلیم، تدریس اور دیگر سطحوں پر اردو زبان کی صورت حال کیا ہے اور وہاں کس طرح کی دشواریاں اور مشکلات پیش آرہی ہیں۔ جب تک اردو زبان کے بنیادی مسائل پر سنجیدگی سے غور نہیں کیا جائے گا تب تک اردو زبان کے تحفظ اور بقا کے لیے مربوط لائحہ عمل تیار کرنا مشکل ہوگا۔

س: زبانوں کی موت کے وجوہات کیا ہے؟

ج: زبانوں کی موت کے کئی اسباب ہیں۔ پہلا سبب یہ ہے کہ اگر کوئی زبان عوام سے کٹ جاتی ہے تو وہ دھیرے دھیرے موت کی آغوش میں چلی جاتی ہے۔ دوسرا سبب یہ ہے کہ جس زبان سے نئی نسل بے بہرا ہو جائے وہ زبان بھی مر جاتی ہے۔ جدید تکنیک کی کمی اور روزگار سے عدم تعلق بھی زبان کو موت سے ہم کنار کردیتا ہے۔ وغیرہ وغیرہ.....

س: زبان کو زندہ رکھنے کے لیے کون سا طریقہ کار اختیار کیا جانا چاہیے؟

ج: مذکورہ اسباب کا حل زبان کو زندہ رکھنے کا طریقہ کار ہے۔

س: زبان کا تہذیب وثقافت سے کیسا رشتہ ہے؟

ج: تہذیب وثقافت سے زبان کا گہرا رشتہ ہے کیونکہ زبان تہذیب وثقافت کا آئینہ ہوتی ہے اور اگر زبان کو چوٹ پہنچتی ہے تو تہذیب وثقافت کا بھی خسارہ ہوتا ہے۔

س: کیا زبانوں کی موت سے انسانی وراثت کے تحفظ کا مسئلہ جڑا ہوا ہے؟

ج: بیشک۔ وراثت کا تحفظ زندہ قوم کی شناخت ہے۔ زبان وراثت کا آئینہ اور ترجمان ہوتی ہے۔ اس لیے یہ بات بلا خوف تردید کہی جاسکتی ہے کہ زبانوں کی موت سے انسانی وراثت کے تحفظ کا مسئلہ بھی جڑا ہوا ہے۔

س: کیا کسی زبان میں خواندگی، سائنسی، سماجی مواد کی کمی سے زبان پر منفی اثرات پڑتے ہیں؟

ج: یقینی طور پر ان سے منفی اثرات پڑتے ہیں۔ زندہ زبان کی پہچان یہ ہے کہ وہ زندگی کے ہر شعبے کی ترجمانی کرے۔ سائنسی، سماجی اور عمرانیات سے متعلق مضامین کی اشاعت بھی ضروری ہے تاکہ ہر شعبے کے لوگ زبان سے جڑے رہیں۔

س: موجودہ حالات میں اردو زبان کو کس طرح کے خطرات لاحق ہیں؟

ج: عہد حاضر میں اردو زبان کو کئی طرح کے خطرات در پیش ہیں مثلاً نئی نسل سے کٹ جانے کا خطرہ، عصبیت کا خطرہ، اور روزی روٹی سے رشتہ کمزور ہو جانے کی وجہ سے عوام کی ناتوجہی کا خطرہ وغیرہ۔

س: اردو کا مستقبل کیا ہے؟

ج: میری نظر میں اردو کا مستقبل روشن ہے۔ البتہ اس کا حال کٹھن ہے جبکہ ماضی قابل تحسین ہے۔ مایوسی کفر ہے اس لیے ہم قوی امید کے ساتھ یہ کہہ سکتے ہیں کہ اگر اردو کا ہر شیدائی اس کے فروغ کی کوشش کرے تو اردو کا مستقبل تابناک ہوگا۔ یہ کام مشکل ہے مگر راقم الحروف کی زبان میں۔

دشوار ہے مگر وہی منزل تلاش کر
ہمت نہ ہار موج میں ساحل تلاش کر

عزم محکم سے دشواریاں ختم ہوجاتی ہیں اور مستقبل تابناک ہوجاتا ہے۔

س: زبان کی سطح پر جو بگاڑ پیدا ہو رہا ہے اس کو روکنے کے لیے کون سی ترکیبیں استعمال کی جاسکتی ہیں؟

ج: اس کو روکنے کے لیے تلفظ کی صحت کا خیال رکھنا ہوگا کیونکہ بیمار تلفظ سے زبان کی بدمزگی کا احساس ہوتا ہے۔ ساتھ زبان کے استعمال میں قواعد کا خیال رکھنا ضروری ہے۔ تذکیر وتانیث کے غلط استعمال سے بھی زبان بے مزہ ہو جاتی ہے۔ رسم الخط کا تحفظ بھی اسی سلسلے کی کڑی ہے۔

س: کیا اردو کے ادارے، تنظیمیں زبان سے زیادہ ادب پر توجہ دے رہے ہیں اور زبان سے متعلق کتابوں کی اشاعت تقریباً رک سی گئی ہے؟

ج: ادب زبان کی ترقی یافتہ شکل ہے۔ دونوں ایک دوسرے کا اٹوٹ حصہ ہیں لیکن یہ سچ ہے کہ ادب کی جڑ زبان کی زمین میں ہی پیوست رہتی ہے۔ لہٰذا ادب کے فروغ کے لیے زبان کا فروغ نہایت ضروری ہے۔ اس لیے دونوں طرح کی کتابوں کی اشاعت اہم ہے۔

س: کیا کلاسیکیت، جدیدیت وغیرہ پر گفتگو سے زبان کو کوئی فائدہ پہنچ سکتا ہے؟

ج: یہ پیچیدہ سوال ہے اور اس کے جواب میں الگ الگ طرح کی دلیلیں پیش کی جاسکتی ہیں۔ میرے نزدیک اردو زبان کے فروغ کا مطلب ادب کا فروغ بھی ہے کیونکہ ادب زبان ہی کی ترقی یافتہ شکل ہے، مذکورہ موضوعات سے زبان کو فائدہ پہنچتا ہے۔ کلاسیکی ادب ہمیں خسرو، محمد قلی قطب شاہ، سراج، ولی، میر، غالب اور اقبال وغیرہ سے روشناس کراتا ہے تو جدید ادب سنہ 1960 کے بعد کے قلم کاروں کی تخلیقات کی اہمیت اجاگر کرتا ہے۔

س: آپ کے علاقے میں کتنے اردو میڈیم اسکول ہیں اور ان میں اساتذہ کی کتنی تعداد ہے؟

ج: میرا تعلق صوبۂ بہار کے ضلع نوادہ سے ہے۔ اس ضلع میں متعدد اردو میڈیم اسکول ہیں۔ جن میں اساتذہ کی تعداد ضرورت سے کم ہے۔ خالی جگہوں کو پر کرنے کی اشد ضرورت ہے کیونکہ اردو پڑھنے والے طلبہ وطالبات کی بڑی تعداد ہے اور اردو یہاں دوسری سرکاری زبان کا درجہ بھی رکھتی ہے۔

س: آپ کے علاقے میں کتنی لائبریریاں ہیں اور وہاں

کون کون سے اخبارات اور رسائل آتے ہیں؟
ج: نوادہ ضلع ہیڈ کوارٹر میں سرکاری لائبریری اور ضلع کلکٹریٹ اردو سیل کے علاوہ تقریباً سبھی کالج اور انٹر اسکول میں چھوٹی چھوٹی لائبریریاں ہیں۔ جن میں تقریباً دو درجن لائبریریوں میں قومی تنظیم، انقلاب، سہارا، عوامی نیوز، پندار، ایک قوم اخبارات آتے ہیں۔ بزم ادب نوادہ اور اردو ایکشن کمیٹی نوادہ کے دفتر میں قومی تنظیم، پندار، انقلاب، ایک قوم جیسے اردو روزناموں کے علاوہ ماہنامہ زبان و ادب، اردو دنیا، فکر و تحریر اور مژگاں رسالے آتے ہیں۔
س: آپ کے علاقے میں کتنی اردو تنظیمیں، ادارے اور انجمنیں ہیں اور وہ کس نہج پر اردو کے فروغ کے لیے کام کر رہی ہیں؟
ج: ہمارے علاقے نوادہ میں متعدد اردو تنظیمیں اور ادارے ہیں جن میں بزم ادب اسلام نگر نوادہ، اردو ایکشن کمیٹی نوادہ، حلقۂ ادب نوادہ، دار العلوم فیض الباری نزد رسول نگر نوادہ، مدرسہ اسلامیہ نوادہ، مدرسہ روہ نوادہ وغیرہ کو نمایاں حیثیت حاصل ہے۔
1 بزم ادب اسلام نگر نوادہ: ضلع کی سب سے قدیم بزم ہے جو تاحال زبان و ادب کی خدمت میں سرگرم ہے۔ اس کی بنیاد مرحوم ایس ایم فیض رسول پبلک پروسکیوٹر نوادہ کی سرپرستی میں 1977 میں پڑی۔ جس کے سکریٹری کے فرائض راقم الحروف نے انجام دیے۔ اس بزم کے زیر اہتمام بڑے بڑے مشاعرے اور سمینار منعقد کیے گئے جس میں مرحوم ایس ایم فیض رسول نے ہر طرح سے مالی تعاون کیا۔ ان کے بعد بھی ان کے فرزندان نے یہ سلسلہ جاری رکھا جو اللہ کے فضل سے آج بھی ہے۔ موجودہ سیکریٹری مشہور وکیل اور ایڈیشنل پی پی جناب محمد مبشر ہیں اور صدر کے فرائض محمد مصباح اے پی پی نوادہ انجام دے رہے ہیں۔
2 اردو ایکشن کمیٹی کی نوادہ ضلع شاخ 2012 میں قائم ہوئی۔ یہ کمیٹی ریاستی سطح پر اردو زبان و ادب کے فروغ کا کام بحسن وخوبی انجام دے رہی ہے جس کے ریاستی صدر چیف ایڈیٹر قومی تنظیم ایس ایم اشرف فرید ہیں۔ نوادہ ضلع میں اس کمیٹی کا صدر راقم الحروف ہے۔ یہ کمیٹی پوری لگن کے ساتھ اپنے مقصد کی طرف گامزن ہے۔
3 حلقۂ ادب بہار ایک مشہور و معروف تنظیم ہے جو پوری ریاست میں اردو زبان و ادب کے فروغ کا کام کر رہی ہے۔ اس کے جنرل سکریٹری ممتاز ادیب جناب فخر الدین عارفی ہیں۔ نوادہ میں اس کمیٹی کی شاخ کی بنیاد 2012 میں پڑی۔ یہ کمیٹی بھی پورے جوش وخروش کے ساتھ نوادہ ضلع میں اردو زبان و ادب کے فروغ کا کام کر رہی ہے۔
س: آپ کے علاقے میں اردو سے جڑی ہوئی کتنی شخصیات ہیں جن کی خدمات کا اعتراف علاقائی، قومی سطح پر نہیں کیا گیا ہے؟
ج: راقم الحروف (ڈاکٹر اعجاز رسول) نے متعدد اصناف سخن مثلاً تنقید، تحقیق، نظم، غزل اور قطعہ وغیرہ میں طبع آزمائی کی ہے اور نثری و شعری دونوں اصناف میں کتابیں بھی شائع ہوئیں ہیں۔ ان کے علاوہ اردو زبان و ادب کی درس و تدریس میں بھی محویت کے ساتھ لگے ہیں۔ علاقائی سطح پر اور صوبائی سطح پر ان کی خدمات کا اعتراف کیا جاتا ہے لیکن قومی سطح پر توجہ نہیں دی جاتی ہے۔ یہ قابل غور امر ہے۔
س: آپ مقامی سطح پر اردو کے فروغ کے لیے کیا کوشش کر رہے ہیں؟
ج: نئی نسل کے بچے بچیوں کو اردو پڑھنے اور لکھنے کی ترغیب دے رہے ہیں۔ والدین سے گھر گھر جا کر یہ گزارش کر رہے ہیں کہ آپ اپنے بچے بچیوں کو اردو زبان سے روشناس کرائیں۔ پرائمری، مڈل اور اس سے اوپر کی کلاسز میں اردو زبان کی تعلیم دلوائیں۔ اردو اخبارات اور رسائل پڑھیں۔ ہم اپنی طرف سے بھی اپنے علاقے میں اردو اخبارات و رسائل فروغ اردو کے لیے خرید کر لوگوں میں تقسیم کرتے ہیں۔ اس کے علاوہ سال میں دو تین بار سمینار اور مشاعرہ بھی کرواتے ہیں۔
س: آپ کے ذہن میں فروغ اردو کے لیے کیا تجاویز اور مشورے ہیں؟
ج: اردو کے فروغ کے لیے جو تجاویز ہیں ان کا ذکر بہت کچھ اس سے قبل بھی کیا جا چکا ہے۔ ایک اور ضروری بات یہ ہے کہ اردو کا حقیقی فروغ اس وقت تک ممکن نہیں ہو سکے گا جب تک کہ ضلعی اور بلاک سطح پر یہ کوشش نہ کی جائے۔ ضلع اور بلاک کے متحرک اور فعال قلم کاروں کو شامل کرنا ہوگا۔ انھیں نظر انداز کرنے سے فروغ اردو پر منفی اثر پڑے گا۔ صرف ملک اور صوبے کی راجدھانیوں میں چند گنے چنے قلم کاروں کے درمیان سمینار اور مشاعرہ کرنے سے اردو کا فروغ نہیں ہوگا۔ اس کے لیے دور دراز کے معتبر اور باذوق لوگوں کو شامل کرنا ضروری ہے۔
س: اردو رسم الخط کی بقا کے لیے کیا کوششیں کی جاسکتی ہیں؟
ج: اردو رسم الخط کی مخالفت میں اٹھنے والی آواز کو دبانا ہوگا۔ اس کی ہر حالت میں مخالفت کرنی ہوگی کیونکہ اردو کا رسم الخط اردو زبان کا کلچر ہے۔ اردو رسم الخط پر حملہ میرے نزدیک اردو زبان کے کلچر پر حملہ ہے۔
س: دوسری علاقائی زبانوں میں اردو کے فروغ کی کیا صورتیں ہوسکتی ہیں؟
ج: اس کی بہت سی صورتیں ہیں۔ اردو زبان کا مزاج ہی گنگا جمنی تہذیب کا مزاج ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہندی، بھوجپوری، مگہی، میتھلی وغیرہ زبانوں میں اردو کی کئی اصناف سے استفادہ کیا جا رہا ہے۔ مثال کے طور پر کئی علاقائی زبانوں میں غزل کے فارم میں شاعری کی جا رہی ہے۔ یہ اردو کی مقبولیت کی دلیل ہے۔
س: کیا آپ کے اہل خانہ اردو زبان لکھنا، پڑھنا اور بولنا جانتے ہیں؟
ج: جی ہاں۔ اچھی طرح۔
س: آپ کے بعد کیا آپ کے گھر میں اردو زندہ رہے گی؟
ج: ان شاء اللہ۔ پرامید ہوں۔
س: غیر اردو حلقے میں فروغ اردو کے لیے کیا حکمت عملی اختیار کی جانی چاہیے؟
ج: اردو لرننگ کورس قائم کرنا چاہیے۔ اردو کو روزگار سے جوڑنا چاہیے۔ اس سے غیر اردو داں اردو کی طرف مائل ہوگا۔ کچھ جگہوں پر یہ تجربہ کیا بھی جا رہا ہے۔
س: آپ کے علاقے میں کتنے کالجز یا یونیورسٹیز ہیں جن میں اردو کی تعلیم دی جاتی ہے؟
س: ہمارے علاقے میں جس سے میری مراد نوادہ ضلع ہے۔ یہاں اردو بولنے والوں کی تعداد تقریباً پانچ لاکھ ہے اور پورے ضلع کی کل آبادی تقریباً بیس لاکھ ہے۔ اس ضلع میں مگدھ یونیورسٹی کے چار Constituent Colleges ہیں۔ ان کے علاوہ تقریباً دس انٹر اور ڈگری Ailiated Colleges ہیں۔ یہاں تقریباً پچیس سرکاری انٹر اسکول بھی ہیں جہاں اردو پڑھائی جاتی ہے۔ کالج اور اسکول کو ملا کر یہاں اردو پڑھنے والے لڑکے لڑکیوں کی تعداد (انٹر تا ڈگری سال رواں 2022) پانچ ہزار کے قریب ہے۔ ان اداروں میں درس و تدریس کی صورت حال غیر تشفی بخش ہے۔ باذوق اساتذہ بھی نہیں کے برابر ہیں۔ پڑھنے پڑھانے کا ماحول نہیں ہونے کی وجہ سے اردو زبان و ادب کے فروغ پر برا اثر پڑ رہا ہے۔
س: ملکی سطح پر غیر سرکاری تنظیموں سے اردو کی ترویج و اشاعت کے سلسلے میں کس طرح کی مدد لی جاسکتی ہے؟
ج: انھیں سمینار و مشاعرہ کرانے اور اردو لرننگ کورس قائم کرنے کی ترغیب دے کر۔
س: سنٹرل اسکول اور نو ودے ودالیہ میں اردو کی تعلیم کا کیا کوئی معقول انتظام ہے؟
ج: یہ انتظام بھی غیر تشفی بخش ہے۔

■

Dr. Ajaz Rasool
Mohalla: Islam Nagar, Near Noorani Masjid,
Distt: Nawada- 805110 (Bihar)
Mob-9934063674
Email:drsmajazrasool@gmail.com

ممتاز احمد خاں کا تنقیدی اختصاص

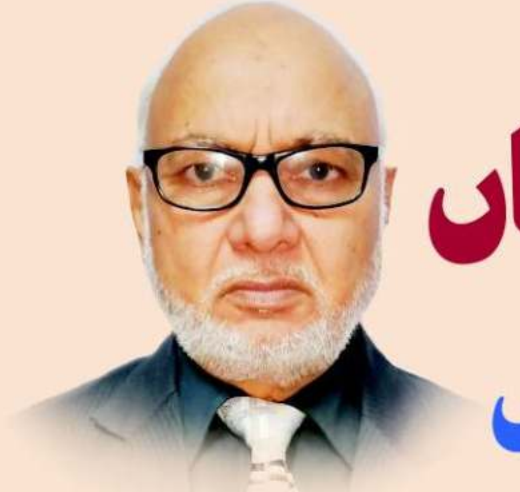

افشاں بانو

گذشتہ وبائی دور نے ہم سے ہمیشہ کے لیے اہالیانِ قلم سلطان اختر، شوکت حیات، حسین الحق، مشرف عالم ذوقی، ابوالکلام قاسمی اور ممتاز احمد خاں کو دور کردیا۔ ممتاز احمد خاں اردو کے ساتھ انگریزی کے بھی طالب علم رہے اور کلیم الدین احمد کی نگرانی میں انگریزی اردو لغت کے پروجیکٹ کا کئی برسوں تک حصہ رہے۔ آر این کالج، حاجی پور میں درس وتدریس کے فرائض انجام دینے کے بعد شعبۂ اردو، بی آر امبیڈکر بہار یونی ورسٹی سے وابستہ ہوئے اور وہیں سے سبکدوش ہوئے۔

ڈاکٹر ممتاز احمد خاں کی تصنیفی رفتار تیز نہیں رہی، وہ ٹھہر ٹھہر کر لکھنے اور سوجھ بوجھ کے ساتھ اپنے تنقیدی فیصلے کرنے کے لیے پہچانے گئے۔ انھوں نے اپنی تنقیدی زندگی کے لیے کچھ خاص موضوعات مقرر کر رکھے تھے۔ خاص طور پر اردو نثر کی تاریخ کے ساتھ جدید املا کے مسائل و مباحث کے دائرے میں رہتے ہوئے انھوں نے چند قیمتی مضامین تحریر کیے۔ اسلامی علوم سے ان کی وابستگی ظاہر تھی، اس کے سلسلے سے وہ اپنے ادبی مضامین میں بھی خاص توجہ دیتے تھے اور اپنی اسلام پسندی کا برملا اظہار کرتے تھے حالاں کہ اس بات کو زیادہ ادبا وشعرا یا ناقدین پسند نہیں کرتے تھے۔ شاید ادبی طور پر ان کے کام کے مقابلے کم مقبولیت ہونے کی یہ بھی وجہ ہے۔

ادب کی افہام وتفہیم میں ایک سرگرم راہ افسانہ، ناول اور شاعری کی ہم عصر روایات کے بارے میں اظہار خیال کا ہے۔ اکثر نقاد اس دائرے میں رہ کر کام کرتے ہیں۔ ان کی مقبولیت روز افزوں بڑھتی جاتی ہے مگر اس کے برخلاف نقادوں میں ایک طبقہ ایسا ہے جو شعر وادب کی کلاسیکی روایات، لسانیات اور غیر افسانوی نثر کے شعبے میں کام کرتا ہے، اس کی مقبولیت اور شناخت میں بالعموم سست رفتاری رہتی ہے۔ ادب کے مقبول میدانوں سے ایسے لکھنے والے ذرا دور ہوتے جاتے ہیں۔ اگر ادبی مراکز سے بھی وہ لوگ دور رہیں تو ان کی ادبی وعلمی شناخت پہ بھی مشکل گھڑی آئے گی۔ ممتاز احمد خاں کی تعلیم و تربیت تو عظیم آباد میں ہوئی مگر حاجی پور اور مظفر پور میں رہتے ہوئے اپنی کوششوں سے ادبی حلقہ تو تیار کیا مگر وہ ادبی اختیارکاری کے کام میں کارگر نہیں ہوسکتا تھا۔ انھیں وجوہات سے مل جل کر ممتاز احمد خاں اردو ادب کے حاشیائی کردار کے طور پر ہمارے بیچ قائم رہے۔

ممتاز احمد خاں کی کتاب 'اردو میں مرصع نثر کی روایت' ہے۔ اسے اتفاق کہنا چاہیے کہ یہ کتاب نقادوں اور مبصرین کی نگاہ میں امتیاز کے ساتھ کبھی سامنے نہیں آسکی۔ موضوع کی مناسبت اور معنویت پر غور کریں تو اس موضوع پر اردو میں کتابیں لکھی ہی نہیں گئیں۔ کچھ مضامین اور متفرقات یا کتابوں کے ابواب کو الگ کرلیں تو یہ علاقہ اب بھی سب سے کم زیرِ بحث رہنے والے علمی موضوعات سے آراستہ ہے۔ اردو میں نثر کی متعدد قسموں میں نثر مرصع کا آج سے دوسو اور تین سو برس پہلے سکہ چل رہا تھا۔ 'سب رس' سے لے کر 'فسانۂ عجائب' تک ہماری نثر مرصع نگاری کی وجہ سے طلسم خانہ بنی رہی مگر فورٹ ولیم کالج سے جو تازہ ہوا گلکرسٹ کے مشورے اور میر امن کی کوششوں سے طوفان کی شکل میں سامنے آئی اور جسے غالب سے لے کر سرسید احمد خاں اور ان کے رفقا نے انجام تک پہنچادیا۔ سادہ نثر نگاری کا طور عوام وخواص میں کچھ اس طرح سے بھایا کہ لوگوں نے مرصع نثر نگاری کو تاریخ کی ایک بندگلی کے طور پر سمجھا۔ اس کا یہ بھی اثر ہوا کہ محققین اور ناقدین نے مرصع نثر کی روایت کی طرف علمی سنجیدگی کے ساتھ کبھی توجہ ہی نہیں کی۔

ممتاز احمد خاں اس معاملے میں اردو کی ادبی تاریخ کے ایک ایسے ہوش مند نقاد کے طور پر سامنے آتے ہیں جنھیں اس بات کا احساس تھا کہ سادہ نثر نگاری کے چلن اور قبولِ عام کے باوجود ادبی نثر کے ارتقا کے ایک طالب علم کو لازمی طور پر نثرِ مرصع سے کماحقہٗ واقف ہونا چاہیے۔ انھیں باتوں کے پیشِ نظر انھوں نے اس انوکھے اور حاشیائی موضوع کو اپنے مطالعے کا حصہ بنایا۔

ممتاز احمد خاں نے نثر اور نظم یا شاعری کے فرق کو ظاہر کرنے کے لیے بڑی تفصیل سے بحث کی ہے۔ اس بحث کی روشنی میں ان کے نتائج ذیل میں پیش کیے جاتے ہیں:

1 شاعری میں وزن کی پابندی ہوتی ہے... نثر کا آہنگ وزن اور بحر سے عاری ہوتا ہے۔

2 نثر اور شعر میں دوسرا اہم فرق اجمال اور تفصیل کا ہے۔

3 شعر اور نثر کا تیسرا فرق یہ ہے کہ شاعری میں خیال اور جذبے کی ترجمانی کے لیے استعارہ، پیکر، علامت اور تشبیہ کا استعمال کیا جاتا ہے جب کہ نثر میں خیال وخبر کی ترجمانی وترسیل کے لیے عموماً سادہ اور غیر آراستہ اسلوب اختیار کیا جاتا ہے۔

یہ نتائج خودساختہ نہیں ہیں بلکہ اردو نثر کے اہم نقادوں کے دلائل سے استنباط کرتے ہوئے مصنف نے پیش کیے ہیں۔ نثر کی اقسام اور تاریخی طور پر سادہ نثر سے مرصع نثر کی طرف علمی حلقے کا کس طرح جھکاؤ ہوا، اسے ممتاز احمد خاں نے اپنے تجزیے میں خصوصیت کے ساتھ ذکر کیا ہے۔

اگرچہ یہ کتاب مرصع نثر کی روایت کو پیش کرنے کے لیے لکھی گئی ہے مگر ایک نقاد اور محقق کی حیثیت سے ممتاز احمد خاں نے اس بات پر خاص توجہ دی ہے کہ نثرِ مرصع کی تعریف اور فہم کے سلسلے سے جو بنیادی غلط فہمیاں ہیں، انھیں دور کردیا جائے۔ اس کام کے بغیر انھیں مشکل پیدا ہوتی کہ نثرِ مرصع کی اردو میں تاریخ متعین کرنے میں بار بار نثرِ سادہ کے مقابلے اسے بے وجہ آویزشوں کا موضوع بنانا پڑتا۔ انھوں نے دو بنیادی غلط فہمیاں واضح کی ہیں:

(الف): ''بعض کم یا نیم تعلیم یافتہ لوگ سمجھتے ہیں کہ ہر وہ چیز جو سجاوٹ اور مرصع کاری سے عاری ہو، خوب صورت اور اعلا درجے کی نہیں ہوتی۔ وہ یہ سمجھتے ہیں کہ سجاوٹ یا مرصع کاری کچھ ایسی چیزیں ہیں جو کسی فن پارے میں الگ یا اوپر سے ٹانک دی جاتی ہیں... ہر رنگین اور چمک دار شے خوب صورت اور اعلا درجے کی نہیں ہوتی۔ سادگی جسے ہم بادی النظر میں سادگی سمجھتے ہیں، پرکار بھی ہوسکتی ہے۔''

(ب) ''دوسری غلط فہمی... یہ کہ مرصع اسلوب بناوٹ اور تصنع کی پیداوار ہے، اس لیے فن پارے کی قدر و قیمت میں کوئی اضافہ نہیں کرتا۔ ایسی نثر محض لسانی کرتب بازی ہے۔ اس لیے اس کا کوئی جواز نہیں۔ یہ تاریخِ ادب کے ناقص مطالعے کی وجہ سے پیدا ہونے والا تعصب ہے۔

مرصع نگاری جب Obsession ہوجائے، جب یہ محض نمودِ علمیت بن جائے اور جب یہ موضوع سے ہم آہنگ نہ ہوتو یقیناً ناپسندیدہ اور فضول ہے۔''

ان اقتباسات سے کوئی قاری یہ سمجھ سکتا ہے کہ ممتاز احمد خاں کے ذہن میں نثر کی مختلف اقسام کا نہ صرف یہ کہ خاکہ موجود ہے بلکہ اس دائرے سے باہر تقابل و تطابق کے مراحل سے بھی وہ گزرتے ہیں۔ اس کتاب کی یہ سب سے بڑی خصوصیت ہے کہ انھوں نے اولاً اصولیات پر توجہ کی بعدۂ نثر کی تاریخ میں ان کے انطباق اور تنقید و تحقیق کی دیگر جہات کا مطالعہ کیا۔

عہدِ قدیم کی نثر نگاری کا جائزہ لیتے ہوئے مرصع نثر کی روایت میں انھوں نے 'سب رس' کو اپنے مطالعے کا سرنامہ بنایا ہے۔ 'کربل کتھا' کی نثر پر بھی بحث کرتے ہوئے شمالی ہندستان کی مرصع نثر کے آغاز کا جائزہ لیا ہے۔ 'نوطرزِ مرصع' کے حوالے سے ان کی گفتگو تفصیلی ہے۔ انھوں نے ان کتابوں میں اردو نثر کے اس ذائقے کو مثالوں کے ساتھ واضح کیا ہے۔ فورٹ ولیم کالج کی نثر اور اس عہد کے دیگر نثر نگاروں کے حوالے سے ان کی گفتگو اس اعتبار سے بہت اہم ہے کہ یہ پورا دبستان سادہ نثر نویسی کے حوالے سے مشہور ہے مگر ممتاز احمد خاں نے میر شیر علی افسوس، مرزا علی لطف، مظہر علی خاں ولا اور میر امن کی نثر سے مرصع نگاری کی روایت کو جوڑنے میں کامیابی پائی۔ ہر چند اس سلسلے سے 'فسانۂ عجائب' میں جتنی تفصیل چاہیے تھی، وہ نہیں آسکی ہے مگر مثالیں بہت نمائندہ منتخب کی گئی ہیں اور بہت آسانی کے ساتھ یہ سمجھا جاسکتا ہے کہ 'فسانۂ عجائب' کو نثرِ مرصع کا شاہکار کیوں کر قرار دیا جاسکتا ہے۔

خطوطِ غالب، محمد حسین آزاد کی نثر، سرشار اور خواجہ حسن نظامی وغیرہ کی تحریروں سے مثالیں جمع کر کے ممتاز احمد خاں نے اس حقیقت کو واضح کرنے میں کامیابی پائی ہے کہ سادہ نثر کے نمونوں میں بھی بہت ساری جگہوں پر نثرِ مرصع رگوں میں دوڑنے والے خون کی طرح سجاد حیدر یلدرم اور دیگر رومانی نثر نگاروں سے لے کر عہدِ حاضر کے مصنّفین تک نثری نمونوں کے ساتھ مصنف نے کوشش کی ہے کہ ہر اہم نثر نگار کی تحریر سے مثالیں جمع ہوجائیں اور یہ ثابت کیا جاسکے کہ اردو میں نثرِ مرصع کوئی اچھوت شے نہیں، اسے قدما نے تو برتا ہی ہے مگر ہر عہد میں کوئی نہ کوئی نثر نگار ایسا ضرور سامنے آجاتا ہے۔ ابوالکلام آزاد، رشید احمد صدیقی اور جوش ملیح آبادی کی نثر پر توجہ دیتے ہوئے مصنف نے کوشش کی ہے کہ بیسویں صدی کے اہم اصحابِ قلم کی تحریروں سے بھی ان خصوصیات کو تلاش کرنے میں کامیابی حاصل کی جائے۔

اردو کی ادبی تاریخ میں نثرِ مرصع کو سرسید کی تحریک کے بعد سادہ گوئی کے مقابلے میں ایسی اچھوت اور حاشیائی چیز کے طور پر قبول کیا گیا کہ اردو زبان کے ارتقا سے اس کا کوئی معکوسی رشتہ ہے۔ تاریخ کا یہ جبر اور مغرب کے ایوانوں سے جلے چراغوں کی لَو اتنی تیز تھی کہ نثرِ مرصع کی اتنی طویل روایت نہ جانے کہاں پوشیدہ رہ گئی تھی؟ ڈاکٹر ممتاز احمد خاں نے اس ڈوبتی ہوئی نبض اور بھولی ہوئی کہانی کو اپنی کتاب کا موضوع بنایا اور کوشش کی کہ جدید و قدیم تمام سرمایۂ ادب سے اس کی مثالیں جمع کی جائیں۔ انھوں نے ایک اور خاص کام اس کتاب میں یہ کیا کہ نثرِ مرصع کے عہدِ جدید کے ادبی نمونوں پر اثرات کے جائزے کو بڑی اہمیت دی۔ اس سے پڑھنے والے آسانی کے ساتھ یہ بات سمجھ جاتے ہیں کہ نثر کی یہ کوئی ایسی روایت نہیں تھی جو معدوم ہوگئی یا وقت نے جسے دریا بُرد کردیا۔ ممتاز احمد خاں نے گفتگو میں اختصار کو رَوا رکھا اور عہدِ جدید تک سے پہلے کے مشہور نثر نگاروں کی تحریروں کو بہ طورِ مثال پیش کر کے اپنے مقدمات پیش کیے۔ دورِ جدید میں کچھ غیر اہم اور قومی حیثیت پر کم معروف افراد کی شمولیت مشاہیرِ ادب کے مقابلے میں مناسب نہیں۔ کاش ممتاز احمد خاں اس سے بچ سکتے۔ اس کتاب کا موضوعاتی دائرۂ کار جتنا بڑا ہے، کتاب میں اس قدر اختصار کی ضرورت نہیں تھی۔ مصنف مزید وضاحت اور ادبی نمونوں کی شمولیت سے اپنی دلیلوں کو زیادہ استحکام بخش سکتا تھا۔

ادب ولسانیات کے موضوعات کے تعلق سے ممتاز احمد خاں خاصے سنجیدہ شغف رکھتے ہیں۔ رشید حسن خاں سے ان کے روابط بھی اس بات کی دلالت کرتے ہیں کہ وہ املا اور زبان کے مسائل کے سب سے بڑے واقف کار سے صلاح و مشورہ لیتے رہے۔ ان کی کتاب میں املا اور لسانی پہلوؤں پر کئی مضامین ہیں۔ یہ موضوعات عمومی نہیں ہیں اور کوئی آدمی سرسری طور پر ان دائروں میں رہ کر علمی تحقیق کا حق ادا نہیں کرسکتا۔ وہ رشید حسن خاں کے نظامِ املا کے واضح خوشہ چیں ہیں اور ان کے علمی مقام و مرتبے کے لیے بھی مضامین لکھتے رہے۔ ان مضامین میں وہ عام ادبی نقاد یا عام تخلیقات کے قدر شناس کے طور پر نہیں بلکہ علم و ادب کے دقیق مسائل پر حوالوں کے ساتھ گفتگو کرنے والے کی حیثیت سے سامنے آتے ہیں۔

'ادب اور ادبی رویہ' کتاب میں ممتاز احمد خاں کا ایک مضمون 'ہمزہ اور املا کی غلطیاں' شامل ہے۔ ہر چند یہ رشید حسن خاں کی کتاب 'اردو املا' کے مباحث کا نچوڑ ہے اور اختصار کے ساتھ پیش کیا ہے مگر پسِ نوشت کے طور پر رشید حسن خاں کی بعض سفارشات سے اختلاف بھی کیا ہے اور یہ بتانے کی کوشش کی ہے کہ کس طرح املا کے مسائل کو اجتماعی شعور کا حصہ بنانا چاہیے۔ 'جوش کی منظری شاعری' کے عنوان سے ممتاز احمد خاں کا جو مضمون ہے، وہ بہت ہی جامع اور غیر جانبدار مانا جانا چاہیے۔ ادبی تنقید کے منصب اور ادب و تنقید کے حوالے سے جو مضامین ہیں، وہ بھی ان کے سنجیدہ علمی توجہ کی مثال کے طور پر قبول کیے جائیں گے۔

'قندیلیں' عنوان سے شخصیات کے حوالے سے ممتاز احمد خاں کی جو کتاب منظرِ عام پر آئی، وہ شخصیات سے متعلق تاثراتی مضامین ہیں۔ 64 لوگوں پر یہ مضامین محیط ہیں۔ ایک بڑی تعداد ایسے لوگوں کی ہے جو اس دارِ فانی سے کوچ کر چکے مگر چند زندہ اشخاص بھی اس جلد میں شامل ہیں۔ اختصار کی وجہ سے کچھ سوانحی ڈکشنری یا تذکرے کا رنگ غالب آگیا ہے۔ کتاب کی اہمیت ذاتی آشنائی کے سبب قائم ہوتی ہے۔ سارے افراد ممتاز احمد خاں کے جانے پہچانے لوگوں میں سے ہیں جن کے بارے میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ مصنف ان کی زندگی اور ان کی جس حد تک علمی، ادبی اور سماجی خدمات ہیں؛ ان سے نجی واقفیت رکھتا ہے۔

ممتاز احمد خاں نے متفرق مضامین کے علاوہ اقبال کی خدمات پر ایک مکمل کتاب بھی لکھی۔ ان کے بعض مضامین بکھری ہوئی حالت میں بھی شاید رہ گئے کیونکہ کورونا کے دوسرے دَور میں وہ مسلسل بیماریوں کی زَد میں رہے اور پھر داعیِ اجل کو انھوں نے لبیک کہا۔ وہ ہماری زبان کے ہوس کار لکھنے والوں میں نہیں تھے۔ عجلت میں لکھا اور چھپا اور رسالے یا پریس تک اپنی تحریروں کو فوراً پہنچادیا، یہ ان کا شیوہ نہیں تھا۔ ٹھہر ٹھہر کر لکھا، یہ الگ بات ہے کہ ادب کے بڑے حصے پر ان کی علمی و تنقیدی آرا چھپ کر سامنے نہ آسکیں۔ وہ مقامی اور بین الاقوامی دونوں موضوعات میں نوعیت کے اعتبار سے جو فرق ہے، اس میں بھی امتیاز کم کرتے تھے جس کے سبب ان کی بعض تحریروں کو ان کے علمی معیار کے باوجود لائقِ اعتنا نہ سمجھا گیا۔ ممتاز احمد خاں نے جتنی چیزیں الگ الگ وقتوں میں پیش کیں، ان کا ایک اچھا انتخاب کیا جائے تو ہماری رائے ہوگی کہ اس کا علمی پایہ بہت سارے زیادہ مشہور نقادوں سے بڑھ کر ہو۔ ہمارے لیے یہ فرض ہے کہ ہم ان کا بہترین اثاثہ قومی سطح پر سامنے لائیں اور لوگوں کو بتائیں کہ حاشیے پر رہنے والا یہ ادیب اپنی سنجیدگی اور علمی توجہ کے سبب اپنے عہد کے نمائندہ لکھنے والوں میں شامل تھا۔

■

Dr. Afshan Bano
C/o Md Aqueel Ahmad, Hosiery Shop,
Subzibagh, Patna-800004
Mob.: 8969072760
afshanid12@gmail.com

جعدیہ اسجد

سعید الظفر چغتائی

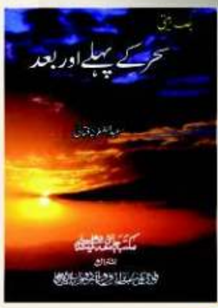

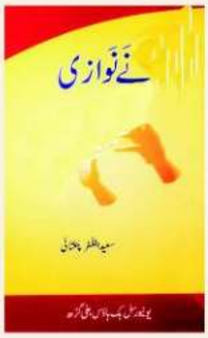

آگے پیچھے سبھی روانہ ہوئے
بے نیازانِ آب و دانہ ہوئے

اس شعر کے منظرِ عام پر آنے کے چند مہینوں بعد اس کے خالق پروفیسر سعید الظفر چغتائی بھی اس دارِفانی سے روانہ ہوگئے۔ان کی رحلت کی خبر صرف سائنس کی دنیا ہی نہیں بلکہ اردو دان طبقے کے لیے بھی بہت دل سوز اور غم انگیز تھی۔ 17 نومبر 2022 جمعرات کی سہ پہر 3 بج کر 54 منٹ[1] پر موت کے فرشتے نے ان کی روح کو قبض کیا اور مالک حقیقی کے پاس پہنچادیا۔ انسان تو فانی ہے لیکن اس کے کارنامے اسے لافانی بنادیتے ہیں۔انھوں نے ادب اور سائنس کے میدان میں جو غیر معمولی خدمات انجام دیں وہ انھیں حیات جاوداں عطا کرنے کے لیے کافی ہیں۔ پروفیسر سعید الظفر چغتائی نے تقریباً 86 برس کی طویل عمر پائی۔ زندگی کے آخری ایام میں وہ علالت کے سبب سات سال بستر پر رہے۔ وہ بہت کمزور اور چلنے پھرنے سے معذور ہوگئے تھے۔لیکن ان کا زرخیز اور قوی قلم کبھی نہیں تھکا۔اس کی سب سے بڑی دلیل یہ ہے کہ ''تاثرات'' کے نام سے ان کا آخری مجموعہ حال ہی میں منظر عام پر آیا۔ Bed sick ہونے سے قبل وہ walker سے چلنے کی کوشش کرتے تھے۔اور تقریباً ایک برس تک چلنے کے لیے انھوں نے walker کی مدد لی۔ایک دفعہ پھسلنے کی وجہ سے وہ گر پڑے۔[2] اس کے بعد وہ ہمت ہار گئے، چلنا پھرنا چھوڑ دیا۔اور بیڈ پر ہی رہنے کا فیصلہ کرلیا۔ تقریباً 5-6 برس ان کی Physiotherapy بھی ہوئی۔[3]

سعید الظفر چغتائی کی بیوی نے راقمہ کو بتایا کہ انتقال سے ایک مہینے قبل چغتائی صاحب کو نمونیہ ہوگیا تھا جس کے سبب ان کے پھیپھڑے خراب ہوگئے تھے۔ انتقال کے 12 دن پہلے سے ہی ان کی آواز نکلنا بھی بند ہوگئی تھی۔ایسی سخت علالت کے دوران بھی ان کا ذہن و دل کام کررہا تھا۔[4] وہ باتوں کو سمجھ لیتے تھے مگر بول نہیں پاتے تھے۔انتقال تو 17 نومبر کو ہوا لیکن ان کی تدفین 18 نومبر کو بعد نماز جمعہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے 'منٹوئی' قبرستان میں ان کے والد مرزا محمد ناظر بیگ چغتائی مرحوم کے بغل میں ہوئی۔

> سعید الظفر چغتائی ایک مھذب، باعزت اور تعلیم یافتہ خاندان کے چشم و چراغ تھے. ان کا تعلق مغل خاندان سے ہے. ان کے خاندان کے نام پر ہی ان کا محلہ 'مغلان' کے نام سے جانا جاتا ہے.[5] پروفیسر سعید الظفر چغتائی نے ہائی اسکول کی تعلیم فیض آباد سے اور انٹرمیڈیٹ کی تعلیم کرسچین کالج لکھنؤ سے حاصل کی.اس کے بعد بی ایس سی اور ایم ایس سی کی ڈگری لکھنؤ یونیورسٹی سے حاصل کی.

پروفیسر سعید الظفر چغتائی کی شخصیت کسی تعارف کی محتاج نہیں۔ وہ ایک بلند پایہ شاعر، نثر نگار، مترجم اور نقاد کی حیثیت سے جانے جاتے ہیں۔سعید الظفر چغتائی کی ولادت بارہ بنکی ضلع کے ایک قصبہ دریاباد میں 1936 بمطابق 1355ھ میں ہوئی۔ ان کا نام سعید الظفر بھی تاریخی ہے جس سے 1355ھ برآمد ہوتا ہے۔ان کے والد کا نام مرزا محمد ناظر بیگ چغتائی اور والدہ کا رابعہ بیگ تھا۔سعید الظفر چغتائی ایک مہذب، باعزت اور تعلیم یافتہ خاندان کے چشم و چراغ تھے۔ ان کا تعلق مغل خاندان سے ہے۔ ان کے خاندان کے نام پر ہی ان کا محلّہ 'مغلان' کے نام سے جانا جاتا ہے۔[5] پروفیسر سعید الظفر چغتائی نے ہائی اسکول کی تعلیم فیض آباد سے اور انٹرمیڈیٹ کی تعلیم کرسچین کالج لکھنؤ سے حاصل کی۔اس کے بعد بی ایس سی اور ایم ایس سی کی ڈگری لکھنؤ یونیورسٹی سے حاصل کی۔ان کی شادی 1961 میں عصمت آرا بیگم سے ہوئی۔[6] شادی کے چند مہینے بعد گورکھپور یونیورسٹی میں Assistant Professor کے عہدے پر تقریباً ڈیڑھ سال کام کیا۔اعلیٰ تعلیم کے مزید حصول کے لیے وہ پہلے فرانس پھر سویڈن چلے گئے۔سویڈن کی لند یونیورسٹی سے

انھوں نے ڈی۔ایس۔سی کی ڈگری حاصل کی۔

1969 میں علی گڑھ آمد ہوئی اور مسلم یونیورسٹی کے فزکس ڈپارٹمنٹ میں پروفیسر کے عہدے پر فائز ہوئے۔ یہاں درس و تدریس کی خدمات انجام دیتے ہوئے 1998 میں سبکدوش ہوئے۔درس و تدریس کے ساتھ سائنسی تحقیق میں بھی ان کی خدمات غیر معمولی ہیں۔ حصول علم کا ایسا جذبہ تھا کہ دورانِ ملازمت بھی تعلیم و تحقیق کا سلسلہ جاری رہا۔انھوں نے 1982 میں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے پی۔ایچ۔ڈی کی ڈگری حاصل کی۔

پروفیسر سعید الظفر چغتائی کی تین اولادیں ہیں اور تینوں ہی اس وقت امریکہ میں مقیم ہیں۔ان کی سب سے بڑی بیٹی ثریا ظفر چغتائی ہیں۔جن کی عمر 59 برس ہے۔وہ Philadelphia میں اپنے شوہر اور بچوں کے ساتھ رہتی ہیں، جو امریکہ کے Pennsylvania کا سب سے بڑا شہر ہے۔ چغتائی صاحب کے بیٹے کا نام اسعد المظفر چغتائی ہے یہ بھی Philadelphia میں ہی مقیم ہیں۔اسعد المظفر نے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں کیمیکل انجینئرنگ کی تعلیم حاصل کی۔اس کے بعد امریکہ سے اِنوائرمینٹل انجینئرنگ کرنے کے بعد وہیں پر ملازمت اختیار کرلی۔ ’سعدیہ ایلی نور چغتائی‘ ان کی سب سے چھوٹی بیٹی ہیں یہ بھی اپنے بچوں اور شوہر کے ساتھ امریکہ کے بوسٹن شہر میں رہتی ہیں۔پروفیسر سعید الظفر چغتائی کے کل دو نواسے اور تین نواسیاں ہیں۔ان کے بیٹے اسعد المظفر لاولد ہیں۔

چغتائی صاحب سائنس کے آدمی ہیں، لیکن اردو ادب میں بھی ان کے غیر معمولی کارناموں کو فراموش نہیں کیا جاسکتا۔ان کے چار شعری مجموعے منظر عام پر آچکے ہیں۔ان کا پہلا مجموعہ ’جنوں زار‘ ان کے والد نے 1965 میں ’صدیق بک ڈپو‘ لکھنؤ سے شائع کروایا۔[7] اس وقت سعید الظفر چغتائی فرانس میں زیر تعلیم تھے۔’جنوں زار‘ میں 32 نظمیں، 15 غزلیں اور چند قطعات شامل ہیں۔ دوسرا مجموعہ ’نغماتِ زندگی‘ 1997 میں شائع ہوا۔اس میں 38 نظمیں اور 25 غزلیں ہیں۔ جو علی گڑھ کے دوران ملازمت تخلیق کی گئیں۔ تیسرا مجموعہ ’نے نوازی‘ ہے، جو 2013 میں منظر عام پر آیا۔ اس میں 18 نظمیں 72 رباعیاں اور 26 غزلیں ہیں۔ چغتائی صاحب کا آخری مجموعہ ’تاثرات‘ ہے جو ابھی حال ہی میں زیور طبع سے آراستہ ہوا۔اس میں 20 نظمیں اور 4 غزلیں ہیں۔اس مجموعے میں 2002 سے 2014 تک کی تخلیقات یکجا ہیں۔انھوں نے اپنے پہلے، تیسرے اور آخری مجموعے میں یہ اہتمام کیا ہے کہ غزلوں اور نظموں وغیرہ پر تاریخ درج کر دی ہے۔اور تشریح طلب الفاظ پر مختصر حاشیہ بھی رقم کر دیا ہے۔ بقول ثریا ظفر اس مجموعے کے متعلق چغتائی صاحب کا خیال تھا کہ اس میں کچھ نئے طرز کے اور بہت اہم مضمون ہیں۔اس مجموعے میں انھوں نے نئے طرح کی شاعری کی ہے۔ جو یقیناً پسند کی جائے گی۔ اس مجموعے کی اشاعت شاید چند برس قبل عمل میں آتی لیکن کچھ سال پہلے پورا مسودا گھر میں ہی کہیں کھو گیا تھا۔ انھوں نے اپنی بیوی کو ان گم شدہ صفحات کی تفصیل بتائی اور کئی دفعہ اسے گھر میں تلاش بھی کروایا۔ 2021 میں غالباً

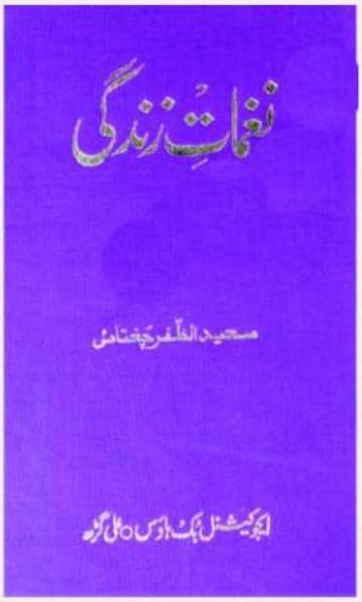

اگست کے مہینے میں یہ فائل ان کی چھوٹی بیٹی کو اسی کمرے کی ایک الماری میں ملی جہاں وہ رہتے تھے۔تاثرات میں موجود تمام نظمیں آزاد نظم کی ہئیت میں لکھی گئی ہیں۔ سوائے ایک نظم کے جس کا عنوان ہے ’سال وفات‘۔

شاعری کے علاوہ نثر میں ان کا ایک بہت اہم کارنامہ علامہ اقبال کی ’بالِ جبریل‘ کا فرانسیسی زبان میں ترجمہ ہے۔ جو L, Aile de Gabriel کے نام سے 1977 میں اقبال کے صد سالہ یوم پیدائش کے موقع پر شائع ہوا۔مشہور عالم ڈاکٹر محمد حمید اللہ نے اس کتاب کی اشاعت میں چغتائی صاحب کی بہت رہنمائی کی۔سعید الظفر چغتائی ’اکابر کے خطوط‘ کے مقدمے میں اس بات کا اظہار یوں کرتے ہیں:

’’انھوں نے (ڈاکٹر محمد حمید اللہ) فرانسیسی زبان میں بال جبریل کا ہمارا ترجمہ دیکھا،اس کی اصلاح فرمائی، اس پر اضافے کیے اس کی اشاعت میں بڑی مدد کی۔‘‘[8]

پروفیسر چغتائی کی کتابوں میں ’فیض کا سرمایۂ سخن‘، ’سحر کے پہلے اور بعد‘ اور ’اکابر کے خطوط‘ بھی بہت اہم ہیں۔’اکابر کے خطوط میں‘ وہ تمام خطوط یکجا کیے گئے ہیں جو مختلف اہل علم نے پروفیسر سعید الظفر چغتائی کے نام تحریر کیے ہیں۔ان خطوط کی تعداد 103 ہے جن کو لکھنے والے افراد 23 ہیں۔جن شخصیتوں نے انھیں خط لکھے ان میں ڈاکٹر محمد حمید اللہ، پروفیسر آل احمد سرور، شمیم حنفی، پروفیسر عبدالسلام، ڈاکٹر ذاکر حسین، پروفیسر رشید احمد صدیقی، پروفیسر احتشام حسین، مولانا عبدالماجد دریابادی، پروفیسر محمود الٰہی، پروفیسر نورالحسن ہاشمی، فراق گورکھپوری اور مولانا عبدالباری ندوی وغیرہ کے نام اہم ہیں۔سعید الظفر چغتائی نے ’ژاں پال سارتر‘ کے فرانسیسی زبان میں لکھے ہوئے ڈراما Les Jeux Sant Faits کا ترجمہ ’کھیل تمام ہوئے‘ کے نام سے 1996 میں اردو میں کیا۔ درج بالا کتابوں کے علاوہ مختلف رسائل جیسے ’قومی آواز میگزین (لکھنؤ، دہلی)‘ فروغ ادب (لکھنؤ) قومی زبان (علی گڑھ)، تہذیب الاخلاق (علی گڑھ)، فکر و نظر (علی گڑھ)، نقد و نظر (علی گڑھ)، شعر و حکمت (حیدرآباد)، آج کل (دہلی)، اردو ادب (دہلی) اور جامعہ (دہلی) وغیرہ میں ان کے متعدد مضامین وقتاً فوقتاً شائع ہوتے رہے۔ یہ مضامین اردو ادب، سائنس اور حالات حاضرہ سے متعلق ہیں۔

پروفیسر سعید الظفر چغتائی کو اردو کا ماحول ان کے گھر سے ہی ملا۔کم عمری میں ہی جب وہ ہائی اسکول کے طالب علم تھے[9] شعر کہنا شروع کر دیا۔لیکن باقاعدہ شاعری کا آغاز 1960 سے ہوا۔[10] سعید الظفر چغتائی نے خود راقمہ کو بتایا کہ ابتدا میں وہ فیض آباد کے اپنے استاد مولوی نور محمد سے اپنی شاعری پر اصلاح لیتے تھے۔مولوی نور محمد نے چغتائی صاحب کو عربی، اردو، فارسی اور علم عروض کی تعلیم بھی دی تھی۔ چغتائی صاحب نے شاعری میں باقاعدہ کسی کی تقلید نہیں کی اور نہ ہی اپنے زمانے میں زور و شور سے چلنے والی تحریکات و رجحانات کا حصہ بنے۔ البتہ ان کی شاعری کے مطالعے سے اس بات کا اندازہ ضرور ہو جاتا ہے کہ انھوں نے شعوری یا لاشعوری طور پر اکابر شعرا کے اثرات ضرور قبول کیے ہیں۔شاعری میں ان کا اپنا ایک الگ طرز اور انداز ہے۔چغتائی صاحب نے اشعار کی زمین، موضوعات اور کبھی کبھی الفاظ بھی اساتذہ شعرا کے استعمال کیے ہیں۔

چند مثالیں درج ذیل ہیں ؎

ڈوبتی ہیں کشتیاں گر جو بہ جو
حوصلے بھی ہیں ابھرتے یم بہ یم

(سعید الظفر چغتائی)

خضر بھی بے دست و پا الیاس بھی بے دست و پا
میرے طوفاں یم بہ یم دریا بہ دریا جو بہ جو
(علامہ اقبال)

چغتائی صاحب کی درج ذیل نظم کا یہ حصہ پڑھ کر بے ساختہ فیض احمد فیض کی شاہکار نظم 'تنہائی' کی یاد آجاتی ہے۔

ہر گھڑی کیا روشنی ہی روشنی
گاہے گاہے ڈھونڈتا ہوں تیرگی
گل کرو شمعیں، بجھادو سب چراغ!
توڑ ڈالو سارے میناوایاغ!
بند کردو کھڑکیاں، محراب، در!
سب دریچے، سارے روزن سربسر!!
ڈال دو تم ان پہ پردے نو بہ نو!
تا نہ داخل ہو سکے کوئی بھی ضَو!
لیکن اب بھی تھوڑی تھوڑی روشنی
ہے دریچوں سے برابر چھن رہی
جا کے باہر گل کرو ہر روشنی
دور تک ہو تیرگی ہی تیرگی!
اب میں آنکھیں بھی کیے لیتا ہوں بند
باندھ دو تم پٹیاں بھی ان پہ چند
بھیڑ دو پٹ ذہن کے، ادراک کے!
قلب کے، اندیشۂ چالاک کے!!
(نظم روشنی اور نظر: سعید الظفر چغتائی)

پھر کوئی آیا دل زار نہیں کوئی نہیں
راہرو ہوگا کہیں اور چلا جائے گا
ڈھل چکی رات بکھرنے لگا تاروں کا غبار
لڑکھڑانے لگے ایوانوں میں خوابیدہ چراغ
سوگئی راستہ تک تک کے ہر اک راہ گزار
اجنبی خاک نے دھندلا دیے قدموں کے سراغ
گل کرو شمعیں بڑھا دو مے و مینا و آیاغ
اپنے بے خواب کواڑوں کو مقفل کر لو
اب یہاں کوئی نہیں کوئی نہیں آئے گا
(نظم: تنہائی، فیض احمد فیض)

سعید الظفر چغتائی خاص طور سے علامہ اقبال کے بہت بڑے مداح تھے۔ انھوں نے اقبال سے متعلق متعدد مضامین بھی لکھے جو مختلف رسائل کی زینت بنے۔ انھوں نے اقبال سے متعلق اپنی پسندیدگی کا اظہار دسمبر 2021 میں خود راقمہ سے بھی کیا تھا۔ چغتائی صاحب کی بیوی بیان کرتی ہیں:

''انتقال کے تقریباً ایک مہینہ پہلے وہ مجھ سے بولے کہ 'علامہ اقبال کی 'پیام مشرق' اوپر الماری میں ہے' لا کے دے دیں۔ میں گئی اور دیکھا کہ وہ کتاب بہت پرانی اور خستہ حال تھی۔ میں نے انھیں یہ کتاب دینا مناسب نہیں سمجھا کیوں کہ انھیں سانس کی پریشانی تھی پھر میں نے اپنے بھتیجے سے اس نام کی نئی کتاب منگوائی اور انھیں دے دی۔''[11]

علامہ اقبال کے علاوہ پروفیسر چغتائی مرزا غالب کے کلام بھی پڑھا کرتے تھے۔ خاص طور پر عمر کے آخری ایام میں وہ کلام غالب کی جانب خصوصی توجہ دینے لگے۔ بقول ثریا ظفر چغتائی پچھلے دو تین سال میں جب وہ علی گڑھ آئیں تو ان کے والد نے انھیں خود بتایا کہ اب میں زیادہ تر غالب کی شاعری پڑھتا ہوں۔ غالب کا ایک دیوان ہمیشہ ان کے سرہانے پڑا ہوتا تھا۔ جسے وہ بار بار پڑھتے تھے۔ انھوں نے کچھ اشعار منتخب کیے تھے۔ اور مزید نئے اشعار یاد بھی کیے تھے۔ غالب کے اشعار سے چغتائی صاحب کو اپنی بیماری اور مایوسی بھری زندگی سے بہت مشابہت نظر آئی۔ ان کا خیال تھا کہ غالب کے یہ اشعار ان کی کیفیات کی ترجمانی کرتے ہیں۔[12]

سعید الظفر چغتائی کی زبان کا اہم وصف، سادگی اور سلاست ہے۔ سہل ممتنع کی مثال بھی جا بہ جا نظر آتی ہے۔ عوام میں رائج محاوروں اور کہاوتوں کا استعمال بھی اپنی شاعری میں بہت فنکاری کے ساتھ کرتے ہیں۔ موزوں اور مناسب الفاظ کے فنکارانہ استعمال میں وہ اپنی مثال آپ ہیں۔ ان کے کلام میں جدّت پسندی کے ساتھ کلاسکیت کی بھی حسین آمیزش نظر آتی ہے۔ چغتائی صاحب کے کلام میں مایوسی اور قنوطیت کے بجائے رجائیت اور امید کا پہلو غالب ہے۔ وہ زندگی کی تاریک راتوں سے گھبرانے کے بجائے خوشنما اور خوشگوار سحر کے منتظر نظر آتے ہیں۔ ذیل میں ان کی غزلوں کے چند اشعار پیش کیے جا رہے ہیں جن سے ان کی شعری خوبیوں کا اندازہ ہو جائے گا۔

اب تک نہ ادا ہو سکا ایک سانس کا بھی حق
ہم عشق کے آغاز کو انجام کہیں گے
صحرا میں ذرہ قطرہ سمندر میں جا ملا
میں خاک میں ملا تو ملا تجھ کو کیا ملا
فریب وعدۂ فراد بھی اب نہیں باقی
نیا فریب کوئی دے کہ اعتبار کروں
جب سہارا آخری ٹوٹا تو ہمت جاگ اٹھی
بجھ گئے شمس و قمر اپنا مکاں روشن ہوا
زندگی اپنی مفت میں نذرِ اجل نہیں ہوئی
تم سے پہیلی کہہ تو دی مجھ سے جو حل نہیں ہوئی
زندگی اپنی تگ و دَو میں گذاری ہم نے
اور ابھی تک تو نہ دی مان کے ہاری ہم نے

سعید الظفر چغتائی کی شاعری میں عالمی مسائل پر بھی اظہار خیال ملتا ہے۔ ان کی شاعری میں سیاسی مسائل کی بھی کثرت نظر آتی ہے کیونکہ ان کا زمانہ وہی زمانہ تھا جب دنیا میں سیاسی، سماجی، تہذیبی، اقتصادی اور معاشرتی اتھل پتھل اپنے عروج پر تھی۔ سعید الظفر چغتائی نے خود لکھا ہے:

''میں نے ہوش سنبھالا تو دوسری عالمی جنگ کی جوانی ڈھلنے لگی تھی۔ اور ابا جان اخباری خبریں جغرافیائی نقشوں پہ سمجھاتے رہتے تھے..... مگر لکھنے بیٹھا تو سلسلۂ سخن دراز ہوتا گیا اور ذہنی صحرا نوردی کی میعاد 100 سال کے لگ بھگ ہوگئی۔''[13]

سعید الظفر چغتائی کی اکثر نظموں اور غزلوں کے اشعار ایسے ہیں جن کا ماخذ تاریخی اور مذہبی واقعات ہیں۔ ان واقعات سے مواد اخذ کر کے وہ جدید دور کے واقعات اور مسائل کے تناظر میں اس طرح پیوست کر دیتے ہیں کہ وہ آج کے انسان کی روداد معلوم ہونے لگتی ہے۔ دیگر صنعتوں کے ساتھ وہ صنعت تلمیح کا استعمال بھی بڑی فنکاری کے ساتھ کرتے ہیں۔ چغتائی صاحب نے نظمیں کثرت سے لکھی ہیں جن میں روشنی اور نظر، مکھیاں، ملک آشوب، خوداحتسابی، خون کا رشتہ، کھجراہو، روشنی آتی ہے، بتانِ آزری، استامبول، ملکہ نور جہاں اور تاج محل وغیرہ خصوصیت سے قابل ذکر ہیں۔ ان کی شاعری خصوصاً نظموں میں طنزیہ عناصر کی بھی کارفرمائی نظر آتی ہے۔ ان کی نظم 'کیوں' کا ایک ٹکڑا ملاحظہ ہو۔

اے خدا، پھر سے ہمیں جہل کی دولت دے دے!
تو نے کیوں علم دیا اور جہالت چھینی؟
تو نے کیوں جنّت حمقا سے نکالا ہم کو؟
ذہن کو کس لیے ہونے دیا بالغ تو نے
آستینوں میں مرے پل کے سنپولے کی طرح
ڈس لیے جس نے مرے سارے ہی اوہام کہن؟

چغتائی صاحب اپنی نظموں میں مناظر فطرت کی بھی بڑی خوش اسلوبی کے ساتھ عکاسی کرتے ہیں۔ وہ مناظرِ فطرت کا ایسا نقشہ کھینچتے ہیں کہ قاری حظ اٹھانے کے ساتھ اشعار کے معنی کی تہوں میں کھو جاتا ہے۔ تشبیہات، استعارات اور علائم کی مدد سے بڑی علم و حکمت والی باتیں کہہ جاتے ہیں۔ وہ اپنے تازہ مجموعہ 'تاثرات' میں شامل نظم 'انگور کی بیلیں' میں لکھتے ہیں۔

پھر اک موسم میں خوشے/ ڈالی ڈالی یوں لٹکتے ہیں
کہ سعدی برملا/ 'عقد ثریا' ان کو کہتے تھے
ہرے محفوظ پیالوں میں/ بھرا مشروب یزدانی

نشاں دیتا ہے جو/حوروں کے جھرمٹ کا
جواپنی سبز پوشاکوں میں/گیتی پراترتی ہیں

پروفیسر سعید الظفر چغتائی ایک کامیاب شاعر اور ادیب ہونے کے ساتھ ہی ایک بے حد مخلص انسان، شفیق استاد، سخاوت، حسن اخلاق اور دریا دلی جیسے اوصاف سے مزین شخصیت کے مالک تھے۔ وہ ایک نہایت سلجھے ہوئے اور باوقار انسان تھے۔ان کی شخصیت کا باطنی پہلو تو روشن ہے ہی ان کا ظاہر بھی اللہ نے بہت خوبصورت بنایا۔ دراز قد، تیکھے نقوش، بولتی ہوئی آنکھیں اور بے حد نکھری ہوئی گلابی مائل رنگت کے ساتھ پہلی نظر میں ہی سامنے والے کو متاثر کرنے کی تمام صلاحیتیں ان میں موجود تھیں۔ان کے وسیع علم کا نور متانت اور سنجیدگی کے ساتھ ان کے چہرے سے جھلکتا تھا۔ انسانیت نوازی اور انسان دوستی ان کی شخصیت کا لازمی جزو تھا۔ چغتائی صاحب کے خیالات بھی بہت بلند تھے۔ جس کا اندازہ ان کی تحریروں سے بخوبی ہو جاتا ہے۔اپنے دوسرے شعری مجموعے 'نغمات زندگی' کے پیش لفظ میں یوں رقم طرز ہیں:

''زندگی جتنی بڑی نعمت ہے بعض اوقات اتنا ہی بڑا المیہ بن جاتی ہے اور اس میں فطرت کی اندھی طاقتوں کا ہاتھ اب بہت کم ہوتا ہے، خود ہمارا بہت زیادہ۔ جب تک ہم خود کو سب سے پہلے انسان نہ سمجھنے لگیں گے اور خود آگے بڑھ کر دوسرے کے ساتھ وہ سلوک نہ کرنے لگیں گے جو ہم اپنے لیے دوسرے سے چاہتے ہیں، حالات بہتر نہ ہوں گے۔

مجھے ادیب، شاعر، سائنس داں، مفکر، معلّم، مصلح، منتظم یا نیکو کار ہونے کا دعوا کبھی نہیں رہا ہے۔ اس مختصر زندگی میں، فطرت کی بخشی ہر آزادی اور اختیار کے باوجود زیادہ تر ناکارہ اور مجبور رہا ہوں۔ مگر خواہش ہمیشہ یہ دامن گیر رہی کہ خموشی کے ساتھ گمنامی میں کسی کے لیے کوئی بھلائی کر جاؤں یا کوئی ایسی بات کہہ یا لکھ جاؤں جس سے کسی دردمند کو ایک لمحہ ڈھارس بندھے، محسوس ہو کہ زندگی حسین ہے۔''[14]

مذکورہ اقتباس میں چغتائی صاحب زندگی کے متعلق فلسفیانہ گفتگو کرتے ہوئے۔انسان کی اخلاقی ذمے داری پر بھی روشنی ڈالتے ہیں غیر معمولی شخصیت کے حامل ہونے کے باوجود وہ بڑی عاجزی کے ساتھ اپنی کوتاہیوں کی جانب اشارہ کرتے ہوئے بنی نوع انسان کے لیے اپنی نیک خواہشات کا اظہار کرتے ہیں۔ چغتائی صاحب لکھتے ہیں:

''ہماری دنیا میں فتنہ وفساد کے بڑے سبب دو ہیں: حرص وحسد اور تعصب، جس کا مفہوم میں سمجھتا ہوں کہ ہم خود کو سب سے پہلے انسان نہیں مانتے۔

شیخ سعدی نے ایک جہاں دیدہ بزرگ کی حیثیت سے جو نصیحتیں خواص وعوام کے لیے درج کردی ہیں ان کی افادیت ہم جیسوں کے لیے آج بھی ہے اور 656ھ (مطابق 1258) سے آج تک نہ جانے کتنوں کا ان سے بھلا ہوا ہے۔ انسان جو کہے، پہلے اس پر خود عمل کر چکا ہو تو کیا کہنا، مگر ایسا نہیں ہے تب بھی اچھی بات نہ کہنا اچھا نہیں ہے 'دیکھو کیا کہا اور نہ دیکھو کس نے کہا' سنہرا اصول ہے۔''[15]

یہاں پر چغتائی صاحب نے انسان کے منفی جذبات کو فتنہ وفساد کا سبب بتاتے ہوئے انسانی خامیوں کی طرف اشارہ کیا ہے اور شیخ سعدی کے حوالے سے زندگی کے سنہرے اصول قلم بند کیے ہیں۔ وہ ایک بہت ہی نیک اور دردمند انسان تھے جو اپنے تمام شاگردوں کا بہت خیال رکھتے تھے۔ان کی ہر ممکن مدد کرنے کی کوشش کیا کرتے تھے۔اپنے تحقیقی مقالے کے متعلق راقمہ نے دسمبر 2021 میں چغتائی صاحب سے ملاقات کی اور چند سوالات کیے۔ باوجود اس کے کہ وہ بہت ہی کمزور تھے اور بستر پر لیٹے ہوئے تھے۔ ایک لڑکے نے انھیں سہارا دے کر اٹھایا اور تکیے سے ٹیک لگا کر دیوار کے سہارے بیٹھا دیا۔ ان کی آواز صاف نہیں نکل پا رہی تھی۔ اس کے باوجود انھوں نے ہر سوال کا جواب تفصیل سے دینے کی کوشش کی۔ کافی دیر تک وہ بیٹھے رہے۔ چغتائی صاحب بولتے بولتے ہانپنے لگتے تھے۔ چند سکنڈ ستانے کے بعد وہ دوبارہ بولنے کی کوشش کرتے آواز صاف نہ ہونے کے سبب اسے سمجھنے میں بھی دشواری ہو رہی تھی۔ علم سے محبت اور اس کو فروغ دینے کا ایسا جوش اور ولولہ ان کے اندر موجود تھا جو بستر مرگ پر بھی کم نہ ہوا۔

سعید الظفر چغتائی ایک بہت اچھے مہمان نواز بھی تھے۔ جب ان سے کوئی ملنے آتا تو وہ بہت خوش ہو جاتے۔ چغتائی صاحب کے حسن اخلاق اور عمدہ مہمان نوازی کے متعلق پروفیسر سید سراج الدین اجملی تقریباً دس گیارہ برس قبل کے ایک واقعے کو اس طرح بیان کرتے ہیں:

''پروفیسر سعید الظفر چغتائی نے ایک مرتبہ اپنے یہاں ایک شعری نشست کا انعقاد کیا۔ اس پروگرام میں میرے علاوہ مہتاب حیدر نقوی، ناصر شکیب، عابد علی عابد، زویا زیدی اور دیگر اہم شخصیات بھی موجود تھیں۔ اس نشست میں چغتائی صاحب نے بہت عمدہ ضیافت کی۔ مختلف قسم کے پکوان جیسے پوری سبزی، کباب اور شیرینی وغیرہ کا انتظام کیا۔ سعید الظفر چغتائی اور ہم سب نے خوب شعر سنائے۔ بہت اچھی محفل بجی۔ اس کے بعد انھوں نے جو شکریے کی تقریر کی تو اس میں سب کا شکریہ ادا کرنے کے بعد گویا ہوئے کہ میں چاہتے ہوئے بھی آپ لوگوں کی کوئی خدمت نہیں کر سکا۔ آپ لوگوں کی کوئی خاطر بھی نہیں کی۔ مجھے معاف کر دیجیے گا۔ اتنا کہتے ہوئے وہ رونے لگے۔ ہمیں بہت شرمندگی ہوئی کہ اتنے بڑے آدمی جنھوں نے ہمیں اتنی محبت سے بلایا، اتنی خاطر کی، اتنا کھلایا پلایا اور اس کے بعد اب رو رہے ہیں۔ وہ بہت مخلص اور Devoted قسم کے ادیب تھے۔ اللہ ان کی مغفرت کرے۔''[16]

حواشی

1 راقمہ کے ذریعے عصمت آرا چغتائی سے لیے گئے انٹرویو سے ماخوذ۔ بتاریخ 22/11/23 وقت شام 4:30، بمقام سعید الظفر چغتائی کے گھر، کبیر کالونی علی گڑھ۔
2 ایضاً
3 ایضاً
4 راقمہ کے ذریعے سعید الظفر چغتائی کی بیٹی ثریا چغتائی سے لیے گئے انٹرویو سے ماخوذ۔ بتاریخ 22/11/23، وقت شام 5:30، بمقام۔ سعید الظفر چغتائی صاحب کے گھر، کبیر کالونی علی گڑھ۔
5 راقمہ کے ذریعے عصمت آرا چغتائی سے لیے گئے انٹرویو سے ماخوذ۔ بتاریخ 26/12/21، وقت شام 4:00، بمقام، سعید الظفر چغتائی کے گھر، کبیر کالونی علی گڑھ۔
6 ایضاً
7 ماخوذ از 'دیباچہ' 'نغمات زندگی' سعید الظفر چغتائی، ص7
8 مقدمہ 'اکابر کے خطوط' پروفیسر سعید الظفر چغتائی، ص9
9 راقمہ کے ذریعے پروفیسر سعید الظفر چغتائی سے لیے گئے انٹرویو کے مطابق، بتاریخ 21/12/23، وقت شام 5:30، بمقام، پروفیسر سعید الظفر چغتائی کے گھر، کبیر کالونی علی گڑھ۔
10 ایضاً
11 راقمہ کے ذریعے عصمت آرا چغتائی سے لیے گئے انٹرویو سے ماخوذ، بتاریخ 22/11/23، وقت شام 4:30، بمقام، پروفیسر سعید الظفر چغتائی کے گھر، کبیر کالونی علی گڑھ۔
12 ایضاً
13 پیش لفظ، 'سحر کے پہلے اور بعد' سعید الظفر چغتائی، ص5
14 دیباچہ، 'نغمات زندگی' سعید الظفر چغتائی، ص9
15 دیباچہ، 'نے نوازی' پروفیسر سعید الظفر چغتائی، ص7
16 راقمہ کے ذریعے پروفیسر سراج الدین اجملی سے لیے گئے انٹرویو سے ماخوذ۔ بتاریخ 22/12/17، بوقت 12:00 بجے، بمقام ان کے چیمبر (شعبہ اردو علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ)

■

Jadia Asjad
Research Scholar, Dept of Urdu
Aligarh Muslim University
Aligarh- 202001 (UP)

محمد توحید خان

اختری بیگم

مرزا رسوا کے ناول 'اختری بیگم' کے نسوانی کردار

اختری بیگم ایک ایسا ناول ہے جس میں مرزا ہادی رسوا نے اختری بیگم کی مثالی شخصیت کے پردے میں لکھنؤ کے نوابوں کی زبوں حالی اور جعل سازوں کی جعل سازی کو بہت خوبصورتی سے بیان کیا ہے۔ 1857 کے بعد جو لکھنؤ کا زوال آمادہ سماج تھا اس میں نوابوں کی بدحالی قابل رحم تھی۔ وہ اندر سے کھوکھلے ہو چکے تھے لیکن ظاہر داری اور نوابی فکر ان کا پیچھا نہیں چھوڑ رہی تھی۔ مرزا رسوا چونکہ لکھنؤ کے تہذیبی و ثقافتی معاملات اور سماجی، سیاسی، اور معاشی حالات کا گہرا شعور رکھتے تھے اس لیے ان کے تقریبا تمام ناولوں میں لکھنؤ اپنی گوناگوں صفات کے ساتھ نہ صرف موجود ہے بلکہ وہ لکھنوی تہذیب و ثقافت کا مرقع ہیں۔

یوں تو مرزا رسوا نے متعدد ناول لکھے تاہم امراؤ جان ادا کو جو شہرت و مقبولیت ملی وہ کسی اور ناول کے حصے میں نہیں آئی۔ ظاہر ہے افکار و کردار اور موضوع و مواد کو جس کمال ہنرمندی سے امراؤ جان ادا میں پیش کیا گیا ہے وہ کسی اور ناول میں نظر نہیں آتا۔ لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ ان کے دیگر ناول کسی لائق نہیں۔ البتہ فنی لحاظ سے ان میں کچھ خامیاں ضرور ہیں جو انھیں بلندی تک پہنچنے سے روکتی ہیں۔

مرزا رسوا کے یہاں موضوعات کا کوئی خاص تنوع نہیں ہے۔ وہی لکھنؤ کا زوال پذیر معاشرہ اور بد حال نواب ہے جس میں عیش و مستی اور جعل سازی ہے اور دم توڑتے اقدار کی کہانی ہے۔ البتہ پیش کش کا انداز ہر ایک میں منفرد ہے۔ خواہ وہ امراؤ جان ادا ہو، شریف زادہ ہو، ذات شریف ہو یا اختری بیگم۔ دوسری بات یہ کہ مرزا رسوا کو کردار نگاری میں کمال حاصل تھا۔ وہ بڑے عالم و فاضل اور نفسیات کے ماہر تھے اس لیے انھیں کرداروں کی کیفیات اور نفسیات کا بخوبی علم تھا۔ یہی وجہ ہے کہ جس طرح حقیقی زندگی میں انسانی طبائع مختلف ہیں اسی طرح ان کے ناولوں کے کردار بھی جدا جدا خصلتوں کے حامل ہیں نیز ان میں فطری پن بدرجہ اتم موجود ہے۔ مرزا رسوا نے اپنے ناولوں میں معاشرے کی حقیقی تصویر کشی کی ہے۔ ان کا ماننا ہے کہ ''کسی قصہ کو دل چسپ بنانے کے لیے اصل حقیقت سے دور ہو جانا ایک ایسی غلطی ہے جس سے لکھنے والے کے مذاق کی قلعی کھل جاتی ہے۔ فطرت میں جو چیزیں پائی جاتی ہیں ان سے بہتر عمدہ مثالیں ہم کو مل ہی نہیں سکتیں۔'' (ذات شریف، ص 1)

اختری بیگم کے نسوانی کرداروں میں مہری ہے جو بالکل ابتدا میں خورشید بیگم کا خط لے کر آئی تھی اور خط پا کر خورشید مرزا پرانی یادوں میں کھو گئے تھے۔ اس کے بعد اس کا ذکر نہیں ملتا۔ پھر اختری کی والدہ خورشید بیگم جو تھوڑی دیر کے لیے کہانی میں آتی ہے۔ اس کے علاوہ نوکرانی میں حسینی خانم، کریمن وغیرہ ہیں۔ اہم کرداروں میں جعفری، نادری، ہرمزا اور بوٹن ہیں جو مرکزی کردار اختری بیگم کے ساتھ ہر موڑ پر نظر آتے ہیں۔ نیز مرزائی بیگم جعفری کی پھوپھی اور زینب ایک غریب اور خود دار بوڑھی عورت ہے۔ یہ دونوں اختری بیگم کے احسان اور حسن اخلاق کی گرویدہ اور اس سے بے پناہ محبت کرتی ہیں۔ یہ تمام ذیلی اور ضمنی کردار اختری بیگم کے عادات و اطوار، نیک سیرت اور مثالی شخصیت کو روشن کرتے ہیں۔

مرزا رسوا کا یہ ناول بنیادی طور پر خیر و شر کی کشمکش پر مبنی ہے جس میں آخر کار خیر کی فتح ہوتی ہے۔ نسوانی کردار ہی اس ناول کا مرکزی کردار ہے اور اسی کے نام پر اس ناول کا نام رکھا گیا ہے۔ مرزا رسوا نے اختری بیگم کی نیک سیرت اور فرشتہ خصلت کو بیان کرنے کے لیے ایک بڑا بیانیہ خلق کیا ہے جس میں نواب خورشید مرزا کو مرکزی حیثیت حاصل ہے۔ نواب خورشید مرزا کی بیوی کے انتقال کے بعد خورشید بیگم کا کردار سامنے آتا ہے جو اختری بیگم کی ماں ہے۔ خورشید مرزا اور خورشید بیگم بچپن سے دوست تھے اور ایک دوسرے سے شادی کی خواہش بھی رکھتے تھے، لیکن ان کے والدین نے پوری نہ ہونے دی۔ دونوں کے والدین نے اپنے اپنے طور پر ان کی شادی کرادی جس کا صدمہ دونوں کو عمر بھر رہا۔ اتفاق یہ ہوا کہ خورشید مرزا کی بیوی اور خورشید بیگم کے شوہر تھوڑے دنوں کے فاصلے پر انتقال کر گئے۔ خورشید بیگم کو اپنے آبا واجداد سے ترکے میں بہت سے مال واسباب ملے تھے تاہم وہ کسی سنگین مرض میں مبتلا تھی جس سے بچنا ممکن نہیں تھا۔ لہٰذا وہ اپنی بیٹی اختری بیگم کو خورشید مرزا کی کفالت میں دینے کے لیے لکھنؤ آتی ہے اور خورشید مرزا کے نام وصیت نامہ تیار کروا کر اختری بیگم کو ان کے سپرد کر دیتی ہے۔ اس کے کچھ ہی عرصے بعد اختری بیگم کی والدہ کا انتقال ہو جاتا ہے اور چوں کہ باپ کا انتقال پہلے ہی ہو چکا تھا اس لیے وہ یتیم ہو جاتی ہے۔

نواب خورشید مرزا کی صرف دو بیٹیاں تھیں۔ بڑی کا نام جعفری اور چھوٹی کا نادری تھا اور ان دونوں کے مزاج میں بہت فرق تھا۔ جعفری کی طبیعت میں حسد، جلن، کینہ اور بغض کوٹ کوٹ کر بھرا تھا جب کہ نادری بہت صاف دل کی اور ملنسار طبیعت کی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ اختری کے گھر میں آتے ہی جعفری کے ناک بھوؤں چڑھ جاتے ہیں اور وہ اسے جلی کٹی سناتی رہتی ہے، جب کہ نادری اس قدر گھل مل جاتی ہے، گویا دونوں میں برسوں پرانے تعلقات ہوں۔ نواب خورشید مرزا کو چونکہ اختری بیگم کے لیے وصیت کی گئی تھی کہ اسے کبھی یتیمی کا احساس نہ ہونے دے اور اس راز سے شادی ہونے تک پردہ بھی نہ اٹھائے۔ اس لیے نواب خورشید مرزا نے اپنے گھر میں اسے بڑے اہتمام اور لاڈ پیار سے رکھا تھا جسے دیکھ کر جعفری کے تن بدن میں ہمیشہ آگ لگی رہی۔ حالانکہ اختری بیگم نے کبھی اس کی باتوں کو دل پر نہیں لیا اور وہ ہمیشہ اسے بڑی بہن سمجھتی رہی۔ اختری بیگم کے لیے خورشید مرزا نے بہت اہتمام کیا جو جعفری کو بالکل بھی پسند نہیں آیا۔ اس کا غصہ بھی جائز تھا۔ کیونکہ اس سے پہلے

بھی گھر میں کئی مہمان اور رشتے دار آئے لیکن ان کے لیے اتنا اہتمام کبھی نہیں کیا گیا جتنا اختری کی آمد پر ہوا۔ دوسری بات اختری اپنے آپ میں چاہے جتنی بھی نیک اور اچھی ہو جعفری کے لیے اس کی اتنی اہمیت نہیں جتنی اس بات کی ہے کہ اس کے آنے سے گھر کے اخراجات بڑھ گئے۔ چونکہ جعفری کو اس کی حیثیت اور دولت کا کوئی علم نہیں تھا اس لیے اس کے ٹھاٹ باٹ اور اخراجات کو دیکھ کر اسے بہت ملال ہوتا تھا۔ جعفری کے تیور دیکھیں:

''ایک ذرا سی لڑکی کے لیے یہ انتظام یہ سامان آج تک خالائیں بھی آئیں پھوپھیاں بھی، اے لو چار دن کا ذکر ہے خدا بخشے نانی اماں سال میں ایک دو دفعہ آتیں کسی کے لیے یہ اہتمام یہ سامان نہیں ہوئے۔ کمرہ خالی کردو اس میں جھاڑو دلوادو، سفیدی پھروادی گئی، دریاں چاندنیاں نکلوائی گئیں، خاص دان اگال دان، تسلہ لوٹے پر نئی قلعی ہوئی یا اللہ! ایسی کہاں سے رنگا کے آئیں گی اور ساری حکومت مجھ پر جیسے میں اختری کی لونڈی ہوں، ناصاحب مجھ سے کسی کی ماما گیری نہیں ہوگی۔ میں باز آئی۔'' (اختری بیگم، ص 40-41)

مرزا رسوا نے اختری بیگم کی صورت میں ایک ایسے کردار کی تخلیق کی جو بالکل مثالی ہے۔ ابتدا سے انتہا تک اس کی خوبیاں نمایاں ہوتی جاتی ہیں۔ اس کے اندر نفرت اور برائی کا معمولی سا بھی عنصر نہیں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جعفری کی از حد نفرت کے باوجود کبھی اس کے حوالے سے اختری کا دل میلا نہیں ہوا۔ یہاں تک کہ ایک بار ایسا ہوا کہ جعفری نے اختری بیگم کو اپنے گھر سے نکال دیا لیکن اس کے باوجود اس نے جعفری کو کبھی برا بھلا نہیں کہا۔ اختری نے ضرورت مندوں کی اس طرح مدد کی کہ اس کی عزت نفس کو بھی کبھی ٹھیس نہیں پہنچنے دی۔ چہ جائے کہ کبھی احسان جتائے۔ غرض کہ حیا، سخاوت، شرافت اور نجابت کی وہ پتلا تھی جس کی زندگی میں برائی کا لفظ ہی نہیں تھا۔ اختری بیگم کی صفات مرزا رسوا کی زبانی ملاحظہ کریں:

''صانع حقیقی نے جہاں کہیں صورت اور سیرت کو کسی آدمی زاد میں خواہ مرد ہو خواہ عورت ایک جگہ جمع کر کے قدرت نمائی کی ہے۔ وہ فطرت کے بہترین نظاروں سے ہے، یہ لڑکی بہ ہمہ صفت موصوف تھی۔ پیاری پیاری صورت کے ساتھ نیک دلی، نیک نیتی، پاکیزہ خیالات، تمیز داری سلیقہ شعار، رحم دلی، خدا ترسی، معصوم صفتیں...'' (ایضاً، ص 25)

نواب خورشید مرزا چونکہ کاروبار سلطنت دیکھتے تھے اس لیے امور خانہ داری جعفری کے ذمے تھا۔ اشیائے خورد و نوش، نوکروں اور خادماؤں کی ضروریات کا انتظام جعفری ہی کیا کرتی تھی۔ اختری بیگم جب سے گھر میں آئی ہے خورشید مرزا کی توجہ اس پر کچھ زیادہ ہی رہتی ہے اور خرچ میں بھی اضافہ ہوگیا ہے۔ لہٰذا جعفری کو یہ فکر بھی ستائے جارہی ہے کہ گھر میں عیش و آرام سے رہ کر مفت خوری کر رہی ہے۔ حالانکہ معاملہ اس کے برعکس ہے۔ خورشید مرزا کی مالی حالت انتہائی ابتر ہے۔ مراد علی کی چال بازیوں سے دن بہ دن قرض بڑھتا جارہا ہے اور پورا کاروبار سلطنت زوال پذیر ہے۔ اگر اختری بیگم کی دولت خورشید مرزا کے تصرف میں نہ ہوتی تو ان کا گھر بار نیلام ہوگیا ہوتا۔ ایک عرصے تک یہ بات صیغہ راز میں رہی تاہم جب جعفری پر اختری بیگم کا راز کھلا تب اس کے آمرانہ رویے میں نرمی آئی۔ لیکن پھر بھی اختری کے لیے اس کے دل میں محبت پیدا نہ ہوسکی۔ ان دونوں کی گفتگو سنیں:

اختری: ماموں جان کے بعد میں آپ کو اپنا بزرگ سمجھتی ہوں، آپ کھائیے پکوائیے مجھ کو بھی جس طرح ہاتھ اٹھا کے دیتی تھیں دیجیے۔ اپنی چھوٹی مجھیے چھوٹی بہن نہ مجھیے لونڈی سمجھیے۔ مجھے زندگی بھر عذر نہ ہوگا'' کیا کہنا اختری کا۔

جعفری: بس بس آپ کی خوبیوں میں کوئی شک نہیں مجھے یقین ہے کہ جو آپ کہتی ہیں وہی کریں گی، مگر میں اس قابل نہیں ہوں، میں اس درجہ پر رہنا چاہتی ہوں جس درجہ پر خدا نے مجھے رکھا ہے۔ ایسی جھوٹی حکومت مجھ کو منظور نہیں۔ جب میں محکوم ہوں تو حاکم بن کے کیوں بیٹھوں، میں آپ کی اطاعت کرنے کو حاضر ہوں مگر مجھے بنایئے نہیں۔'' (ایضاً، ص 218)

اس ناول کے نسوانی کرداروں میں اختری بیگم اور جعفری مرکزی حیثیت رکھتی ہیں۔ ان دونوں کی فطرت میں مکمل تضاد ہے۔ لیکن ان میں ایک مشترک بات یہ ہے کہ دونوں ایک ہی حالت پر قائم رہتی ہیں۔ اختری بیگم کی نیک فطرت نے جعفری کے خلاف کبھی بدگمانی پیدا نہیں ہونے دی، وہیں جعفری کبھی اختری کے تعلق سے خوش گمان نہیں ہوئی۔ چنانچہ اختری بیگم کو جعفری نے کبھی دل سے تسلیم نہیں کیا۔ یہی وجہ ہے کہ جس دن سے وہ گھر میں آئی کبھی جعفری نے سیدھے منہ بات نہیں کی بلکہ ہمیشہ اسے جھڑکتی رہی اور کھری کھوٹی سناتی رہی لیکن اس کے باوجود اختری بیگم نے کبھی اسے برا نہیں جانا۔ ہمیشہ وہ اس سے اپنے قریب کرنے کی کوشش کرتی رہی اور طرح سے اس کا دل جیتنے کی کوشش کرتی رہی تاہم جعفری کے دل سے غبار کبھی نہ نکلا: ''جعفری کو ملانے کی اس نے از حد کوشش کی وہ کہتی تھی کہ جعفری سے میل کیے بغیر وہ اس گھر میں خوش نہیں رہ سکتی، دریا میں رہنا اور مگر مچھ سے بیر جعفری کے دل میں خناس گھسا ہوا تھا، نہ نکلا پر نہ نکلا۔''

(ایضاً، ص 55)

مرزا رسوا نے جعفری کی شکل میں ایک ایسے کردار کی تخلیق کی جو انتہائی ضدی اور اپنے فیصلے پر اٹل ہے۔ اس کے اندر انانیت اور خود پرستی کا جنون ہے۔ باپ کی دولت پر ناز بھی اور اسے فضول میں لٹانے پر تکلیف بھی۔ اختری پر جو پیسے خرچ ہوتے تھے وہ جعفری کے لیے انتہائی تکلیف دہ اور ناقابل تسلیم ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ اختری کے ٹھاٹ باٹ کو دیکھ کر ہمیشہ جلی بھنی رہتی ہے۔ لیکن جب اسے اس بات کا علم ہوگیا کہ نواب خورشید مرزا جو اختری پر خرچ کر رہے ہیں نہ صرف وہ اس کا ہے بلکہ گھر کے اخراجات بھی اسی کے پیسے سے چل رہے ہیں تو وہ فوراً اپنی حد میں آجاتی ہے۔ پھر اختری پر اپنا حکم چلانا بند کر دیتی ہے۔ یہی تھوڑی تبدیلی جعفری میں آتی ہے ورنہ اس کا دل اب بھی اختری بیگم کے حوالے سے صاف نہیں ہے:

''غرض جعفری جس مرتبے کی تھی وہی مرتبہ اس نے اختیار کیا۔ اختری کی دولت منت خوشامد اس کی ضد کے سامنے سب ہیچ ٹھہری، مضبوط ارادے کے لوگ ایسے ہی ہوتے ہیں، وہ اپنی بات کی پکی اور ضد کی پوری تھی۔ جب تک باپ کی دولت سمجھ کے وہ اٹھا رہی تھی۔ اس کو اختری (اس کے خیال میں مفت خوری) کا خرچ فضول معلوم ہوتا تھا۔ اس کو باپ کی تباہی کا قلق تھا وہ سمجھتی تھی کہ باپ کی تباہی کا سبب اختری ہے۔ باپ کے بے ہوش ہوتے ہی اس کی رائے میں اختری کے ساتھ رعایت کرنا گناہ تھا۔ جب سے اس کو معلوم ہوا کہ معاملہ برعکس ہے بلکہ ان کے والد خود اختری کے دست نگر ہیں وہ اختری کی مطیع بن کے رہنا پسند کرتی تھی بے جا حکومت پرائے مال پر اپنا تصرف ناجائز خیال کرتی تھی وہ اپنی حالت پر بہت جلد راضی ہوگئی۔ وہ اس حال میں اپنی تقدیر پر شاکر تھی۔''

(ایضاً، ص 220)

اختری بیگم کے حسن اخلاق اور نیک نیتی نے دن بہ دن لوگوں کو اپنا گرویدہ بنالیا۔ محل کے اندر نوکر چاکر ہوں یا نواب خورشید مرزا کے رشتے دار سبھی کے دل میں اختری بیگم بستی چلی گئی۔ کیونکہ وہ بلند اخلاق و کردار کی مالک تھی اور سخاوت بھی خوب کرتی تھی۔ چنانچہ نواب خورشید مرزا کے ہونے والے داماد حکیم سید جعفر علی اور نواب مرزا کو اختری سے بے پناہ عقیدت ہوگئی۔ یہی وجہ ہے کہ جب مراد علی نے اختری کو زک پہنچانے اور دولت ہتھیانے کی ناپاک کوشش کی تو یہ دونوں ڈھال بن گئے

اوراختری بیگم کواس کے شر سے محفوظ رکھنے کے لیے اپنی جان خطرے میں ڈال دی۔ اسی طرح پڑوس میں رہنے والی ایک غریب سن رسیدہ زینب کو اختری بیگم نے اپنی ماں بنالیا اوران کی بیٹی ہرمزی کو اپنی بہن۔ ہرمزی ایک اسکول میں نوکری کرتی تھی جس کی آمدنی سے ماں بیٹی کا گزربسر ہوتا تھا۔ اختری بیگم اکثر ان کے گھر جا کر بوڑھی زینب کے دکھ سکھ میں شامل ہوتی اور مالی معاونت بھی کرنا چاہتی مگر اس غریب کی خودداری بیچ میں حائل ہوجاتی۔ لیکن اس کے باوجود اختری بیگم نے اسے اپنی ماں بنا کر اس طرح مدد کی کہ ان کی عزت نفس مجروح نہیں ہونے دی۔

مرزائی بیگم جعفری کی پھوپھی تھی اور وہ بھی اختری بیگم سے بے پناہ محبت کرتی تھی۔ دراصل جعفری کی پھوپھی نے اس سے کچھ پیسے قرض لیے تھے جسے واپس لینے کے لیے ان کے یہاں گئی تو ساتھ میں اختری بیگم بھی چلی گئی۔ چوں کہ مرزائی بیگم کے پاس قرض چکانے کے لیے پیسے نہیں تھے اس لیے اختری بیگم نے جعفری کی نظروں سے چھپا کر انھیں اتنے پیسے دیے کہ قرض ادا ہوگیا۔ اس طرح مرزائی بیگم جعفری کے خلوص اور احسان کو دیکھ کر بے حد متاثر ہوئی اور پوری زندگی اختری سے محبت کرتی رہی۔ زینب بیگم کی بیٹی ہرمزی انتہائی نیک، محنتی، سنجیدہ اور تعلیم یافتہ تھی۔ اس کی بوڑھی ماں کے علاوہ گھر میں اور کوئی نہیں تھا لہٰذا ایک اسکول میں پڑھا کر وہ اپنی والدہ کی کفالت کرتی تھی۔ حالانکہ اس کی والدہ کو یہ گوارہ نہیں تھا کہ اپنی بیٹی کو نوکری کے لیے بھیجے لیکن حالات کے آگے وہ مجبور تھی۔

درمیان میں بوٹن کا داخلہ ہوتا ہے جو زینب کے ایک دور کے بھائی محسن علی کی بیٹی ہے۔ دراصل ہرمزی کی طبیعت کی ناسازی اور شہر کی آب و ہوا سے تنگ آکر زینب نے رڑکی میں مقیم محسن علی کے یہاں جانے کا قصد کیا۔ یہاں گاؤں کی کھلی فضا میں محسن علی کی بیٹی بوٹن سے ملاقات ہوئی جو انتہائی شوخ اور چنچل تھی۔ ہرمزی سے بے تکلفی بڑھ گئی اور واپسی کے وقت وہ ساتھ آنے کو بضد ہوگئی۔ چنانچہ وہ زینب اور ہرمزی کے ساتھ لکھنؤ آگئی۔ یہاں اس کی ملاقات مرادعلی سے ہوئی اور اس کو اپنا دل دے بیٹھی۔ دونوں میں اتنی گہری محبت ہوگئی کہ شادی کرنے اور ساتھ جینے مرنے کا عہد و پیمان بھی ہوگیا۔ اس درمیان مرادعلی اختری کی دولت پر نظریں جمائے ہوئے تھا۔ موقع ملتے ہی اس کے زیورات اور مال و دولت لے کر بوٹن کے ساتھ فرار ہوگیا۔ اس کا ارادہ تھا کہ جہاز کے ذریعے ولایت نکل جائے اور وہاں بوٹن کے ساتھ خوش حال زندگی گزارے۔ لیکن چوں کہ حکیم جعفر علی اور نواب مرزا کو مرادعلی کی سازشوں کا اندازہ تھا اور اس کے فرار ہونے کی خبر مل چکی تھی اس لیے نواب مرزا اس کے ساتھ سائے کی طرح لگے رہے اور بالآخر ممبئی میں اسے رنگے ہاتھوں دبوچ لیا۔ یہاں پر بوٹن کو بہت سمجھایا گیا کہ وہ اپنے والدین کے ساتھ گھر لوٹ جائے لیکن وہ نہیں مانی۔ بوٹن بھی بہت مضبوط ارادے کی تھی، ایک بار جب اس نے مرادعلی کے ساتھ رہنے کا فیصلہ کرلیا تو پھر کبھی اس نے پیچھے مڑ کر نہیں دیکھا:

"بوٹن کی رخصتی قیامت کا سامنا تھا، ہرمزی، نواب مرزا کی بیوی سب سمجھا کے تھک گئے۔ ماں چیخیں مار مار روئی ہیں۔ سب سے مل کر نہایت بے پروائی کے ساتھ جہاز میں سوار ہوگئی، جہاز میں جاکے وطن، ماں باپ کی عزت، عزیز، کنبہ کی جدائی کا خیال آیا۔ ایک کونہ میں جہاز کے منہ چھپا کے بیٹھ رہی۔ جہاز کا لنگر اٹھا سب ہوٹل کو واپس آئے، کوئی بوٹن کو برا کہہ رہا ہے، کیسے کٹر دل کی ہے، نہ باپ کی قید کا خیال، نہ ماں کے رونے پیٹنے کا، مگر اس کا چلتے چلتے یہی کلام تھا کہ اب تو جو قسمت میں لکھا تھا پورا ہوا، کر کے چھوڑ دینا بہت برا ہے۔ اس کے بعد سنا گیا کہ بوٹن پر سخت مصیبتیں گزریں، مرادعلی نے چھوڑا تو نہیں مگر ناداری ایسی تھی کہ صبح سے شام تک دشواری سے پیٹ بھر کے کھانے کو ملتا تھا۔ مگر وہ اپنی قسمت پر شاکر رہی اور وطن کا رخ نہ کیا۔ بری ہو یا بھلی بات کی سچی اور قول کی پوری تھی۔" (ایضاً، ص 235)

اس واقعے کے بعد اختری بیگم کی دولت کا شہرہ پورے لکھنؤ میں ہوجاتا ہے اور مختلف نواب اور امرا اس سے شادی کے لیے پیغامات بھیجنے لگتے ہیں۔ یہاں پر ناول کا اختتام ہوسکتا تھا تاہم مرزا رسوا نے ایک نئی جعل سازی کا قصہ شروع کردیا۔ چوں کہ اس واقعے کے بعد اختری بیگم کی دولت اور حیثیت پورے لکھنؤ میں ظاہر ہوگئی اس لیے دولت کے لالچ میں رشتوں کی لائن لگ گئی۔ اس کا فائدہ خط نویس اور بوا حسینی نے یوں اٹھایا کہ آنے والے خط کا جواب اختری بیگم کی طرف سے خود ہی دینے لگی اور بدلے میں پیسے اینٹھنے لگی۔ حد یہ کہ شہزادی نامی ایک بیوہ کو اختری بیگم بنا کر نواب گوہر مرزا کے گلے پھانس بھی دیا اور بدلے میں انعام واکرام بھی پالیا: "آج بھی خاطر خواہ روپیہ اٹھا، نوکروں چاکروں نے انعام پایا۔ بیگم صاحبہ کی فرمائشیں پوری کی گئیں۔ چار تھان ململ کے بھیج دو۔ دو تھان اطلس کے ابھی روانہ کردو۔" (ایضاً، ص 254)

آخر اس جعل سازی کا بھی پردہ فاش ہوجاتا ہے اور ناول کا اختتام ہوجاتا ہے۔ اختری بیگم کے پردے میں مرزا رسوا نے جعل سازوں کا ایسا تانا بانا بنا ہے کہ حیرت ہوتی ہے۔

مرزا رسوا کا کمال یہ ہے کہ وہ جتنی مہارت سے مرد کردار تخلیق کرتے ہیں اتنی ہی ہنرمندی سے نسوانی کردار بھی تخلیق کرتے ہیں۔ انھیں عورتوں کی نفسیات اور فطرت کا بخوبی علم ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اختری بیگم میں جتنے نسوانی کردار پیش کیے گئے ہیں ان میں حد درجہ ہنرمندی موجود ہے۔ ان کے مکالمے ہوں یا کہانی ان کے رول میں کہیں کوئی جھول نہیں ہے۔ البتہ اس ناول کا پلاٹ اتنا مربوط اور گٹھا ہوا نہیں ہے۔ اصل کہانی مکمل ہونے کے بعد بھی دوسری کہانی کی پیوندکاری ایک الگ رخ دکھاتی ہے۔ دراصل مرزا رسوا نے لکھنؤ کی جعل سازی کے مختلف پہلوؤں کو اجاگر کرنے کے لیے ایسا کیا ہے۔

غرض کہ اس ناول میں اختری بیگم کے ضمن میں کئی نسوانی کردار سامنے آتے ہیں جن سے ہماری زندگی میں بھی سابقہ پڑتا رہتا ہے۔ اختری بیگم ہی چونکہ مرکزی کردار ہے اس لیے دیگر نسوانی کردار اس کی شخصیت کو ابھارنے اور نکھارنے میں معاونت کرتے ہیں۔ یہ بھی ذہن نشین رہے کہ کردار کا ایک ہی ہیئت اور خصلت پر ابتدا تا انتہا قائم رہنا کردار نگاری کا عیب مانا جاتا ہے۔ اس لحاظ سے اگر اس ناول کے نسوانی کرداروں کو دیکھا جائے تو مرکزی کردار اختری بیگم میں یہ عیب بدرجہ اتم موجود ہے۔ اس کے علاوہ جعفری اور نادری بھی کوئی خاص تبدیلی قبول نہیں کرتیں۔ اس کا جواب یہ دیا جاسکتا ہے کہ حقیقی زندگی میں بھی بعض استثنائی کردار ایسے ہیں جو مثالی ہیں اور زندگی بھر ان کے رویے نیک ہی رہے۔ اسی طرح بعض برے لوگ ہمیشہ برے ہی رہے۔ مرزا رسوا بھی چوں کہ حقیقت کے ترجمان، دم توڑتی تہذیب کے نوحہ گر اور بہتر معاشرے کے خواہاں رہے اس لیے ان کے یہاں مثالی کردار کے پردے میں معاشرتی کجی اور خامی کا بیان کوئی حیرت کی بات نہیں ہے۔ بقول مرزا رسوا: "ناول نویس ان واقعات کو علی العموم تحریر کردیتا ہے جو اس نے اپنے زمانے میں دیکھے ہیں۔ یا اسے دوسری عبارت میں یوں کہیے کہ زمانہ کی تصویریں جو اس کے دل و دماغ کے مرقع میں موجود ہیں۔ انھیں کی نقلیں اتار اتار کے ناظرین کو دکھا دیتا ہے۔ مگر یہ ان ناول نویسوں کا ذکر ہے جنھوں نے اس فن خاص میں صرف فطرت کو اپنا معلم بنالیا ہے۔ جو ناول نویس اس باریکی کو نہیں سمجھتے وہ اکثر دھوکا کھاتے ہیں۔" (ایضاً، ص 1)

■

Dr. Md Tauheed Khan
CIL/ SL, JNU
New Delhi - 110067
Mob.:9911298667

ناول ’امراؤ جان ادا‘ ثقافتی بیانیہ کے تناظر میں

جاوید احمد نجار

’ناول‘ اردو میں ’ثقافتی بیانیہ‘ (Cultural Narration) کی سب سے زیادہ ترقی یافتہ صورت ہے۔ بلکہ یہ کہنا زیادہ مناسب ہوگا کہ اردو میں ناول نگاری کا آغاز ہی، ’مشرقیت‘ اور ’مغربیت‘ کی آمیزش اور آویزش کے نتیجے میں پیدا ہونے والے سماجی و ثقافتی زوال، انتشار اور بحران کے زیر اثر ہوا ہے۔ عام طور پر یہ کہا جاتا ہے کہ اردو میں ناول نگاری مغربی اثرات کے تحت شروع ہوئی، لیکن یہ سو فیصد درست نہیں، کیونکہ کسی بھی زبان میں، کوئی بھی نئی صنف محض تقلید کی بنا پر مستقل ادبی صنف کی حیثیت حاصل نہیں کر سکتی، اس کے لیے اس صنف میں اپنے ماحول اور معاشرے کی تہذیب وثقافت کے زائیدہ جمالیاتی محاسن کا ہونا بھی ضروری ہے۔

دراصل 1857 کے بعد جن دنوں اردو والوں میں انگریزی شعر و ادب کا ذوق پروان چڑھ رہا تھا ان ہی دنوں میں ہندوستانی سماج میں نئی ادبی، علمی اور دیگر ثقافتی قدریں بھی سامنے آرہی تھیں۔ ’جاگیردارانہ تہذیب و ثقافت‘ زوال آمادہ ہو چکی تھیں اور اس کی جگہ انگریزوں کی ’سرمایہ دارانہ تہذیب وثقافت‘ بڑی تیزی سے اپنے پاؤں پھیلا رہی تھیں۔ عبدالماجد دریابادی نے 1857 کے بعد مِن حیث القوم مسلمانوں کے ثقافتی، بلکہ ہمہ جہت زوال کی نشاندہی کرتے ہوئے لکھا تھا:

”...غدر کے فرو ہوئے چند سال گزر گئے ہیں۔ ہندوستان بیرونی مداخلت وتسلط کے شکنجے میں پورے طور سے کسا ہوا ہے۔ اسلامی اخلاق، اسلامی آداب، اسلامی شعار، مدت ہوئی رُخصت ہو چکے، عقائد میں تزلزل آچکا ہے، ایمان کی مضبوطی ایک افسانۂ پارینہ رہ گئی ہے۔ حرص، طمع، مکر ونفاق، خودغرضی وغداری، نفس پروری اور عیش پرستی کی گرم بازاری ہے۔ اس کے مقابلے میں برطانیہ کی عظمت کا نقش ہر دل میں بیٹھا ہوا ہے۔ دادخواہی کے لیے انگریزی عدالتیں ہیں۔ تعلیم کے لیے انگریزی مدرسے ہیں سفر کے لیے انگریزی سواریاں ہیں، علاج کے لیے انگریزی شفا خانے ہیں، عزت وحکومت کے لیے انگریزی عہدے ہیں، حصول زر کے لیے انگریزی پیشے ہیں، زینت وآرائش کے لیے انگریزی مصنوعات اور انگریزی بازار ہیں۔ غرض جس طرف رُخ پھرتا، حدِ نظر تک ایک غیر محدود نا متناہی پرچم، انگریزی اقبال کا لہراتا ہوا نظر آتا۔“

(بحوالہ سرسید اور چند نامور شخصیتیں: ڈاکٹر مظہر مہدی، 2010، ص 75)

مرزا محمد ہادی رسوا نے یوں تو کئی ایک ناول تخلیق کیے ہیں جن میں ذات شریف، شریف زادہ، اختری بیگم، امراؤ جان ادا اور ’اِفشائے راز‘ قابل ذکر ہیں۔ لیکن ان کے جس ناول کو فنی وفکری سطح پر سراہا گیا وہ ’امراؤ جان ادا‘ ہے۔ مذکورہ ناول میں رسوا نے بڑی فن کاری سے لکھنؤ کے مختلف طبقات سے وابستہ لوگوں کے عقائد وتصورات، علم وادب اور اخلاق و آداب کی تصویر کشی کرکے اُس وقت کی ثقافتی صورت حال کو بڑی خوبصورتی سے پیش کی ہے۔ اس ناول کا موضوع اگرچہ ایک طوائف کی زندگی کے احوال ہیں، لیکن اس کے پس پردہ رسوا نے لکھنؤ کی زوال پذیر معاشرت اور تہذیب و ثقافت کی تصویر کشی خوبصورت انداز میں کی ہے۔ 1857 میں جب انگریزوں کا تسلط ہندوستان پر قائم ہوا تو نہ صرف صدیوں سے قائم مسلمانوں کے اقتدار کا خاتمہ ہو گیا بلکہ ان کی تہذیب وثقافت اور علم و ادب کا بھی زوال ہو گیا۔ مشرقی تہذیب وثقافت کا چراغ گل ہونے لگا اور اس کی جگہ مغربی تہذیب اپنے پاؤں پھیلانے لگی۔ ہندوستان کے دوسرے شہروں میں بالعموم اور لکھنؤ میں بالخصوص جس طرح تہذیب وثقافت کی پامالی سامنے آئی، وہ قدرے حیرت ناک و ہیبت اندیش تھی۔ لکھنؤ کا شمار ہندوستان کے ان شہروں میں ہوتا ہے جہاں تہذیب و ثقافت کے تمام دھارے باہم مربوط ومستحکم صورت میں گھل مل رہے ہیں۔ جہاں کی خوش حالی واطمینان بخش زندگی کے گیت ہر خاص وعام کی زبان پر رہتے ہیں۔ جہاں کی ایک ایک حرکت ہندوستانی تہذیب کا گہوارہ گردانی جاتی ہے۔ واجد علی شاہ جیسے امرا کی سرپرستی میں اس شہر نے جو ترقیاں اور خوش حالیاں سر کی تھیں ان کی نظیر ملنا دشوار ہے۔ لیکن ملک میں مناظر فطرت اور ہنگامی صورت حال کا اثر اس تہذیب و ثقافت کو بھی اپنی لپیٹ میں لے گیا یوں وہ تمام تر رنگینیاں اور روشنی گل ہو گئیں جو اس شہر کا مرکز ومحور تصور کی جاتی تھیں۔ مرزا رسوا نے اس ناول میں بڑی فن کاری اور کمالِ عمدگی سے اس پورے منظر نامے کا دلکش مگر عبرت ناک خاکہ کھینچا ہے۔ مذکورہ ناول محض ایک طوائف کی کہانی نہیں بلکہ مشرقی تہذیب وثقافت کی شاندار مثال ہے امراؤ جان ادا دوسری طوائفوں کی طرح جسم فروشی نہیں کرتی بلکہ وہ پڑھی لکھی اور شائستہ طوائف ہے۔ اس کے کوٹھے پر صرف جنسی طلبگاروں کا مجمع نہیں ہوتا بلکہ علم وادب کے شیدائیوں کی محفلیں بھی سجتی ہیں۔ امراؤ جان ایک طوائف ضرور ہے لیکن اس کا مذاق ادبی ہے اس کی زبان شستہ اور نفیس ہے۔ وہ

ایک شاعرہ ہے جو شعر کہتی ہے اس کا اندازہ ناول کے اس اقتباس سے لگایا جا سکتا ہے۔ ملاحظہ فرمائیں:

''میں نے احباب سے چند الفاظ میں ان کے مذاق شعر وسخن اور کمال موسیقی وغیرہ کی تعریف کر دی تھی۔ لوگ مشتاق ہوگئے تھے۔ جب وہ تشریف لائیں تو یہ ٹھہری کہ سب صاحب اپنا اپنا کلام پڑھیں اور وہ بھی پڑھیں۔ خلاصہ یہ کہ بڑے لطف کا جلسہ ہوا۔ اس دن سے امراؤ جان اکثر شام کو چلی آتی تھیں۔ گھنٹہ دو گھنٹہ تک نشست رہتی تھی۔ کبھی شعر وشاعری کا جلسہ ہوا، کبھی انھوں نے کچھ گایا۔ احباب محظوظ ہوئے۔ ایسے ہی ایک جلسے کی کیفیت ہم یہاں لکھے دیتے ہیں۔ ان مشاعروں میں نہ کوئی طرح مقرر کی جاتی تھی اور نہ بہت سے لوگوں سے وعدے لیے جاتے تھے، صرف بے تکلف احباب جمع ہوجاتے ہیں اور اپنی اپنی تازہ تصنیف غزلیں پڑھتے تھے۔

کس کو سنائیں حال دل زار اے ادا
آوارگی میں ہم نے زمانے کی سیر کی

مرزا رسوا: کیا کہنا ہی امراؤ جان صاحبہ! یہ مقطع تو آپ نے حسب حال کہا ہے، اور شعر کیوں نہ ہو۔
امراؤ جان: تسلیم مرزا صاحب! آپ کے سر کی قسم۔ بس یہ مطلع یاد تھا اور یہ مطلع خدا جانے کس زمانے کی غزل کا ہے۔ زبانی کہاں تک یاد رہے۔ بیاض نگوڑی گم ہوگئی۔
منشی صاحب: اور وہ مطلع کیا تھا ہم نے نہیں سنا۔
رسوا: آپ تو اہتمام میں مصروف ہیں سنے کوں۔''

(مرزا محمد ہادی رسوا: اُمراؤ جان ادا، دہلی، 1985، ص 38-37)

درج بالا اقتباس سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ مشاعرہ اور شاعرانہ مزاج لکھنوی تہذیب وثقافت کا ایک اہم جز تھا۔ اس عہد کے ہر خاص وعام میں شعرفہمی پائی جاتی تھی۔ لوگوں کو مشاعرے سے بے حد دلچسپی تھی۔ لکھنؤ کی اس ادبی فضا میں امراؤ جان ادا بھی اپنی ایک خاص پہچان رکھتی تھی۔ امرا، شرفا اور شعرا اس کے علم وفن کے گرویدہ ہیں۔ مرزا رسوا کے زیادہ تر ناولوں میں لکھنؤ کی زوال آمادہ تہذیب، اعلیٰ طبقے کی عیاشیوں اور مذہبی آزادی یا مذہب کا گرتا ہوا گراف خصوصاً مسلم معاشرے کی ایسی تصویر کشی ہے کہ انیسویں صدی کے اوائل کا پورا عہد نظروں کے سامنے آجاتا ہے۔ مرزا کے زیادہ تر کردار امراؤ جان، گوہر مرزا، خانم، اختری بیگم، شریف زادہ کا مرزا عابد حسین اسلامی معاشرت اور لکھنوی تہذیب و ثقافت کی زندہ جاوید تصویریں ہیں جنھیں مرزا رسوا نے ضرور اپنے تصور سے تراشا ہے لیکن ان میں زندگی کوٹ کوٹ کو بھری ہے۔ موسیقی لکھنوی تہذیب و ثقافت کا اہم عنصر تھی لہٰذا طوائف کو موسیقی کی تعلیم دینے کے لیے ایک ماہر استاد مقرر ہوتے تھے، امراؤ جان کو موسیقی سے بڑی دلچسپی تھی۔ اس لیے فن موسیقی سیکھنے میں اسے زیادہ وقت نہیں لگا اس بارے میں امراؤ جان کے یہ الفاظ ملاحظہ فرمائیں:

''بسم اللہ خورشید کو گاتے ناچتے دیکھ کر میرے دل میں خود بخود ایک امنگ سی پیدا ہوئی۔ بجائے خود گنگنانے اور تھرکنے لگی اسی عرصے میں میری بھی تعلیم شروع ہوگئی۔ میری طبیعت فن موسیقی سے بہت ہی مناسب پائی گئی۔ آواز بھی پکے گانے کے لائق تھی۔ سرگم صاف ہونے کے بعد استاد نے آستائی شروع کرادی۔ استاد جی بہت اصول سے تعلیم دیتے تھے۔ ہر ایک راگ کا سر بیورہ زبانی یاد کرایا جاتا تھا اور وہی گلے سے نکلواتے تھے۔ مجال نہ تھی کوئی سر کومل سے ات کومل، سدھ سے اسدھ یا تیور سے تیورتر ہو جائے۔ اور میری بھی حجتیں کرنے کی عادت تھی۔''

(مرزا محمد ہادی رسوا: اُمراؤ جان ادا، مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، دہلی، 1985، ص 101)

فن موسیقی اور رقص ونغمگی کی متنوع اقسام کسی بھی قوم کی ثقافت کے بنیادی ستونوں میں شمار ہوتی ہیں۔ مختلف راگ راگنیوں، سروں وغیرہ میں ماہر شخص کو بڑی قدر کی نگاہوں سے دیکھا جاتا ہے۔ ہندوستانی سماج کی بیشتر غیر مذہبی تقریبوں میں موسیقی اور موسیقار ایک لازمی شے تصور کی جاتی ہے۔ لوگ ان پروگراموں سے بہت لطف لیتے ہیں۔ ناول امراؤ جان ادا کے اس اقتباس میں موسیقی اور موسیقی کے مختلف طور طریقوں سے متعلق کرداروں کے درمیان اس گفتگو کی بنیاد پہ بہ آسانی طے کیا جاسکتا ہے کہ یہ ناول ثقافتی بیانیہ کا ایک اہم نمونہ ہے۔

امراؤ جان ادا بظاہر ایک طوائف کی روداد ہے لیکن رسوا نے ایک طوائف کی زندگی کے آئینے میں لکھنؤ کی زوال پذیر معاشرت اور تہذیب وثقافت کی مرقع کشی کی ہے یہی وجہ ہے یہ کہانی محض ایک طوائف کی داستان نہیں بلکہ ایک عہد، ایک تہذیب وثقافت اور ایک زوال آمادہ معاشرے کی داستان ہے۔ ایک ایسی تہذیب اور معاشرہ جو خالص مشرقی ہے۔ یہ وہی تہذب وثقافت ہے جو ایران اور ہندوستان کی دو بڑی تہذیبوں کی آمیزش سے وجود میں آئی اور جسے ہند ایرانی کلچر کا نام دیا گیا۔ یہ وہی تہذیب ہے جسے مغلوں نے پروان چڑھایا جس کی مثال دلی کی مساجد، محلات اور قلعے، اور سب سے لاجواب مثال تاج محل ہے۔ مرزا رسوا کے سبھی ناولوں میں امراؤ جان کو اگر شاہ کار ناول مانا جاتا ہے تو اس کی سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ اس ناول میں قلم کار نے انیسویں صدی کے معاشرتی اور ثقافتی زوال کی عکاسی کی ہے

مرزا رسوا کے ناول 'امراؤ جان ادا' میں ثقافت کی عکاسی، نذیر احمد، عبدالحلیم شرر اور رتن ناتھ سرشار کے ناول سے کہیں زیادہ گہرائی سے کی گئی ہے۔ اس ناول میں اودھ یا لکھنؤ کے نوابوں، ثقافت کے زوال آمادہ رجحانات، معاشرے میں پھیلتی ہوئی بدامنی اور نراجیت میں نوابین کی عیش پرستی اور طوائفوں کی اٹھکیلیوں کے ساتھ ساتھ عام لوگوں کے مسائل کی ترجمانی بھی کہیں بلاواسطہ اور کہیں بالواسطہ طور پر کی گئی۔ چونکہ اس ناول میں مرکزی کردار 'امراؤ جان' ایک طوائف ہے جس کے ارد گرد طوائف کلچر کے سارے لوازمات موجود ہیں۔ اس لیے ان لوازمات کے حوالے سے مرزا رسوا نے اودھ کی، اس عہد کی ثقافت کی جیتی جاگتی تصویریں پیش کی ہیں۔ امراؤ جان میں میلوں ٹھیلوں، مشاعروں امام باڑوں اور مجروں، منچلے عاشقوں اور پیشہ ور عیاشوں کی مکاریوں اور چالاکیوں کو مختلف کرداروں اور ان سے وابستہ واقعات کے حوالے سے جس طرح پیش کیا گیا ہے، وہ ثقافتی عکاسی کی بہترین مثال ہے اور اس بنیاد پر ناول 'امراؤ جان ادا' کو ایک ثقافتی بیانیہ بھی کہا جاسکتا ہے۔ کیونکہ لکھنؤ میں طوائف زندگی کے تمام شعبوں پر چھائی ہوئی تھی۔ مثال کے طور پر خانم کا کوٹھا پوری لکھنوی تہذیب وثقافت کا ادارہ تھا۔ حد تو یہ ہے کہ مذہبی رسوم کی ادائیگی بھی طوائف کے بغیر پوری نہیں ہوتی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ طوائف کی زندگی میں دینداری کا پہلو بھی نظر آتا ہے۔ بقول امراؤ جان ادا:

''خانم کی تعزیہ داری تمام شہر کی رنڈیوں سے بڑھ چڑھ کے تھی۔ امام باڑہ میں ٹیکے، شیشہ آلات جو شے تھی نادر تھی۔ عشرہ محرم میں دس روز تک مجلس ہوتی تھی۔ عاشورہ کے دن سیکڑوں محتاج مومنین کی فاقہ کشی کی جاتی تھی چہلم تک ہر جمعرات کو مجلس ہوتی تھی۔''

(مرزا محمد ہادی رسوا: اُمراؤ جان ادا، مکتبہ جامعہ لمٹیڈ، دہلی، 1985، ص 107)

مختصر یہ کہ امراؤ جان ادا ایک ایسی طوائف ہے کہ جس کی زندگی کے واقعات میں اس عہد کی لکھنوی تہذیب دیکھی جا سکتی ہے۔ نوابوں اور رئیسوں کی عیاشی نے ہزاروں طوائف پیدا کیے۔ امراؤ جان ادا بھی ان میں سے ایک تھی جس کا کوٹھا تہذیب و ثقافت اور تمدن اور علم وادب کا ادارہ تھا۔ مرزا رسوا کا یہ کمال فن ہے کہ انھوں نے اپنے کردار امراؤ جان ادا کی زبانی لکھنؤ کی زوال آمادہ تہذیب وثقافت کی حسین مرقع کشی کی ہے۔

■

Javed Ahmad Najjar
Research Scholar, Dept of Urdu
Kashmir University
Kashmir- 190006 (J&K)
Mob.:6005873001

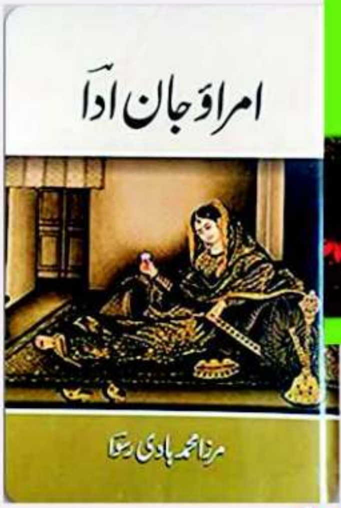

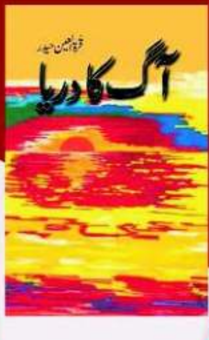

ناول نگاری میں کردار

محمد طارق

ناول میں کردار کی بڑی اہمیت ہے اور کردار ناول میں ریڑھ کی ہڈی کا کام کرتے ہیں۔ واقعات کا تسلسل کردار پر ہی ہوتا ہے۔

کردار کے متعلق یہ کہا جاتا ہے کہ بہتر کردار وہ ہے جس کے اندر حقیقت ہو، واقعیت ہو اور عام انسانوں کی طرح زندگی کی تبدیلیوں سے دوچار ہو۔ اس کے جذبات و احساسات بھی عام انسانوں کی طرح ہوں۔ اس سلسلے میں ڈاکٹر احسن فاروقی لکھتے ہیں کہ:

''حقیقت یہ ہے کہ کردار کسی بھی قسم کے ہوں ان میں زندگی کا ہونا ضروری ہے۔ ان میں ایک صفت ہو یا کسی خاص صفت کے مجسمے یا اشارے ہوں تو ضروری ہے کہ ان کی یہ صفت اس طرح نمایاں کی جائے کہ وہ ہمارے دلوں کو اپنی طرف کھینچے اور ان کی حرکات اور بات چیت وغیرہ سے ہمیں یہی ظاہر ہو کہ وہ جیتے جاگتے انسانوں کی طرح ہیں۔''

(ناول کیا ہے: ڈاکٹر احسن فاروقی، نسیم بک ڈپو لکھنؤ 1965، ص 28)

ناول میں کردار چونکہ علامتی حیثیت رکھتا ہے اس لیے وہ مختلف طبقات، مزاج، ذوق وشوق اور مختلف ذہنوں کی نمائندگی کرتا ہے۔ گویا ناول نگار اپنی زندگی کی تلخ و شیریں یادوں اور تجربات و مشاہدات کے دریا کو کرداروں کے کوزے میں سمو کر ناول کی صورت میں پیش کرتا ہے اور ان کرداروں کی ذہنی کشمکش کو قاری کے سامنے پیش کرکے اپنی بات کو کسی حد تک منوانے کی کوشش کرتا ہے جو فنکار کا اصل مقصد بھی ہوتا ہے۔ اس سلسلے میں ڈاکٹر زینت بشیر اپنی کتاب 'نذیر احمد کے ناولوں میں نسوانی کردار' مارٹن ٹرنل کی کتاب کا ایک اقتباس نقل کرتے ہوئے لکھتی ہیں کہ:

''کردار ایک تخیلی پیکر ہوتا ہے جس کا وجود کتاب سے باہر نہیں ہوتا۔ یہ ناول نگار کی دانش کے اظہار کا وسیلہ ہے اور اس کی اہمیت مصنف کے افکار پر بھی منحصر ہے۔ حقیقت میں ناول ایک خیالی کہانی کا خاکہ ہوتا ہے جس میں مختلف کردار اپنا رول ادا کرتے ہیں اور قاری کا یہ تجربہ ہے کہ اس کا پورا نقش اس کے جذبات واحساسات پر ربط پیدا کرتا ہے۔''

(نذیر احمد کے ناولوں میں نسوانی کردار، ڈاکٹر زینت بشیر، اعجاز پرنٹنگ پریس، حیدرآباد 1991، ص 125)

ناول انسانی زندگی کا آئینہ ہوتا ہے اس لیے ناول میں موجود تمام کردار بھی قریب قریب انسانی معاشرے کے افراد ہوتے ہیں۔ لہٰذا کردار کا تعلق انسان کے حرکات وسکنات اور اقوال واعمال سے ہوتا ہے کیونکہ انسان جب پیدا ہوتا ہے تو آئینے کی طرح صاف شفاف اور سادہ دل ہوتا ہے۔ لیکن وہ جس ماحول میں آنکھ کھولتا ہے اور جہاں اس کی پرورش ہوتی ہے وہاں کے اچھے اور برے اثرات فطری طور پر اس پر مرتب ہوتے ہیں، گویا انسان کا کردار اس کے حالات سے تشکیل پاتا ہے بلکہ اس کی اچھائی یا برائی اس کے اعمال پر منحصر ہوتی ہے۔ انسانی زندگی میں کوئی بھی کردار نہ تو خالص فرشتہ صفت ہوتا ہے اور نہ ہی شیطان۔ لہٰذا فنکار کی کامیابی کا ثمرہ وہی کردار بنتے ہیں جن میں زندگی کی حرارت بدرجہ اتم موجود ہوتی ہے اور جو حقیقی زندگی کی بھرپور ترجمانی کرتے ہیں۔ ناول کے کردار داستانی کرداروں کے مقابلے میں زیادہ متحرک ہوتے ہیں کیونکہ ناول کے کرداروں میں انسانی عادت واطوار پائے جاتے ہیں لہٰذا ان کرداروں سے قاری کو زیادہ دلچسپی ہوتی ہے اور وہ ان کرداروں کے المیے اور نشاط انگیز پہلوؤں سے بھی متاثر ہوتا ہے۔ اس سلسلے میں سہیل بخاری لکھتے ہیں کہ:

''ہمیں صرف انھیں کرداروں سے ہمدردی ہوگی جو ہماری طرح دکھ سکھ کا تجربہ کرتے ہیں۔ ہماری طرح جیتے ہیں اور ہماری طرح مرتے ہیں۔ انسان نہ صرف فرشتہ ہوتا ہے اور نہ صرف شیطان وہ ان دونوں کا مرکب یعنی انسان ہوتا ہے۔ جس طرح محض نیک انسان کا ملنا محال ہے اسی طرح محض بد انسان کا ہاتھ آنا بھی ناممکن ہے۔ چنانچہ ہم کو صرف انھیں کرداروں سے دلچسپی ہوسکتی ہے جو ہماری شبیہ پر بنائے گئے ہوں۔''

(اردو ناول نگاری، سہیل بخاری، ص 66-62)

ناول میں قصے کو انسانی کرداروں کے ذریعے آگے

ناول انسانی زندگی کا آئینہ ہوتا ہے اس لیے ناول میں موجود تمام کردار بھی قریب قریب انسانی معاشرے کے افراد ہوتے ہیں۔ لھٰذا کردار کا تعلق انسان کے حرکات و سکنات اور اقوال و اعمال سے ہوتا ہے کیونکہ انسان جب پیدا ہوتا ہے تو آئینے کی طرح صاف شفاف اور سادہ دل ہوتا ہے۔

> ”سپاٹ کرداروں کا افادی پہلو یہ ہے کہ قاری ان کو بعد تک بآسانی یاد رکھتا ہے،اور اس کے ذہن میں ناقابلِ تغیر کردار کی حیثیت سے اس وجہ سے محفوظ رہتے ہیں کہ حالات سے اثر قبول کرکے ان میں کوئی تبدیلی واقع نہیں ہوتی، وہ حالات کی گردش کے ساتھ حرکت کرتے رہتے ہیں جو ماضی پر نظر کرتے ہوئے ان میں آسودگی بخش خصوصیت پیدا کردیتی ہے اور وہ اپنے جنم دینے والے ناول کے زوال کے بعد بھی اپنا وجود باقی رکھتے ہیں۔“

بڑھایا جاتا ہے۔جب کہ دیگر جاندار بھی قصّے کہانی کی دنیا سے الگ نہیں ہیں لیکن ان کی حیثیت یا تو علامت کی ہے یا پھر وہ انسانی کرداروں کا بدل ہیں۔ اس لیے ایسے کرداروں سے قاری بہت کم متعارف ہوتا ہے۔ بقول ابوالکلام قاسمی:

”عام طور پر کہانی میں انسانی کرداروں کا یہ وجود ہوتا ہے۔لیکن کہانی میں بعض حیوانی کرداروں کو بھی پیش کیا گیا ہے۔مگر ایسا بہت محدود کامیابی کے ساتھ ہوا ہے اس لیے کہ ان کی نفسیات کے متعلق ہماری معلومات بہت کم ہیں۔کسی کہانی کے کردار انسان یا انسان نما ہی ہوتے ہیں۔“ (ناول کا فن، ترجمہ ابوالکلام قاسمی، ایجوکیشنل بک ہاؤس، 2001، ص 24-25)

ناقدین نے کردار نگاری کے سلسلے میں کچھ اصول طے کیے ہیں تا کہ اس کو بہتر اور موثر انداز میں پیش کیا جا سکے۔مثلاً کردار کے احوال واقوال میں تضاد اور تصورات زندگی اور اعتقاد میں کشمکش نہ ہو۔اس کے علاوہ اگر کردار کے خیالات میں تبدیلی پیدا ہوگئی ہو تو اس کے سماجی یا غیر سماجی اسباب بھی ضروری ہیں مثال کے طور پر اگر کوئی کردار ابتدا میں دیانتدار اور روایت کا پابند ہے اور پھر بعد میں اچانک بددیانت ہو جاتا ہے تو اس کی تبدیلی میں اہم موڑ کی نشاندہی بھی ہونی چاہیے اس سے ناول زیادہ موثر، دلچسپ اور رنگین ہو جاتا ہے۔دوسرے الفاظ میں یوں کہہ سکتے ہیں کہ کرداروں کی تخلیق میں ان کے ابتدائی مدارج، سماجی حیثیت اور اس زمانے کے تمام اداروں سے اس کا تعلق اور پھر اس کی کارکردگی وغیرہ کا بیان ضروری ہے۔جس سے اس کی ہوش مندی کا اندازہ لگ جاتا ہے۔ کرداروں کو عام طور پر دو حصوں میں تقسیم کرتے ہیں جن میں پہلا سادہ یا سپاٹ کردار اور دوسرا پیچیدہ یا مکمل کردار۔

سپاٹ کرداروں کے متعلق یہ خیال کیا جاتا ہے کہ یہ کردار چار صدی قبل محض تفریحی کردار کے نام سے جانے جاتے تھے لیکن موجودہ صدی میں یہ کردار مثالی کردار کے نام سے منسوب ہیں۔ یہ کردار کسی ایک صفت کے مالک ہوتے ہیں اس قسم کے کردار بالکل بے لطف اور بے جان ہوتے ہیں لیکن ایسے کردار قاری کے لیے بھلے ہی دلچسپ نہ ہوں مگر مقبولیت ضرور پاتے ہیں اور ساتھ ہی ناول نگار کی شہرت کا بھی باعث ہوتے ہیں۔اس سلسلے میں ابوالکلام قاسمی لکھتے ہیں:

”سپاٹ کرداروں کا افادی پہلو یہ ہے کہ قاری ان کو بعد تک بآسانی یاد رکھتا ہے۔اور اس کے ذہن میں ناقابلِ تغیر کردار کی حیثیت سے اس وجہ سے محفوظ رہتے ہیں کہ حالات سے اثر قبول کر کے ان میں کوئی تبدیلی واقع نہیں ہوتی۔ وہ حالات کی گردش کے ساتھ حرکت کرتے رہتے ہیں جو ماضی پر نظر کرتے ہوئے ان میں آسودگی بخش خصوصیت پیدا کردیتی ہے اور وہ اپنے جنم دینے والے ناول کے زوال کے بعد بھی اپنا وجود باقی رکھتے ہیں۔“ (ایضاً،ص 51)

پیچیدہ یا مکمل کردار زندگی کے تمام پہلوؤں کو پیش کرتے ہیں۔ایسے کردار گونا گوں خصوصیات کے مالک ہوتے ہیں۔ان کی دلچسپیاں اور مرغوبات مختلف ہونے کی وجہ سے قاری ان کی نفسیات کو جاننے میں زیادہ دلچسپی لیتا ہے اور یہ کردار ایسی قدروں کی نمائندگی کرتے ہیں جو ہماری زندگی میں وقتاً فوقتاً ملتی ہیں۔ یہ کردار زمانے کے ساتھ ساتھ چلتے ہیں اور حالات وواقعات کی مناسبت سے اثر قبول کرتے ہیں۔ ان کرداروں سے قاری کی دلچسپی بڑھ جاتی ہے ساتھ ہی یہ کردار قاری پر گہرا اور دیرپا اثر بھی چھوڑتے ہیں یہی وجہ ہے کہ ہر اعتبار سے پیچیدہ یا تہہ دار کرداروں کو ناول میں عبور حاصل ہے۔بقول ڈاکٹر احسن فاروقی۔

”مکمل کردار انہی کو کہا جاسکتا ہے جو متعدد انسانی خصوصیات رکھتے ہیں اور ساتھ ہی ساتھ انفرادی خصوصیات بھی۔“ (ناول کیا ہے،ص 27)

بہرحال کردار سادہ ہوں یا مکمل ناول میں کردار نگاری بے حد ضروری ہے۔کیونکہ کردار انسان یا انسان نما ہوتے ہیں ان میں زندگی ہوتی ہے چاہے وہ کسی ایک صفت کے مالک ہوں یا پھر کئی صفت کے۔ ناول میں کرداروں کے ارتقا کو بھی ذہن میں رکھنا بے حد ضروری ہے کیونکہ کردار نگاری کو کامیاب بنانے میں کردار ہی معاون ثابت ہوتے ہیں۔ لہٰذا کرداروں کو ناول میں مختلف منزلوں سے گزرتے ہوئے دکھایا جائے اور ساتھ ہی وہ کردار کھلی ہوا میں سانس لینے والے ہوں مگر افسوس اکثر اس چیز کی کمی کئی ایک ناول نگار کے یہاں دکھائی دیتی ہے۔ ان میں ڈپٹی نذیر احمد جو باضابطہ طور پر پہلے ناول نگار تسلیم کیے گئے ہیں ان کے کرداروں میں بھی عام طور سے فکری نشوونما کی کمی دیکھائی دیتی ہے۔شاید یہی وجہ ہے کہ ان کے ناول میں کردار ایک مجسمے کی صورت میں نظر آتے ہیں۔مثال کے طور پر نذیر احمد نے اپنے مشہور ناول مراۃ العروس میں دو مرکزی کردار 'اکبری' اور 'اصغری' کا خاکہ اصلاحی نقطے سے پیش کیا ہے۔اکبری اور اصغری مراۃ العروس ناول کے اہم ترین کردار ہیں اکبری پھوہڑپن، بدمزاجی، بے عملی اور بدعقلی کا نمونہ ہے اس کے برخلاف اصغری تعلیم یافتہ، مذہبی، ہنر مند اور ایک شائستہ نسوانی کردار ہے۔خود نذیر احمد اصغری کے متعلق یوں لکھتے ہیں:

”چار گھڑی رات گئے کھانے پینے سے فارغ ہوئے اصغری نے برتن بھانڈا گری پڑی چیز ٹھکانے سے رکھیں باہر کے دروازے کو قفل لگا کر کھینچا ماں کے حوالے کیں۔ باہر کے دالان اور باورچی خانے کا چراغ غل کیا اور اطمینان سے سو رہی۔“ (مراۃ العروس، ڈپٹی نذیر احمد، ص 57-58)

رتن ناتھ سرشار اردو کے بڑے مشہور ناول نگار ہیں جنھوں نے ناول نگاری کی روایت کو آگے بڑھایا ہے۔ ناول فسانہ آزاد ان کا ایک بڑا ادبی کارنامہ ہے۔

> ”ڈپٹی نذیر احمد نے اپنے مشہور ناول مراۃ العروس میں دو مرکزی کردار 'اکبری' اور 'اصغری' کا خاکہ اصلاحی نقطے سے پیش کیا ہے۔اکبری اور اصغری مراۃ العروس ناول کے اہم ترین کردار ہیں اکبری پھوہڑپن، بدمزاجی، بے عملی اور بدعقلی کا نمونہ ہے اس کے برخلاف اصغری تعلیم یافتہ، مذہبی، ہنر مند اور ایک شائستہ نسوانی کردار ہے۔“

اس ناول میں نسوانی اور غیر نسوانی دونوں کردار موجود ہیں۔ان میں بیشتر کردار داستانی رنگ میں ڈوبے ہوئے نظر آتے ہیں لیکن اس کے باوجود یہ کردار اپنی شخصیت منواتے ہیں۔گویا مصنف نے قاری اور کرداروں کے بیچ کی دوری کو ختم کر دیا جس کی وجہ سے قاری اپنے آپ کو اکیلا محسوس نہیں کرتا۔ساتھ ہی وہ کرداروں کے ہنسی مذاق اور ان کے غم اور خوشی میں برابر کا شریک نظر آتا ہے۔بقول وقار عظیم:

''کرداروں کی چھوٹی بڑی کوئی بات ایسی نہیں جو قاری کی نظر سے چھپی ہوئی ہو۔وہ اس کی ہر اچھائی برائی میں اس کا ہم راز و ہمدم ہے۔رقص و سرود کی محفل میں شعر وشاعری کی بزموں میں دونوں سر سے سر جوڑ کر اور شانے سے شانہ ملا کر بیٹھتے ہیں ہنسی مذاق فقرے بازی۔ ہر چیز میں بے تکلفی کے روابط قائم رکھتے ہیں۔''

(اردو ناول کا ارتقا: وقار عظیم،ص 24)

مرزا ہادی رسوا کا نام ایک ناول نگار کی حیثیت سے ہمیشہ زندہ رہے گا۔'امراو جان ادا' ان کا لازوال اور شاہکار ناول ہے۔یہ ایک ایسی لڑکی کی داستان ہے جو ایک قصبے سے اغوا کر کے لکھنؤ کے ایک کوٹھے پر طوائف کے ہاتھ بیچ دی گئی اور اس کی زندگی ایک عجیب کشمکش میں گزری لیکن یہاں مصنف کا منشا صرف طوائف کی زندگی کو پیش کرنا نہیں تھا بلکہ پورے معاشرے کی عکاسی کرنا تھا جو زوال پذیر ہو چکا تھا۔

کردار نگاری میں مرزا ہادی رسوا کے قلم نے جادوگری کا کمال دکھایا ہے۔اس ناول کا مرکزی کردار امراو جان ہے۔امراو جان ادا کے سلسلے میں بعض ناقدین کا یہ خیال ہے کہ یہ ایک نفسیاتی ناول ہے کیونکہ اس میں ناول نگار نے کرداروں کی داخلی کیفیت احساس و جذبات کا گہرائی سے مطالعہ کیا ہے۔خود امراو جان کا کردار اس کی بہترین مثال ہے۔

پریم چند نے اردو میں بے شمار ناول لکھے ہیں ان کے ناولوں کا سفر 'ہم خرما و ہم ثواب' سے لے کر 'منگل سوتر' تک پھیلا ہوا ہے۔ پریم چند نے اپنے کرداروں کے ساتھ پوری رواداری برتی ہے۔حتیٰ کہ بعض جگہ ان کی اصول پرستی ان کے کرداروں کے ارتقا میں حائل ہو جاتی ہے پھر بھی ان کے کرداروں میں حرکت دکھائی دیتی ہے۔ پریم چند نے اپنے کرداروں کے انتخاب میں زندگی کے مختلف پہلوؤں کو پیش نظر رکھا ہے۔بقول سہیل بخاری:

''ان کے کردار عام انسانوں کے جیتے جاگتے نمونے ہوتے ہیں۔جن سے ہم قریب قریب روزانہ ملتے رہتے ہیں۔ان میں کوئی اجنبیت نہیں پاتے ان کے صرف وہی کردار غیر فطری ہوتے ہیں جن کے اصول ضرورت سے زیادہ بلند ہوتے ہیں۔وہ واقعات کے آگے سر تسلیم خم نہیں کرتے لیکن بے موقع ان کی مثالیت پسندی اور اصول پرستی بھی انھیں غیر فطری بنا دیتی ہے اور پھر پوری فضا مصنوعی نظر آنے لگتی ہے۔

(اردو ناول نگاری: سہیل بخاری الحمرا، پبلشرز دہلی 1972، ص 99)

عصمت چغتائی کو اردو ناول نگاری میں ایک انفرادی مقام حاصل ہے۔ان کی شخصیت اردو ادب کے لیے باعث ناز ہے۔انھوں نے اپنے فن پارے کو پیش کرنے کے لیے حق گوئی سے کام لیا ہے اسی لیے وہ سماج میں پھیلی ہوئی گندگی، غلط رسم و رواج اور تمام دوسری برائی کو اخلاقی پابندیوں سے بے نیاز ہو کر سچ بات کو پیش کرنے میں کسی قسم کی جھجھک محسوس نہیں کرتے ہیں۔عصمت چغتائی کے کرداروں میں نفسیاتی پہلو بھی نمایاں ہیں۔ان کے ناولوں کے زیادہ تر کردار نفسیاتی ہیں۔ٹیڑھی لکیر ان کا ایسا ناول ہے جس میں نفسیاتی پہلو کو کھل کر پیش کیا گیا ہے۔

ٹیڑھی لکیر کرداری ناول ہے اس میں زیادہ توجہ ایک ہی کردار پر صرف کی گئی ہے جو شمن کا ہے۔باقی تمام کردار اسی ایک کردار یعنی شمن کی شخصیت کی تکمیل کی خاطر لائے گئے ہیں۔عصمت چغتائی نے جس قدر تفصیل کے ساتھ شمن کی شخصیت کے تمام پہلوؤں کو اُجاگر کیا ہے اردو ناول میں اس کی دوسری مثال نہیں ملتی۔شمن کے ہر عمل کو بیان کرتے ہوئے جس طرح اس کی نفسیات کا تجزیہ کیا گیا وہ اردو ناول نگاری میں ایک بڑا کارنامہ ہے۔

قرۃ العین حیدر اعلیٰ ذہنیت کی مالک ہیں ان کے فن میں انفرادیت اور رچاؤ ہے۔وہ نئے موضوعات اور نئے تجربات سے اپنے فن کو مالا مال کر دیتی ہیں۔ان کے یہاں موضوعات کی وسعت کے ساتھ ساتھ تکنیک کے نئے تجربات بھی ملتے ہیں۔قرۃ العین حیدر کے فن کی انفرادیت کا امتیازی پہلو جو قاری کو متاثر کرتا ہے وہ ان کا خوبصورت اور رواں دواں نثری اسلوب ہے۔اس میں چستی، تہہ داری اور تنوع موجود ہے۔قرۃ العین حیدر کے ناولوں کا ایک اور کارنامہ ان کی کردار سازی ہے۔کردار سازی میں انھوں نے نہ صرف یہ کہ نئی تکنیک کا استعمال کیا بلکہ اپنے کرداروں کو ایک نئے سماجی اور تہذیبی تناظر میں پیش کیا ہے۔ان کرداروں میں نسوانی اور غیر نسوانی دونوں ہیں۔نسوانی کرداروں کو جس محنت اور مہارت سے پیش کیا ہے یہ قرۃ العین حیدر کا ایک بڑا کارنامہ ہے۔ان میں 'میرے بھی صنم خانے' کی رخشندہ،' آگ کا دریا' کی چمپا، 'آخر شب کے ہمسفر' کی دیپالی سرکار اور سیتا ہرن کی سیتا

قرۃ العین حیدر نے اپنے فکشن میں مغربی ناولوں کی نئی تکنیک کے کامیاب تجربے کیے ہیں چنانچہ فطری طور پر کردار نگاری کا پرانا تصور ان کے یہاں نہیں ملتا ہے۔کیونکہ کرداروں کے بغیر کسی کہانی کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا اور کردار ہی قصے کو جنم دیتے ہیں اس لیے ان کے ناولوں میں اس عنصر کا استعمال بھی اپنے خاص تخلیقی ڈھنگ سے نظر آتا ہے۔

میر چندانی ایسے لازوال شاہکار ہیں جن کا کئی پہلوؤں سے مطالعہ کیا جا سکتا ہے۔

قرۃ العین حیدر نے اپنے فکشن میں مغربی ناولوں کی نئی تکنیک کے کامیاب تجربے کیے ہیں چنانچہ فطری طور پر کردار نگاری کا پرانا تصور ان کے یہاں نہیں ملتا ہے۔کیونکہ کرداروں کے بغیر کسی کہانی کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا اور کردار ہی قصے کو جنم دیتے ہیں اس لیے ان کے ناولوں میں اس عنصر کا استعمال بھی اپنے خاص تخلیقی ڈھنگ سے نظر آتا ہے۔بقول وقار عظیم:

''اردو کے ناول نگاروں میں قرۃ العین حیدر نے تکنیک کے اس مغربی انداز کو اپنایا اور اس کے عناصر کو بڑی خوبی سے مشرقی روایت میں سمویا ہے، ان کے ناولوں کے فن ناول نگاری کی اس جدید دور کا بڑا کامیاب نمونہ ہے جس میں واقعات اور ان کے ارتقا سے زیادہ فرد کی زندگی اور اس کی ذہنی و جذباتی کیفیتوں کے بیان کو کہانی سمجھا جاتا ہے۔''

(حوالہ: داستان سے افسانے تک، وقار عظیم ص 31-130)

میرے بھی صنم خانے میں کردار نگاری ترقی پسند انداز میں نظر آتی ہے اس ناول کے کرداروں کا اپنا ایک الگ رنگ اور انفرادی پہلو ہے جن سے وہ کبھی نہیں ہٹتے۔ناول سفینۂ غم دل کے کردار بھی میرے بھی صنم خانے کے کرداروں کی طرح ہیں۔چونکہ ان کی تراش خراش بھی اسی نہج پر کی گئی ہے۔اس ناول کے سارے ہی کردار ناول نگار کے ذہن کے آئیڈیل پیداوار معلوم ہوتے ہیں۔جن میں ذہانت کے عنصر موجود ہیں۔لیکن ناول کے کینوس پر ان کی ذہانت کا احساس نہیں ہوتا۔

Dr. Mohd Tariq
Dept. of Urdu,AMU
Aligarh- 202001 (UP)
Email.: roomisir786@gmail.com

رضوان احمد

اردو افسانوں میں ہجرت، تنہائی اور قدروں کی شکست وریخت

ہجرت کا کرب بھی جدید اردو افسانے کا ایک اہم موضوع ہے۔ دراصل اس ہجرت کے کرب میں اپنی مٹی سے جڑاؤ اور جذباتی وابستگی کا عنصر بہت نمایاں ہے۔ اس تعلق سے منٹو، بیدی، احمد ندیم قاسمی، قرۃ العین حیدر، رام لعل، انتظار حسین، سید محمد اشرف وغیرہ کے افسانے قابل ذکر ہیں۔ دراصل ان افسانہ نگاروں نے ہجرت کی مختلف نوعیتوں کے حوالے سے افسانے لکھے ہیں۔ ان میں اختیاری اور جبری ہجرت شامل ہیں۔ ہجرت بنیادی طور پر انسان کو بے جڑ ہونے کا احساس دلاتی ہے جب کوئی فرد اپنے وطن سے بچھڑ جاتا ہے دوسرے شہر اور ملک میں آباد ہوتا ہے تو اسے وطن کی یاد بہت ستاتی ہے۔ تاریخ کا مطالعہ کیا جائے تو بہت سی قوموں نے ہجرت کی ہے اور ہجرت کے کرب کو برداشت کیا ہے۔ معاشی اور اقتصادی ضرورتیں بھی ہجرت پر مجبور کرتی ہیں۔ کبھی کبھی مذہبی اور نظریاتی اختلافات بھی ہجرت کا سبب بن جاتے ہیں۔ اور کبھی کبھی آفات ارضی اور سماوی کی وجہ سے بھی ہجرت کرنا پڑتی ہے۔ اس ہجرت کے انسانی ذہن اور نفسیات پر جو اثرات مرتب ہوتے ہیں اس کی عکاسی افسانہ نگاروں نے کی ہے۔ دراصل ایک مہاجر بہت سارے تضادات اور تصادم کی کیفیت سے گزرتا ہے اور اس کے اندر خوف، تنہائی اور اجنبیت کی کیفیت جنم لیتی ہے۔ شبانہ خاتون نے ہجرت کے حوالے بہت اہم بات لکھی ہیں:

''ہجرت کوئی سیدھا سادہ عمل نہیں ہے بلکہ ایک پیچیدہ تجربے کا عمل ہوتا ہے۔ ایک شخص جب ایک مقام سے دوسری جگہ ہجرت کرتا ہے تو سب سے پہلے وہ ثقافتوں اور تہذیبوں کے درمیان تضاد اور تصادم کی صورت حال سے دوچار ہوتا ہے۔ پہلے اس کی اپنی ثقافت ہوتی ہے جو پسند وناپسند سے قطع نظر، لاشعوری طور سے اس کے احساسات، جذبات اور تحت الشعور میں جاگزیں رہتی ہیں۔ اور دوسری وہ نئی ثقافت جس سے اسے نیا واسطہ پڑتا ہے۔ دو ثقافتوں اور دو تہذیبی رویوں کا یہی تضاد اس کی شخصیت اور کردار میں مختلف رنگوں اور شکلوں میں ظاہر ہوتا ہے۔''

(شبانہ خاتون: خالد سہیل 'فن اور فنکار' حلقۂ ادب وثقافت، مئوناتھ بھنجن 2013، ص 85)

قرۃ العین حیدر کا افسانہ 'جلا وطن' میں بھی ہجرت سے پیدا ہونے والے کرب کا بیان ہے۔ کیونکہ ہجرت سے صرف آدمی بے گھر نہیں ہوتا بلکہ ایک اجنبیت اور بے گانگی کا احساس بھی جنم لیتا ہے۔ انتظار حسین کے بیشتر افسانوں میں ہجرت کو موضوع بنایا گیا ہے۔ ہجرت کا کرب اور احساس جن افسانوں میں شدت سے نمایاں ہے ان میں آم کا پیڑ، خرید و حلوہ بیسن کا، چوک، روپ نگر کی سواریاں، منزل مقصود، وہ جو کھو گئے، شہر افسوس، سیڑھیاں وغیرہ قابل ذکر ہیں۔

افسانہ 'شہر افسوس' ان کا سب سے کامیاب افسانہ ہے، جس میں انھوں نے اپنی زمین سے بچھڑنے کے دکھ اور کرب کو بڑے مؤثر انداز میں پیش کیا ہے۔ ان کے افسانے کا یہ اقتباس ملاحظہ فرمائیں:

''جولوگ اپنی زمین سے بچھڑ جاتے ہیں پھر کوئی زمین انھیں قبول نہیں کرتی۔ میں نے دیکھا اور یہ جانا کہ ہر زمین ظالم ہے...... جو زمین جنم دیتی ہے وہ بھی اور جو زمین دارالامان بنتی ہے وہ بھی...... اے لوگو کچھ بتاؤ کہ یہ کیسی بستی ہے اور اس پر کیا آفت ٹوٹی ہے کہ گھر قید خانہ بنے ہیں اور گلی کوچوں میں خاک اڑتی ہے۔ جواب ملا کہ اے کم نصیب تو شہر افسوس میں ہے...... تم وہی نہیں جو اس بستی کو دارالامان جان کر دور سے چل کر آئے اور یہاں بسر ہوگئے۔ انھوں نے کہا کہ اے شخص تو نے خوب پہچانا ہم انھیں خانہ بربادوں کے قبیلے سے ہیں، میں نے پوچھا کہ خانہ بربادو؟ تم نے دارالامان کو کیسا پایا؟ بولے کہ خدا کی قسم ہم نے اپنوں کے ظلم میں صبح کی۔'' (شہر افسوس: انتظار حسین)

رام لعل نے بھی ہجرت کے تعلق سے کئی افسانے لکھے ہیں اور انھوں نے چونکہ ہجرت کا کرب خود بھی جھیلا ہے اس لیے ان کے افسانوں میں وہ درد شدت سے واضح ہوتا ہے۔ اکھڑے ہوئے لوگ، ایسا ہی ایک افسانہ ہے جس میں انھوں نے مہاجر ہندو خاندان کی کہانی بیان کی ہے۔ یہ خاندان ہندوستان ہجرت کرتا ہے جسے ہر طرح کی سہولیات اور آسائشیں میسر ہیں پھر بھی اسے تنہائی کا احساس ہوتا ہے۔ مرکزی کردار بسین کی بیوی اس کرب کا اظہار کچھ یوں کرتی ہیں:

''یہ الگ بات ہے کہ بسین صاحب کبھی کبھی اموشنل ہوکر کہہ بیٹھتے ہیں کہ پتا نہیں کیوں یہ سب اپنا نہیں لگتا۔ جیسے یہ سب الیوژن ہو۔ میرا سب جو وہاں رہ گیا وہی اب میرے خوابوں میں آتا ہے۔ میں اب بھی کبھی کبھی اپنے بچپن کے دور میں جا پہنچتا ہوں۔ چھوٹی ہوئی گلیوں میں جا کر کھیلتا ہوں، بھاگتا ہوں اور کبھی کبھی اپنی سوگیہ ماں کو دیکھ کر اس کی گود میں سر رکھ دیتا ہوں۔''

(اکھڑے ہوئے لوگ: رام لعل)

رام لعل کا ایک اور افسانہ بھی ہجرت سے جڑی زندگی اور یادوں سے متعلق ہے۔ جس کا عنوان ہے 'ننھا خدا' اس افسانے کا ایک کردار کوٹی ہے جس کی بیلو سے دوستی ہو جاتی ہے۔ بیلو بھی اس سے پیار کرتی ہے کوٹی ہندوستان آجاتا ہے وہ بھی اپنے دوستوں کو بھلا نہیں پاتا بیلو بھی کوٹی کو نہ صرف یاد کرتی ہے بلکہ کوٹی کے خط کا انتظار کرتی رہتی ہے۔ اس افسانے کے اقتباس سے اس کی جذباتی کیفیت کا پتہ لگایا جا سکتا ہے:

''میرے پیارے کوٹی! تم مجھے ہر وقت یاد آتے ہو۔ ہر گھڑی کسی بھی وقت تمھیں بھول نہیں سکتی، تم مجھے کیوں بھول گئے ہو؟ دلی جا کر ایک خط بھی نہیں لکھا مجھے۔ میں ہر روز تمھارے خط کا انتظار کرتی ہوں کبھی کبھی رونے بیٹھ جاتی ہوں۔'' (ننھا خدا: رام لعل)

جوگندر پال کے افسانے 'گرین ہاؤس' میں بھی ایک مہاجر مول چند دھرم چند عرف مولو کی ہجرت کا بیان ہے اس کے پاس بہت دولت ہے لیکن وہ چین وسکون سے محروم ہے۔ کیونکہ وہ اپنے شہر کے چھوٹے سے محلے کو چھوڑ کر پہلے کینیا جاتا ہے اور پھر امریکہ جاتا ہے اس کے کرب کے حوالے سے اس افسانے کا تجزیہ کرتے ہوئے خاں شاہد وہاب نے لکھا ہے:

''اس کی زندگی کا سب سے بڑا خلا تو یہی ہے کہ اس کے پاس سب کچھ ہونے کے باوجود بھی گھر نہیں ہے۔ کیوں کہ گھر وہ ہوتا ہے جہاں ہمارا انتظار کیا جائے۔ وہ جس سفید فام عورت (کاغذات میں دونوں کا رشتہ میاں بیوی درج ہے) کے ساتھ ایک چھت کے نیچے شب وروز گزارتا ہے۔ وہ چھت گھر کیوں کر ہو سکتا ہے؟ مولو کی سفید فام بیوی اس کی جانکاری میں ہوتے ہوئے بھی غیر مردوں سے راہ ورسم رکھتی ہے اور مولو اس کے سوا کچھ نہیں سوچ پاتا ہے کہ ہمارے امریکی قانون کے تحت شوہروں کو اس کے سوا کوئی چارہ نہیں کہ انھیں (بیویوں) ان ہی کی ترجیحوں پر چھوڑ دیں اور اپنی ترجیحیں دریافت کریں، لیکن اپنی ترجیحیں دریافت کر کے جنسی جبلت تو پوری کی جاسکتی ہے، گھر بار نہیں بسایا جا سکتا۔''

(خان شاہد وہاب 'اردو فکشن میں ہجرت' ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی 2005، ص 121)

ہر چرن چاولہ نے بھی ہجرت اور مہاجر کے مسائل کو اپنے افسانوں کا موضوع بنایا ہے۔ مہاجروں پر کیا قیامت گزرتی ہے اسے اپنے افسانوں میں پیش کیا ہے۔ اس تعلق سے ان کا افسانہ 'گنگا کو واپسی' قابل ذکر ہے جس میں انھوں نے اس تہذیبی اجنبیت کو پیش کیا ہے جس سے ہر مہاجر کو گزرنا پڑتا ہے۔ اقتباس ملاحظہ فرمائیں:

''وقت گزرتا گیا۔ اسے لگتا جیسے اندر ہی اندر کچھ ٹوٹ پھوٹ رہا ہے۔ مگر وہ برداشت کرتا رہا۔ اس کی انگریز بہو اسے نام سے پکارتی تھی۔ صبح اٹھ کر دعا سلام اور نہ ہی چرن وندنا بلکہ ہیلو، گڈ مارننگ کہتی تھی اور اس کا آشیرواد دینے کو اٹھا ہوا ہاتھ ایک زخمی پرندے کی گردن کی طرح ایک طرف لڑھک جاتا تھا۔ بچہ جب ذرا بڑا ہوا تو وہ اسے اپنے ساتھ سلانا چاہتا تھا۔ اس کے اندر مذہبی رہنماؤں، دیش بھگتوں، جنگ آزادی کے شہیدوں اور جاں نثاروں کی کہانیاں تڑپتی تھیں مگر رات آٹھ بجتے ہی اس کی بہو منے کا ہاتھ پکڑ کر لہراتی، گڈ نائٹ پاپا کہتی اور اسے اس کے ایک پنگوڑے میں ڈال دیتی۔ دن کو بچہ چلڈرن ہوم میں بھیج دیا جاتا اور میاں بیوی دونوں کام پر نکل جاتے۔ سارا دن اکیلا گھر بھائیں بھائیں کرتا اسے کھانے کو دوڑتا محسوس ہوتا۔ ایک دن اس نے اپنی گیلری سے باہر پارک میں اپنے جیسے کچھ بڈھوں کو بنچوں پر بیٹھے اور گپیں مارتے دیکھا تو وہ بھی ان کے پاس جا بیٹھا مگر وہ کوئی ایسی زبان بولتے تھے جیسے ٹین کے ڈبے میں پڑے پتھر کوئی کھنکنا رہا ہو۔ وہ ان کی طرف ایک پلے کی طرح بے بس نظروں سے دیکھتا ایک بنچ پر اکیلا بیٹھا رہتا، تھکتا، اکتاتا، تنگ آجاتا تو اٹھ کر گھر پہنچ جاتا مگر بھائیں بھائیں کرتا گھر اسے کہتا، میرے اندر تمہارے لیے کوئی کام ہی نہیں اور اسے اپنے نکلے ہاتھ ایسے سن سے محسوس ہونے لگتے جیسے انھیں ٹھوہ مار گیا ہو۔'' (گنگا کی واپسی: ہرچرن چاؤلہ)

اس کے علاوہ 'گھوڑے کا کرب' اور 'جانے دو بھی' اسی موضوع پر ان کے اہم افسانے ہیں۔

سید محمد اشرف کا افسانہ 'ڈار سے بچھڑے' بھی ہجرت کے موضوع پر ایک اہم افسانہ ہے۔ اس افسانے میں انھوں نے مہاجرین کی ذہنی کیفیتوں اور اذیتوں کو نہایت ہی فنکارانہ ہنرمندی کے ساتھ پیش کیا ہے۔ اس افسانے کا یہ اقتباس ملاحظہ فرمائیں:

''اے غلام علی یہ جو تم نے پوچھا تھا کہ آپ یوپی کے تھے تو اس لفظ 'تھے' پر تم سے گھنٹوں بحث کر سکتا ہوں۔ کیا پاکستان آنے کے بعد میرا اس خطہ زمین سے کوئی ناطہ نہیں رہا جہاں میرے بچپن نے ممتا کی لوریاں سنی تھیں، جہاں میرے لڑکپن نے چھوٹے چھوٹے جذبوں سے محبت کرنا سیکھا تھا، جہاں میرے عقل وہوش کے بال وپر نکلے تھے۔'' (ڈار سے بچھڑے: سید محمد اشرف)

اجنبیت، تنہائی، اور زندگی کی لایعنیت بھی جدیدیت کے افسانوں کے اہم موضوعات میں سے ہیں۔ جدیدیت سے جڑے ہوئے افسانہ نگاروں کے یہاں اجنبیت اور تنہائی کے حوالے سے افسانے ملتے ہیں۔ جدید زندگی کی وجہ سے جو اجنبیت اور تنہائی انسانی زندگی میں داخل ہوگئی ہے اسے افسانہ نگاروں نے کرداروں کے ذریعے سے پیش کیا ہے۔ اجنبیت اور تنہائی کا انسانی زندگی پر کیا منفی اثر پڑا ہے اور اس کی وجہ سے ذہنی کیفیات اور احساسات میں کس نوع کی تبدیلیاں آئی ہیں ان کا بھی بیان ایسے افسانوں میں ملتا ہے۔ خالدہ حسین کا ایک افسانہ 'ہزار پایہ' ہے یہ افسانہ بھی اجنبیت اور تنہائی کے احساس کی عکاسی کرتا ہے یہ جدید دور کے انسان کا المیہ ہے کہ وہ ترقی کی دوڑ میں دوسروں سے آگے بڑھنے کی کوشش کرتا ہے مگر رفتہ رفتہ اسے محسوس ہوتا ہے کہ ساری چیزیں جس کے لیے وہ کوشش کر رہا ہے اجنبی ہیں اور آخر میں اس کا انکشاف ہوتا ہے کہ انسان ایک ڈھانچہ ہے اور فنا ہی اصل حقیقت ہے۔ اسی طرح مسعود اشعر کی ایک کہانی ہے ''خاموش'' یہاں خاموشی موت کی ایک علامت ہے اس کہانی کا جو کردار ہے وہ ایک شور میں اپنی پوری زندگی بسر کرتا ہے اور اس کردار کو اپنی بے معنویت کا احساس ہونے لگتا ہے اور وہ بے عملی، عدم تحفظ اور اجنبیت کا شکار ہو جاتا ہے۔ اقبال مجید کا افسانہ 'حلفیہ بیان' بھی اسی اجنبیت اور تنہائی سے متعلق ہے ایک کیڑے کی حرکات وسکنات سے ایک کہانی بنتی ہے۔ کہانی کچھ یوں ہے کہ برسات کی اندھیری رات ہوتی ہے اور ایک بدشکل، بدنما کالا کیڑا ٹیوب لائٹ کی روشنی دیکھ کر کمرے میں داخل ہوتا ہے۔ کچھ دیر تک اس کے بھنبھنانے کی آواز سنائی دیتی ہے اور وہ کیڑا چکنے فرش پر پیٹھ کے بل گر جاتا ہے اور سیدھا ہونے کی کوشش کرتا ہے اسی لمحے افسانہ نگار کے پیر کی دھمک سن کر کیڑا پیر چلانے کا عمل روک دیتا ہے اور مردہ ہونے کا ناٹک کرتا ہے۔ اس افسانے میں یہ بیان کیا گیا ہے کہ آج کا انسان لایعنی صورت حال کا شکار ہے اور بے سمتی کے احساس سے دوچار ہے اور یہی بے سمتی انسان کو زندگی کی بے معنویت کا احساس دلا رہی ہے۔

سریندر پرکاش کے افسانے 'دوسرے آدمی کا ڈرائنگ روم' میں بھی انسان کی بے حسی، اجنبیت اور اس کے وجود کے اندر پیدا ہونے والے خلا کو پیش کیا گیا ہے۔ معاشرے میں رہ کر انسان بھی اپنے آپ کو اجنبی محسوس کرتا ہے اس کو اپنا وجود بے معنی لگتا ہے۔ 'رونے کی آواز' بھی اسی نوع کا افسانہ ہے جس میں یہ بتایا گیا ہے کہ صنعتی تہذیب نے اس کے تہذیبی ورثے اور پرانی قدروں کو چھین لیا ہے۔ اس کا کوئی ہمدرد اور چارہ ساز نہیں اسی لیے وہ اندر سے اتنا ٹوٹ گیا ہے کہ اس کے رونے کی آواز بھی اس کے اندر ہی گھٹ گھٹ کر رہ گئی ہے۔ اس افسانے میں سرسوتی اور لکشمی کے ذریعے یہ بتایا گیا ہے کہ آج کے عہد میں لکشمی سرسوتی پر غالب آ گئی ہے ہر جگہ لکشمی کی پوجا ہو رہی ہے اور سرسوتی سیڑھیوں پر بلک بلک کر رونے پر مجبور ہو گئی ہے ایک اقتباس ملاحظہ کیجیے:

''بات دراصل یہ ہے''، میں نے اس کے قریب ہوتے ہوئے کہا، ''ہماری بلڈنگ کے اوپر والی منزل میں ایک وشنو بابو رہتے ہیں۔ وہ اس بلڈنگ کے مالک بھی ہیں۔ ہم سب ان کے کرایے دار ہیں۔ بہت سال پہلے جب وہ بالکل معمولی آدمی تھے تو انھوں نے ایک لڑکی سے شادی کی تھی۔ جس کا نام 'سرسوتی' ہے۔ پھر اچانک وشنو بابو ایک مالدار عورت 'لکشمی' سے ٹکرا گئے۔ تب انھیں اپنی غلطی کا احساس ہوا اور انھوں نے 'لکشمی' سے اپنا دوسرا بیاہ رچا لیا۔ اب لکشمی اور وشنو دونوں آرام سے زندگی بسر کرتے ہیں اور بے چاری 'سرسوتی' رات رات بھر سیڑھیوں پر بیٹھی روتی رہتی ہے۔ اسی ہنگامے کی وجہ سے میں ابھی تک طے نہیں کر پایا کہ مجھے کسی سرسوتی سے شادی کرنی چاہیے تھی یا کسی لکشمی سے!'' (رونے کی آواز: سریندر پرکاش)

انور خاں کا افسانہ 'شام اور رنگ' میں بھی اسی تنہائی اور اجنبیت کا بیان ہے۔ جدیدیت پر زیادہ تر افسانوں میں تنہائی اور اجنبیت کی بہت ہی فنکارانہ انداز میں عکاسی کی گئی ہے۔ آج بھی اسی نوع کے افسانے لکھے جا رہے ہیں جن میں تنہائی کو ایک مرکزی موضوع کی حیثیت حاصل ہے۔

قدروں کی شکست وریخت کے حوالے سے بھی جدیدیت کے افسانہ نگاروں نے بھی افسانے تحریر کیے ہیں کہ نئے زمانے میں قدروں کی پامالی عام ہو چکی ہے سیاسی، سماجی، تہذیبی، معاشرتی تناظر میں دیکھا جائے تو قدروں کی شکست وریخت ایک بہت بڑا مسئلہ ہے۔ اس ذیل میں مسعود اشعر کی کہانی 'بچھڑے کا گیت' اقبال مجید کا افسانہ 'دو بھیگے ہوئے لوگ' مشتاق مومن کا افسانہ 'مردم گزیدہ' منشا یاد کا افسانہ 'تماشا' قمر عباس کا افسانہ 'سرطان' جیلانی بانو کا افسانہ 'پرایا گھر' قابل ذکر ہیں۔

مسعود اشعر کے افسانے 'بچھڑے کا گیت' میں درخت کو انسانی زندگی کی بنیادی قدروں کی ایک علامت کے طور پر پیش کیا گیا ہے کیونکہ یہ درخت ہی ہے جس سے بستی کی خوبصورتی قائم رہتی ہے اور یہی تیز دھوپ سے بچاتا بھی ہے مگر درختوں کے کٹنے کا یہ عمل اس بنیادی قدر سے انسان کو محروم کر دیتا ہے۔

اقبال مجید کا افسانہ 'دو بھیگے ہوئے لوگ' میں بھی یہ بیان کیا گیا ہے کہ آج کے معاشرے میں لوگ اپنی زندگی مفادات اور مصلحت کے تحت گزارتے ہیں اور قدروں کو پامال کر دیتے ہیں۔

مشتاق مومن کا افسانہ 'مردم گزیدہ' میں بھی یہ بیان کیا گیا ہے کہ آج کے رشتوں کی بنیاد صرف دولت پر ہے اور خونی رشتے ختم ہو چکے ہیں۔ اس کہانی کا کردار 'ڈاگی' اپنی ماں کی ناجائز اولاد ہے۔ باپ نہیں چاہتا کہ وہ زندہ رہے لیکن ماں اسے یہ باور کراتی ہے کہ بڑا ہو کر کمائے گا اور کھلائے گا تو باپ راضی ہو جاتا ہے۔ جب اس ڈاگی کو بھوک لگتی ہے اور اسے کھانے کو کچھ نہیں ملتا تو پاس کی کتیا کے بچوں کے ساتھ کتیا کا دودھ پینے لگتا ہے اور غیر انسانی طریقہ کار سے اپنے باپ کے لیے پیسے جمع کرتا ہے۔

منشا یاد نے بھی اپنے افسانے میں قدروں کا بحران اور اقدار کی شکست وریخت کو اپنا موضوع بناتے ہوئے ایک ایسی بستی کو اپنے افسانے میں پیش کیا ہے جہاں کے لوگ صورت سے بچے نظر آتے ہیں لیکن چہرے کی جھریاں یہ بتاتی ہیں کہ یہ سب عمر رسیدہ ہیں۔ دراصل یہ بونوں کی بستی ہے اور جب اس بستی میں ایک بازیگر پہنچتا ہے تو وہ عجیب طرح کے تماش بینوں کو دیکھتا ہے اسے حیرت ہوتی ہے کہ اس کے کرتب سے کوئی متاثر نہیں ہوتا ہے لیکن خونی منظر کو دیکھ کر وہ سب خوش ہونے لگتے ہیں۔ اس افسانے میں دراصل یہ بیان کیا گیا ہے کہ بے حسی عام ہے اور تخریب پسندی بھی آج کے معاشرے کا مزاج بن چکا ہے۔ اسی طرح قمر عباس کے افسانے 'سرطان' میں بھی قدروں کے زوال پر سخت طنز کیا گیا ہے۔ اس افسانے کا کردار انور ہے جس کا باپ یرقان میں مبتلا ہے۔ بچے اس کی دیکھ بھال کرتے ہیں لیکن جیسے ہی ڈاکٹر یہ بتاتا ہے کہ اسے کینسر ہے تو خاندان کے لوگوں کا رویہ تبدیل ہو جاتا ہے اور باپ کو اسپتال میں بے یار و مددگار چھوڑ دیا جاتا ہے۔ جب باپ مر جاتا ہے اور اس کے بیٹے افسانے کے کردار انور کو جب یہ خبر بتائی جاتی ہے تو اس کو کوئی غم نہیں ہوتا وہ سگریٹ سلگاتا رہتا ہے اور اسپتال والوں سے ایک بوتل خون کے پیسے واپس مانگنے لگتا ہے۔

جیلانی بانو کا افسانہ 'پرایا گھر' میں بھی انسانی رشتوں کے ٹوٹنے اور قدروں کے بحران کی کہانی بیان کی گئی ہے۔ افسانے کا کردار ایک حادثے میں دماغی خلل کا مریض ہو جاتا ہے جب وہ گھر آتا ہے تو گھر والوں کا طرز عمل عجیب سا ہوتا ہے۔ بیوی اور بچوں کے ساتھ اس کا رشتہ صرف سات سو روپیہ پینشن کی وجہ سے قائم ہے ویسے گھر کے لوگ اس کے ساتھ غیر اخلاقی برتاؤ کرتے ہیں حتیٰ کہ اس کا بیٹا اپنے مریض باپ کے چہرہ پر سگریٹ کا دھواں چھوڑتا ہے۔ باپ کا ذرہ برابر بھی خیال نہیں رکھتا۔ بیوی، بیٹا اور بیٹیاں کسی کے دل میں نہ باپ کا خوف ہے اور نہ کوئی قدر ہے اقتباس ملاحظہ فرمائیں:

''پتہ نہیں یہ لڑکا کس کی دولت پر اکڑتا پھرتا ہے۔ سگریٹ کا دھواں میرے منھ پر چھوڑتا ہوا گزر جاتا ہے۔ اور ہر وقت ماں بیٹے میں روپے پیسے کے لیے لڑائیاں ہوتی ہیں۔ رات کو ایک دو بجے وہ نشے میں چور گھر لوٹتا ہے تو شاید یہ سمجھتا ہوگا کہ میں الکحل کی بدبو کو نہیں پہچان سکتا۔ مجھے تو اس کی ماں کی دیدہ دلیری پر حیرت ہوتی ہے کہ اتنے آوارہ نکھے لڑکے کو میرا بیٹا بنانے کی جرأت اس نے کی ہے۔

میں اب بوڑھا ہو گیا ہوں، میں نے بھی دنیا دیکھی ہے۔ میرا جی چاہتا ہے امتیاز کے منھ پر اتنے طمانچے ماروں کہ اسے اپنا سچ مچ کا باپ یاد آ جائے۔ مگر اس کے ہٹے کٹے بدن سے ڈر لگتا ہے۔ جانے کون بدنصیب باپ ہوگا جس کی قسمت میں ایسی اولاد لکھی تھی۔'' (پرایا گھر: جیلانی بانو)

قدروں کی شکست وریخت کو اس افسانے میں بہت عمدہ پیرایے میں پیش کیا گیا ہے۔ اس کے علاوہ بھی بہت سے افسانے ہیں جن میں قدروں کے بحران اور زوال کی عکاسی کی گئی ہے ان میں سے بیشتر افسانہ نگاروں کا تعلق جدیدیت کے رجحان سے ہے۔ جدیدیت نے اس نوع کے موضوعات پر زیادہ توجہ مرکوز رکھی ہے اس لیے اس طرح کے افسانے جدیدیت کے دور میں زیادہ لکھے گئے لیکن جدیدیت کے علاوہ دوسری تحریکوں اور رجحانات سے جڑے ہوئے افسانہ نگاروں کے یہاں بھی اس نوع کے موضوعات مل جاتے ہیں۔

■

Rizwan Ahmad
I-10, Haji Colony,
Jamia Nagar, Okhla
New Delhi - 110025
Mob.: 8700201255
Email.: rizwanalauddin1985@gmail.com

ابوبکر عباد

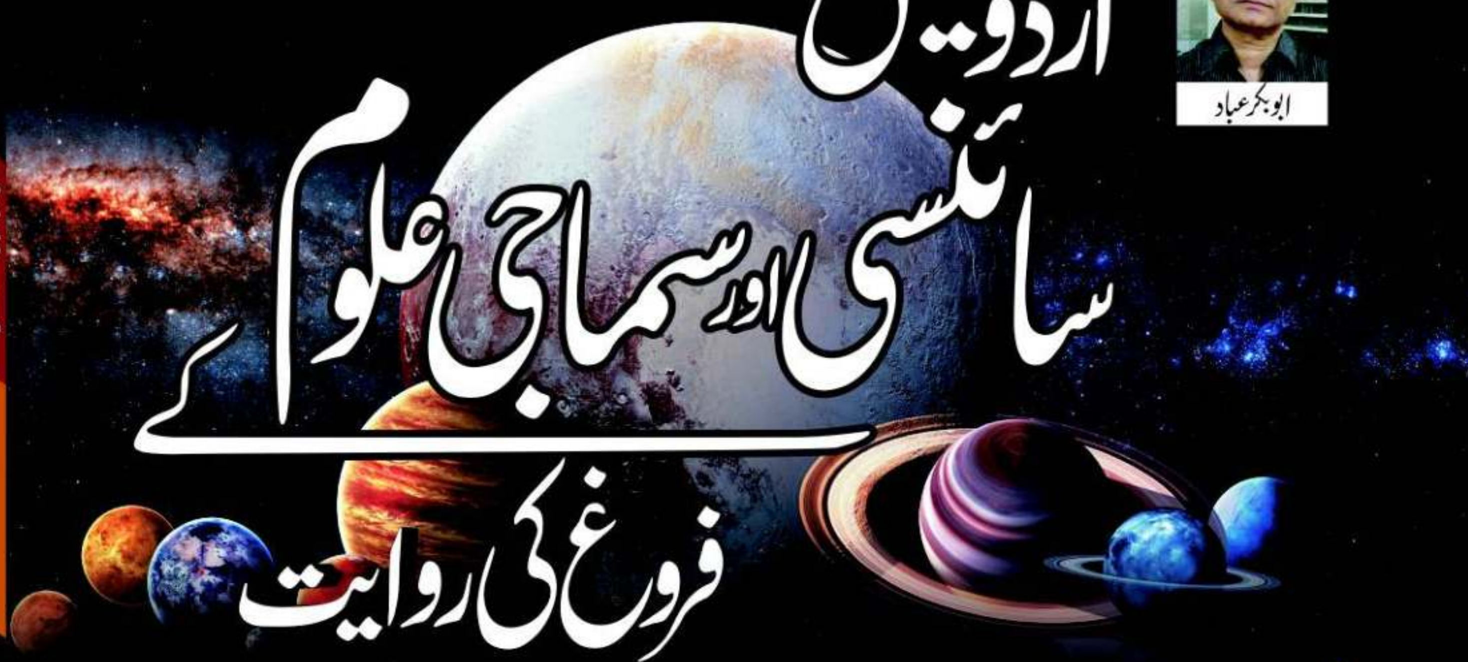

اردو میں سائنسی اور سماجی علوم کے فروغ کی روایت

سائنسی علوم میں قدرتی اشیا اور جمادات، نباتات اور حیوانات وغیرہ کا مطالعہ کیا جاتا ہے، تجربات کے ذریعے ان کے اسباب دریافت کیے جاتے اور اخذ نتائج کے طور پر تسخیر و ایجادات کا عمل کیا جاتا ہے۔سائنسی علوم میں فزکس، کیمسٹری اور بایالوجی (حیاتیات) کو بنیادی حیثیت حاصل ہے، جب کہ سماجی علوم میں انفرادی اور اجتماعی سطح پر انسان، انسانی معاشرے، مختلف النوع سماج بلکہ تمام عالم انسانیت کا مطالعہ و مشاہدہ کیا جاتاہے اور نتائج کے طور پر انسان، معاشرے، سماج اور دنیا کو خوب سے خوب تر بنانے کی کوشش کی جاتی ہے۔

اس میں کوئی شبہ نہیں کہ سائنسی اور سماجی علوم کا آغاز حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی پیدائش سے صدیوں پہلے ہو چکا تھا۔ یونان، مصر اور ہندوستان کو سائنسی اور سماجی علوم اور متعدد فکر و فلسفہ کے بانی ہونے کا شرف حاصل ہے۔لیکن ساتھ ہی اس حقیقت کو بھی تسلیم کرنا چاہیے کہ سرور کائنات کی بعثت سے عالمی تاریخ میں علم و فن، فکر و فلسفہ اور سائنسی اور سماجی علوم کے ایک نئے باب کا آغاز ہوا۔غور و فکر کے نئے اطوار اور اظہار و بیان کے نئے اسالیب وجود میں آئے، اور سائنسی اور سماجی ذہنیت اور رویوں پر حد درجہ زور دیے جانے کی روایت کو فروغ ملا۔محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل ہونے والے انقلابی صحیفے قرآن مجید میں تعقل، تفکر، تدبر اور تعلیم و تعلم کی دعوتیں دی گئیں اور معاشرتی، معاشی، سیاسی، سماجی، حیاتیاتی اور انسانی علوم کا مختلف انداز میں کثرت سے ذکر کیا گیا۔ واقعہ یہ ہے کہ اگر قرآن کو سماجی، عمرانی اور بشری علوم کا بحر ذخار کہیے تو بجا ہے۔

آئیے یہ دیکھنے کی کوشش کریں کہ سائنسی اور سماجی علوم کیا ہیں، ان کی اہمیت اور افادیت کیا ہے، اور پھر یہ جاننے کی کوشش کریں کہ اردو میں سائنسی اور سماجی علوم کی روایت کیا ہے، ان علوم کو اس زبان میں کتنی جگہ دی گئی، انھیں کس طور برتا گیا اور ان کے فروغ کے لیے اس زبان میں کیا اقدام کیے گئے۔

کہنے کی ضرورت نہیں کہ سائنسی علوم میں قدرتی اشیا اور جمادات، نباتات اور حیوانات وغیرہ کا مطالعہ کیا جاتا ہے، تجربات کے ذریعے ان کے اسباب دریافت کیے جاتے اور اخذ نتائج کے طور پر تسخیر و ایجادات کا عمل کیا جاتا ہے۔ سائنسی علوم میں فزکس، کیمسٹری اور بایالوجی (حیاتیات) کو بنیادی حیثیت حاصل ہے، جب کہ سماجی علوم میں انفرادی اور اجتماعی سطح پر انسان، انسانی معاشرے، مختلف النوع سماج بلکہ تمام عالم انسانیت کا مطالعہ و مشاہدہ کیا جاتا ہے اور نتائج کے طور پر انسان، معاشرے، سماج اور دنیا کو خوب سے خوب تر بنانے کی کوشش کی جاتی ہے۔ سماجی علوم میں بشریات (Anthropology)، سماجیات (Sociology)، معاشیات، تاریخ، جغرافیہ، سیاسیات، قانون، نفسیات، لسانیات اور آثار قدیمہ (Anthropology) بطور خاص اہمیت کے حامل ہیں۔

موٹے طور سے دیکھیں تو فی الوقت علوم کی چار شاخیں رائج ہیں۔ سائنسی علوم، پیشہ ورانہ علوم (Vocational Science)، سماجی علوم اور انسانی علوم جسے ہیومنٹیز اور آرٹس کہتے ہیں۔ پیشہ ورانہ علوم میں آفس سکریٹری شپ، اسٹینو گرافی، کمپیوٹر اپلی کیشن، مارکیٹنگ اینڈ سیلس مین شپ، الیکٹریکل ٹیکنالوجی، الیکٹرانک ٹیکنالوجی، ہوٹل مینجمنٹ اینڈ کیٹرنگ، بیکری اینڈ کنفیکشنری، پولٹری فارمنگ، فیشن ڈیزائننگ، اور پلمبرنگ وغیرہ جیسی ہنرمندانہ مہارتیں سکھائی جاتی ہیں۔ جب کہ ہیومنٹیز میں شعر و ادب، فلسفے، مذہبیات، تقابلی مطالعات، زبان اور تنقید کے اضافے کے ساتھ تقریباً وہی موضوعات ہیں جو سماجی علوم میں بیان کیے گئے ہیں۔ ظاہر ہے تمام علوم کی اپنی اپنی اہمیت اور اپنے اپنے فائدے ہیں۔

تسلیم کیجیے کہ اردو زبان میں انسانی علوم کا رواج اور ان کی نشر و اشاعت کا سلسلہ اردو کی یوم پیدائش سے ہی رہا ہے۔ لیکن سچے دل سے یہ اعتراف کرنے میں بھی کوئی حرج نہیں ہے کہ اس زبان میں سائنسی اور سماجی علوم پر توجہ ذرا تاخیر سے دی گئی اور اس کا چلن قدرے بعد میں ہوا۔ اردو کے ابتدائی زمانے میں مذہب و تصوف کے موضوع پر لکھے ہوئے رسالوں کو اس اعتبار سے اہمیت دی جانی چاہیے کہ ان دونوں موضوعات کا تعلق سماجی علوم سے

ہے۔ ویسے حقیقت یہ ہے کہ اردو میں سائنسی اور سماجی علوم تراجم کے توسط سے آئے۔ اور کوئی شبہ نہیں کہ اس کام میں افراد اور اداروں نے قابل قدر اور لائق افتخار کارنامے انجام دیے۔ اس حوالے سے یہاں چند اداروں اور افراد کا تذکرہ ناگزیر ہے۔

اردو میں علمی تراجم کے اداروں میں فورٹ ولیم کالج کو اہمیت نہ سہی اولیت ضرور حاصل ہے۔ یوں کہ یہاں ترجمے کے نام پر بس چند لغات کی تدوین اور کچھ کہانیوں اور ڈراموں کے ترجمے کیے گئے۔ یہ تمام ترجمے عربی، فارسی اور سنسکرت سے کیے گئے ہیں۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ فورٹ ولیم کالج میں کسی بھی انگریزی کتاب کا اردو میں ترجمہ نہیں ہوا، بلکہ یہ کہیے کہ یہاں سوائے قصہ کہانیوں کے کسی بھی علمی کتاب کا ترجمہ نہیں کیا گیا تو غلط نہ ہوگا۔

واقعہ یہ ہے کہ علمی کتابوں کے باضابطہ تراجم پہلی بار دلی کالج کے ورناکلر ٹرانسلیشن سوسائٹی میں کروائے گئے، سوسائٹی کا قیام 1842 میں عمل میں آیا تھا، لیکن قابل ذکر بات یہ ہے کہ اس سے تین برس پہلے حیدرآباد میں نواب فخرالدین خاں شمس الامرا نے ذاتی طور پر سائنسی علوم کی انگریزی کتابوں کے اردو میں ترجمے کروائے تھے اور ان کی اشاعت کا انتظام بھی۔ ان میں رسالہ اصول علم الحساب، رسالہ جرثقیل، رسالہ کسورات اعشاریہ، رسالہ علم آب، رسالہ مفتاح الافلاک، علم ہیئت، ترکیب ادویہ، مرقع تصویر حیوانات، رسالۂ حیوان مطلق، منتخب المصر (دورنما)، علم برقک اور کیمسٹری کا مختصر رسالہ وغیرہ جیسی اہم کتابیں انگریزی سے اردو میں منتقل کروائی گئیں۔ نواب شمس الامرا ایک کتاب کے آغاز میں لکھتے ہیں:

''بعض علوم اہل فرنگ میں ایسے رواج پائے ہیں کہ ان کا نام بھی یہاں کے لوگوں نے نہیں سنا۔ چنانچہ علم آب و ہوا اور برق مقناطیس اور کیمسٹری وغیرہ۔ اس واسطے مدت سے ارادہ تھا کہ مبتدیوں کے فائدے کے لیے ...کوئی کتاب زبان فرنگ سے ترجمہ کی جاوے۔''

(اردو زبان میں علمی اصطلاحات کا مسئلہ، کراچی، 1949، ص، 30)

یہ کہنا قطعاً غلط نہ ہوگا کہ ہندوستان میں یورپی ایجادات اور تحقیقات کی اہمیت سے سب پہلے متاثر ہونے، سمجھنے اور قبول کرنے والے نواب فخرالدین خاں شمس الامرا (1780-1862) تھے۔ انھوں نے حیدرآباد میں 1825 میں پہلا سنگی مطبع قائم کیا، اور 1834 میں پہلا سائنسی ادارہ 'مدرسہ فخریہ' قائم کیا جس میں فلکیات کے تجربات کے لیے 'رصدگاہ جہاں' تعمیر کروائی۔ چالیس سے زائد سائنسی کتابوں کی اشاعت کا سہرا ان کے سر بندھتا ہے۔

اسی عہد میں اودھ کے نوابین نے بھی سماجی اور سائنسی علوم کے فروغ میں نمایاں خدمات انجام دیں، لیکن المیہ یہ ہے کہ انگریز مورخوں نے ان کے کارناموں کو پوشیدہ رکھنے اور انھیں (بطور خاص واجد علی شاہ کو) بدنام کرنے میں زیادہ دلچسپی لی۔ بقول گارساں دتاسی:

''واجد علی شاہ اور ان کی حکومت کو بدنام کرکے اودھ پر غاصبانہ قبضہ کرنے کے ناپاک مقصد سے انگریزوں اور ان کے ضمیر فروش ہندوستانی پٹھوؤں نے پروپیگنڈا کرکے وہ مہم چلائی کہ واجد علی شاہ کا نام عیش کوشی اور نفس پرستی کا مترادف بن گیا۔ کون تصور کرسکتا ہے کہ اس بدنام بادشاہ کو اپنی ہوسناکیوں اور عشق بازیوں سے کتابیں لکھنے کی فرصت ملی ہوگی۔ پھر کتابیں بھی دو چار نہیں، دس بارہ نہیں، سو سے زیادہ۔''

(خطبات گارساں دتاسی، خطبہ ہفتم، بحوالہ اردو میں سائنسی و تکنیکی ادب، ڈاکٹر محمد شکیل خاں، دہلی، 1988، ص، 70)

اودھ کے محمد علی شاہ نے متعدد سائنسی کتابوں کے ترجمے کروائے تھے جو مطبع سلطانی لکھنؤ سے شائع ہوئیں۔ مولوی عبدالحق کی روایت کے مطابق: ''لکھنؤ کی رصدگاہ کے ایک معمر کارکن مولوی کمال الدین نے رصدگاہ کے ناظم کرنل ولکاک کی نگرانی میں کوئی بارہ رسالوں کا ترجمہ کیا جو علم ہیئت، علم الہوا، علم المناظر، حرارت، طبعیات، آلات ریاضی، قوت مقناطیسی، کیمیا وغیرہ پر تھے۔'' (ایضاً، ص، 30)

نواب غازی الدین حیدر خود علم دوست اور کثیر المطالعہ تھے، اس لیے انھوں نے اس جانب بطور خاص توجہ کی۔ ان کے عہد کو سائنسی اور مغربی علوم وفنون کے فروغ، ٹائپ، چھاپہ خانہ اور کتابوں کی اشاعت کے حوالے سے بھی یاد کیا جاتا ہے۔ امجد علی خاں بھی مغربی علوم کے فروغ اور سائنسی ایجادات کی ترویج میں حصہ لیتے تھے۔ اس کار خیر میں نواب نصیرالدین حیدر نے بھی سائنس کی کئی کتابیں انگریزی سے اردو میں ترجمہ کروائیں۔ بعد ازاں امجد علی شاہ کے زمانے میں بھی متعدد کتابیں ترجمہ ہوئیں جن میں 'مفتاح الافلاک'، رسالۂ ہیئت، رسالہ علوم طبیعہ، رسالہ قوتِ مقناطیس اور رسالہ علم الحرارۃ بطور خاص قابل ذکر ہیں۔

دہلی ورناکلر ٹرانسلیشن سوسائٹی 1841 میں قائم ہوئی تھی۔ اس کا بنیادی مقصد جدید سائنسی اور سماجی علوم کی اشاعت اور مغربی کتابوں کا اردو ترجمہ کروانا تھا۔ ہندوستان کی پہلی جنگ آزادی یعنی غدر سے پہلے تک یہاں ایک سو سترہ کتابیں ترجمہ اور تصنیف وتالیف کرلی گئی تھیں۔ (بحوالہ مضمون پروفیسر آل احمد سرور، مشمولہ دلی کالج میگزین، 1953)۔ لیکن محمد شکیل خاں کی تحقیق کے مطابق ان کتابوں کی تعداد 128 ہے۔ بعد میں دلی کالج کے شاگردوں نے بھی سائنسی اور سماجی علوم کی اشاعت و ترویج میں نمایاں کارنامے انجام دیے، جن میں ڈپٹی نذیر احمد، منشی ذکاء اللہ اور ماسٹر رام چندر کے اسمائے گرامی قابل ذکر ہیں۔ ماسٹر رام چندر نے 1845 میں 'فوائد الناظرین' کے نام سے ایک اخبار بھی جاری کیا، جس میں خصوصی طور سے جدید علمی رجحانات اور سائنسی مضامین شائع کیے جاتے تھے۔ اس کے دو سال بعد 'خیر خواہ ہند' کے نام سے ایک رسالہ شروع کیا، جس کا اگلے شمارے سے نام تبدیل کرکے 'محبِ ہند' کردیا گیا۔ اس رسالے میں بھی اسی نوع کے مضامین شائع ہوتے تھے۔ 1846 سے پنڈت دھرم نارائن کا اخبار 'قران السعدین' بھی نکلتا تھا جس میں سائنسی علمی، تاریخی اور مضامین کو اہمیت دی جاتی تھی۔

یہاں پہلی بار ترجمے کے باضابطہ اصول وضوابط متعین کیے گئے اور منتخب کتابیں آسان اردو میں ڈھالی گئیں۔ یہاں سائنسی اور سماجی علوم کی ساٹھ سے زائد

کتابوں کو اردو زبان کا جامہ پہنایا گیا، جن میں علم ہیئت، پولیٹیکل اکانومی، قانون مال، میکانیات، تاریخ عالم، علم جراحی، حرکیات و سکونیات، جغرافیہ، فزکس، کیمسٹری، معدنیات، مقناطیس، حرارت، علم المناظر، علم برق اور علم طب وغیرہ شامل ہیں۔ چند مترجمہ کتابوں کے نام اس طرح ہیں: تاریخ انگلستان، تاریخ یونان، تاریخ روم، رامائن، مہابھارت، رسالہ اصول حساب، روشنی کا انعکاس اور اجتماع شعاع، تجزیاتی جیومیٹری، حرارت، برقیات، ہائڈروسٹیٹیک (Hydrostatics)۔

سائنسی اور سماجی علوم کو اردو کا قالب عطا کرنے کی دوسری منظم اور سنجیدہ کوشش سرسید علیہ الرحمہ کی سائنٹفک سوسائٹی میں ہوئی۔ سرسید نے 1863 میں سائنٹفک سوسائٹی قائم کی تھی۔ کہا جاتا ہے کہ یہاں انگریزی سے اردو میں تقریباً چالیس کتابیں ترجمہ کروائی گئیں جن میں تاریخ، سوانح، جغرافیہ، سیاسیات اور معاشیات کو دوسرے مضامین پر فوقیت حاصل ہے۔ لیکن دستیاب کتابوں کی تعداد محض پندرہ ہے۔ سوسائٹی کی کمیٹی میں جن کتابوں کو اردو زبان میں ڈھالنے کی فہرست بنائی گئی تھی ان میں سے چند کتابوں کے نام یہ ہیں: رسالہ بھاپ کے کلوں کے بیان میں، رسالہ جیالوجی، رسالہ علم جغرافیہ، رسالہ علم فلاحت (یعنی جدید کاشتکاری) رسالہ علم طبیعات، رسالہ ہیئت اور علم جہاز رانی، رسالہ در باب سڑک وریل، رسالہ علم برقی، رسالہ در باب استعمال بجلی، رسالہ علم مدن اور رسالہ حقوق انسانی وغیرہ۔ اس سوسائٹی نے صرف سائنسی اور سماجی علوم کے اردو ترجمے ہی نہیں کروائے بلکہ سر سید نے یورپ سے چند سائنسدانوں کو بلوایا اور سائنسی آلات بھی منگوائے۔ یہ بھی نہیں بھولنا چاہیے کہ ہندوستان میں سوڈا واٹر کی بوتل اور روئی دھننے کی مشین کا استعمال اور فوٹو گرافی کے کام سب سے پہلے اسی سوسائٹی نے شروع کیا۔ اور یہ بھی کہ زراعت کے جدید آلات کے استعمال اور عملی زراعت کی ٹریننگ کے لیے علی گڑھ میں ایک خطہ ارض بھی مخصوص کیا گیا تھا۔

اردو زبان نے جس طرح علاقائی، ملکی اور بین الاقوامی الفاظ کو اپنے دامن میں جگہ دے کر انھیں اپنا بنایا ہے، اسی طرح یہ زبان نہ صرف سائنسی اور سماجی مضامین کے فروغ و اشاعت میں ذمے دارانہ اور موثرانہ کردار ادا کر رہی ہے، بلکہ انھیں گھر، مکتب، اسکول، کالج، یونیورسٹی اور عام ذہنوں تک پہنچا بھی رہی ہے۔ اور صرف سائنسی اور سماجی علوم ہی کیا دنیا کا شاید ہی کوئی ایسا میدان علم و فن ہو جس کی آبیاری اور نشوونما اردو زبان نہ کر رہی ہو۔ یہی اس زبان کی عظمت ہے، یہی اس کا سیکولر کردار اور ہر طرح کے علوم وفنون سے محبت و یگانگت کا ثبوت بھی۔

یہ کہنے میں کوئی حرج نہیں ہے کہ سائنسی اور سماجی علوم کو اردو کی کتابی شکل میں لانے کا فریضہ ورنا کلر ٹرانسلیشن سوسائٹی اور سائنٹفک سوسائٹی سے بھی زیادہ منظم، منضبط اور موثر طریقے سے جامعہ عثمانیہ، حیدرآباد کے دارالترجمہ میں ادا کیا گیا۔ جامعہ عثمانیہ سے ایک برس پہلے دارالترجمہ (1917) کا قیام عمل میں آچکا تھا۔ یہاں کے اولین مترجمین میں قاضی تلمذ حسین، چودھری برکت علی، نظم طباطبائی، مولوی عبدالحلیم شرر، مرزا محمد ہادی رسو کے نام قابل ذکر ہیں، جنھوں نے انگریزی، عربی اور فرانسیسی زبانوں سے تراجم کیے۔ ادارے کے پہلے ناظم بابائے اردو مولوی عبدالحق تھے۔ چونکہ جامعہ عثمانیہ نے ذریعہ تعلیم اردو کو قرار دیا تھا اس لیے یہاں سے آرٹس، سائنس، سوشل سائنسز، انجینئرنگ اور میڈیسین وغیرہ کی ایک روایت کے مطابق 395 اور بعض کے مطابق تقریباً پانچ سو کتابیں شائع کی گئیں، جن میں سائنسی اور سماجی علوم پر خاص طور سے توجہ مرکوز رکھی گئی۔

عبیداللہ قدسی نے اپنی کتاب 'پاکستان میں ذہنی رجحان' میں صرف پاکستان میں شائع ہونے والی اردو مترجمہ کتابوں کی ایک نا تمام فہرست شامل کی تھی، جس کی تعداد انھوں نے چھ ہزار دو بتائی تھی، جس میں ظاہر ہے کہ قرآن، حدیث، اسمائے رجال، اور فقہ و سیر کے تراجم بھی شامل ہیں۔ انھیں کے بقول ایک عام فہرست سازی کے مطابق تب تک اردو زبان میں تقریباً اٹھارہ ہزار سے زائد ترجمہ شدہ کتابیں موجود تھیں۔

ان اداروں کے علاوہ جہاں سائنسی اور سماجی علوم کی کتابیں تحریر یا ترجمہ کی گئیں ان میں دارالمصنفین اعظم گڑھ، ہندوستانی اکیڈمی الہ آباد، اردو اکیڈمی جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی، این سی ای آر ٹی، نیشنل بک ٹرسٹ، ساہتیہ اکیڈمی، ترقی اردو بورڈ اور بعد ازاں قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان دہلی، انجمن ترقی اردو ہند وغیرہ خاصے اہم ہیں اور ہاں نہیں بھولنا چاہیے کہ جماعت اسلامی نے بھی بچوں کی درسی ضرورتوں کے تحت اردو میں سائنسی اور سماجی علوم کی کتابیں خاصے اہتمام سے تیار کروائی ہیں۔ ان کے علاوہ معاشیات، سیاسیات اور سماجیات جیسے موضوعات پر بھی اس ادارے نے کافی کتابیں شائع کی ہیں۔ انفرادی سطح پر اردو میں سائنسی اور سماجی علوم پر مضامین، مقالے اور کتابیں لکھنے یا ترجمہ کرنے والوں کی تعداد بھی قابل ذکر ہے۔ اردو کے رسائل و جرائد میں بھی سائنسی اور سماجی علوم سے متعلق مضامین شائع ہوتے رہتے ہیں۔ حکومت ہند کی جانب سے اردو میں 'سائنس کی دنیا' کے نام سے ایک بڑا ہی خوبصورت، معلوماتی اور معیاری رسالہ سائنسی ذوق پیدا کرنے میں اہم کردار ادا کرتا رہا ہے۔ 'سائنس' کے نام سے دہلی سے ہی ڈاکٹر اسلم پرویز کی ادارت میں بھی ایک رسالہ نکل رہا ہے۔ اردو کے متعدد ذاتی اشاعتی ادارے سائنسی اور سماجی علوم کی کتابیں بالخصوص بچوں کے لیے شائع کرتے رہتے ہیں۔ اردو فکشن کو سائنسی اور سماجی علوم کی بالواسطہ انتھالوجی کہیے تو بجا ہے، کہ دونوں علوم کے کون سے ایسے مضامین ہیں جو اردو فکشن کے موضوع، مواد اور متعلقات میں شامل نہ ہوں۔

سو، یہ بات بہت ہی افتخار سے کہی جا سکتی ہے کہ اردو زبان نے جس طرح علاقائی، ملکی اور بین الاقوامی الفاظ کو اپنے دامن میں جگہ دے کر انھیں اپنا بنایا ہے، اسی طرح یہ زبان نہ صرف سائنسی اور سماجی مضامین کے فروغ و اشاعت میں ذمے دارانہ اور موثرانہ کردار ادا کر رہی ہے، بلکہ انھیں گھر، مکتب، اسکول، کالج، یونیورسٹی اور عام ذہنوں تک پہنچا بھی رہی ہے۔ اور صرف سائنسی اور سماجی علوم ہی کیا دنیا کا شاید ہی کوئی ایسا میدانِ علم و فن ہو جس کی آبیاری اور نشوونما اردو زبان نہ کر رہی ہو۔ یہی اس زبان کی عظمت ہے، یہی اس کا سیکولر کردار اور ہر طرح کے علوم وفنون سے محبت و یگانگت کا ثبوت بھی۔

■

Abu Bakar Abbad
Dept of Urdu
Delhi University
Delhi-110007
Mob.:9810532735
Email.: bakarabbad@yahoo.co.in

عبدالودود انصاری

غیر مسلموں کی اردو سائنسی خدمات

اردو کی پیدائش ہندوستان میں ہوئی۔ اردو نہ صرف ہندوستان اور پاکستان کی زبان ہے بلکہ خلیجی، یورپی اور امریکی ممالک میں بھی اردو بولنے والوں کی ایک بڑی تعداد موجود ہے اور وہاں بھی اردو کا جادو سر چڑھ کر بول رہا ہے۔ اسی لیے کہا جاتا ہے کہ اردو عالم گیر مشترکہ زبان ہے۔ اردو کیسی زبان ہے:

''چہرہ صدیوں کی شاندار روایات سے تابندہ، آنکھوں میں وہ جادو جس نے خراساں وقندھار سے لے کر بنگالے تک لوگوں کو مسحور کیا۔ چہرے پر صبح بنارس کی تازگی، لبوں میں لکھنؤ کی حلاوت، گفتگو میں نرمی، پیکر میں رنگینی شامِ اودھ کی، یہ ہے ہماری، آپ کی اور سب کی زبانِ اردو۔'' (اردو کے ہندو شعرا: مرتبہ جگدیش مہتہ درد، ص: 7)

شاعری کی زبان میں ؎

کہیں ریشم، کہیں اطلس، کہیں خوشبو رکھ دوں
یہ تمنا ہے تیری یاد کو ہر سُو رکھ دوں
یہ تبسم، یہ تکلم، یہ نفاست، یہ ادا
جی میں آتا ہے تیرا نام میں اردو رکھ دوں

(اشفاق احمد ورک)

تاریخ بتاتی ہے کہ جس نے بھی اردو کو سینے سے لگایا وہ اس کی اسیر ہوگئی۔ یہ اپنے ماننے والوں کی نہ تو ذات پات دیکھتی ہے نہ ہی اس کے مذہب کا خیال کرتی ہے، نہ ہی گورے کالے کی تمیز کرتی ہے بلکہ اپنا سچا عاشق تلاش کرتی ہے اور اس پر اپنی جان فدا کر کے بس اسی کا ہو کر رہ جاتی ہے۔ اردو کے ساتھ المیہ یہ ہے کہ اردو مسلمانوں کی زبان کہی جاتی ہے حالانکہ حقیقت اس کے برعکس ہے۔ اردو کو مسلمانوں نے اپنے سینے سے لگایا تو غیر مسلموں نے بھی اس کی خاطر داری اور اس کے فروغ میں خون جگر بہایا ہے۔ تاریخ کے صفحات بتاتے ہیں کہ اردو کی کوئی ایسی صنف نہیں جس پر مسلمانوں کے ساتھ ساتھ غیر مسلموں نے بھی اپنی موجودگی کا پرچم نہ لہرایا ہو۔ شاعری کی بات کریں یا افسانہ نگاری کی یا ناول نگاری کی حتیٰ کہ مرثیہ گوئی ہو یا نعت گوئی کسی بھی شعبے میں غیر مسلموں کی خدمات کم نہیں ہیں۔ اردو کے ساتھ فارسی کا ذکر کریں تو فارسی میں بھی غیر مسلموں کی خدمات بیش بہا ہیں۔

میرا 'غیر مسلموں کی اردو سائنسی خدمات' لکھنے کے تین مقاصد ہیں۔ اول یہ کہ جن کی آنکھوں پر تعصب کی موٹی تہہ جم گئی ہے اور وہ اردو کو مسلمانوں کی زبان سمجھتے ہیں یا وہ مسلمان جو اردو کو اپنے باپ دادا کی جاگیر سمجھتے ہیں وہ یقیناً غلط فہمی کے شکار ہیں کہ حقیقت اس کے برعکس ہے۔ دوم یہ کہ 'سائنسی ادب' جو کہ آج کسی بھی قوم کی ترقی کا سب سے بڑا ہتھیار ہے اور اس کی اہمیت روز روشن کی طرح عیاں ہونے کے باوجود بہت ساری اردو داں سائنسی شخصیت کو احساس دلانا مقصود ہے جو سائنسی ادب تخلیق کر سکتے ہیں لیکن اپنی ذمے داری نبھانے سے قاصر ہیں یا نبھانا نہیں چاہتے ہیں۔ سوم یہ متذکرہ حقیقت کے تناظر میں ان غیر مسلموں کے اردو میں سائنسی کارناموں کو سامنے لائے جائیں جنھوں نے اپنے رشحات قلم سے 'اردو سائنسی ادب' کو مالا مال کیا ہے اور پھر ان کی سائنسی خدمات کو خراج عقیدت پیش کیا جائے۔ آیئے سب سے پہلے آپ کے سامنے چند ایسے غیر مسلموں کی سائنسی کتابوں کی تفاصیل پیش کرتے ہیں جنہوں نے اٹھارویں اور انیسویں صدی کے دوران اپنی تصانیف کے ذریعے سائنسی اردو ادب کی خوب خدمت کی ہے۔

عنوان : طب

1 فارکوپیا: جی ماوٹ فریڈ (ص: 294، سال: 1845)، ناشر: ایشین کالج پریس، کلکتہ
2 نافع امراض: ولیم میکنزی (ص: 92، سال: 1845)، مطبع: سنگھ چھاپہ خانہ، شمس الامرا
مواد: علم ادویہ سے متعلق
مواد: مغربی طب کے مطابق ادویہ کے خواص
3 نافع امراض: ڈاکٹر ولیم میکنزی (ص: 192، سال: 1846)، مطبع: شمس الامرا پریس، حیدرآباد
مواد: مفرد دواؤں کے خواص وافعال
4 خلاصۃ الادویہ: ڈاکٹر ولیم میکنزی (ص: 405، سال: 1846)، مطبع: شمس الامرا پریس، حیدرآباد
5 علم وفن: برج لال گھوش (ص: 676، سال: 1884)، مطبع: کتب خانہ خاص
6 رسالہ طب قلمی: لکشمی رام پنڈیا (ص: 46، سال: 1870)
7 الکحل کے اخلاقی اور طبعی تاثرات: پیٹرل ہیر سرجن (ص: 54، سال: 1888)، ناشر: دارالطبع جامعہ عثمانیہ، سرکار عالی، حیدرآباد
8 جوہر حکمت: پیارے لال (ص: 252، سال: 1896) مطبع: انسٹی ٹیوٹ پریس، علی گڑھ
مواد: امراض اور ان کی تشخیص، تجویز ادویہ اور مختلف طریقہ ہائے علاج کا بیان
9 میٹریا میڈیکا اُردو: مکند لعل (ص: 684، سال: 1900)
10 پانی: نونہال سنگھ بھارگو (ص: 147، سال: 1902)، مطبع: سلیمانی پریس، بنارس

مواد: پانی کے استعمال کے لیے ضروری ہدایات

11 ہیومن اناٹمی: بیلی رام (ص: 1187، سال: 1907)

12 سل و دق کا قدرتی علاج و انسداد (ص: 117، سال: 1912)

13 رسالہ امراض: پروفیسر ولسن (ص: 100، سال: 1914)، ناشر: کمبائنڈ انجینیئرز، حیدرآباد

مواد: آنکھ، کان، حلق اور اس کے امراض اور ان کا علاج

14 جڑی بوٹی: پیارے لال (ص: 88، سال: 1925) ناشر: ودیا ساگر ڈپو، علی گڑھ

15 تعلقات ہومیو پیتھک: ڈاکٹر کاشی رام (ص: 223، سال: 1935)، مطبع: نامی پریس، لکھنؤ

مواد: ہومیو پیتھ کی ادویہ کے نام، ان کی خاصیت مصلح معاون متضاد ماقبل ومتعاقب دوران استعمال

16 ریلیشن شپ آف ریمیڈیز: کاشی رام (ص: 223، سال: 1935)

17 مصطلحات طب: اسٹڈ مین ڈارلینڈ (ص: 384، سال: 1948) ناشر: سررشتہ تالیف وترجمہ، جامعہ عثمانیہ

18 آپ کا بچہ اس کی صحت اور پرورش: مونگا راج (ص: 265، سال: 1950)، ناشر: مکتبہ جامعہ، دہلی

19 مددگار صحت: برہم داس (ص: 157، سال: 1964) مطبع: گلزار عالم پریس، لاہور

20 سائیکلو پیڈیا آف ہومیو پیتھک ڈرگز (سال: 1965، جلد اول: ص 744، جلد دوم: ص 864، جلد سوم: ص 1112)

ناشر: کامیاب بک ڈپو، لاہور

21 نسخہ جات ہومیو پیتھی: ڈاکٹر کاشی رام (ص: 320، سال: 1965) ناشر: کامیاب بک ڈپو، لاہور

22 لاثانی لغات الادویہ: پنڈت ٹھاکر داس (ص: 630، سال: 1965)، مطبع: مقبول عام پریس، لاہور

23 نسخہ علم طب: ڈاکٹر وئڈ (ص: 631، سال: 1290ھ)، مطبع: دارالطبع عثمانیہ، حیدرآباد

24 پھلوں اور سبزیوں سے علاج: ایل کے ملک (ص: 192)، ناشر: اسعد ہاؤس، گجرات

مواد: مختلف پھلوں اور سبزیوں کے خواص اور مختلف امراض کے پھلوں سے علاج

25 عام متعدی امراض: ڈاکٹر نارمن (ص: 84) ناشر: حیدرآباد پرنٹنگ ورکس، حیدرآباد

مواد: متعدی امراض، ان کے اسباب وعلامات اور علاج

26 رسالہ چشم: نونہال سنگھ بھارکو (ص: 42)، ناشر: کارخانہ نمک سلیمانی، بنارس

مواد: امراض چشم اور ان کا علاج

27 اختیار تولید: بابو رام شیدا، مواد: لڑکے اور لڑکی کی پیدائش میں والدین کے ارادہ واختیار کی حقیقت

28 ہدایت نامہ حاملہ زچہ بچگان المعروف ہدایت نامہ پرورش بچگان: ہرنام داس (ص: 281)

29 ہدایت نامہ دائیان: تیرتھ رام فیروزپوری (ص: 256)، ناشر: ایس سنت سنگھ اینڈ سنز، لاہور

30 ہدایت نامہ صحت: ہرنام داس (ص: 912) ناشر: آدم جی عبداللہ پبلشرز، لاہور

31 حفظ صحت (حصہ دوم) (ص: 72)، ڈاکٹر آر پرشاد، مطبع: نول کشور پریس، لکھنؤ مواد: مختلف بیماریاں اور ان کا علاج

عنوان: نباتیات

1 نباتات اور نباتاتی خوراک: موہن لال سیٹھی (ص: 304، سال: 1927) ناشر: دارالاشاعت، لاہور

2 مبادی نباتات: جگ موہن لعل ترویدی (ص: 419، سال: 1930) مطبع: نول کشور پریس، لکھنؤ

عنوانات: حیاتیات

1 دنیا کے عجیب وغریب جانور: رام لبھایا (ص: 111، سال: 1929) ناشر: گلاب چند رکپور

2 پرندے اور ان کی زندگی: موہن لال سیٹھی (ص: 334، سال: 1930) ناشر: دارالاشاعت، پنجاب، لاہور

3 کیڑے مکوڑے: رام سروپ کوشل (ص: 252، سال: 1930) ناشر: دارالاشاعت، پنجاب، لاہور

4 چوپائے اور انسان: موہن لال سیٹھی (ص: 176، سال: 1938)، ناشر: دارالاشاعت، پنجاب، لاہور

5 چیونٹی: مہندر راج سکسینہ (ص: 115، سال: 1941)، ناشر: ادارہ ادبیات، لاہور

5 بھیڑ بکری: منوہر لال چودھری (ص: 302، سال: 1947) ناشر: کتب خانہ دار البلاغ، لاہور

6 وہ جانور جو نظر نہیں آتے: منشی رام پرشاد (ص: 30) مطبع: مسلم یونیورسٹی پریس، علی گڑھ

مواد: جراثیم اور نامیاتی کیڑوں پر ایک تحقیقاتی مقالہ

عنوان: طبعیات

1 اصول علم طبعی (طبعیات): اجودھیا پرشاد (سال: 1848)

2 مقالات طبعی: نند کشور (ص: 72، سال: 1858)

3 دائرہ علوم طبعیات: شنکر لکشمی (ص: 75، سال: 1875)، مطبع: میڈیکل ہال پریس، بنارس

عنوان: سائنسی آلات

1 الیکٹرک بیٹریز جدید: پروفیسر نریندر ناتھ، ناشر: مکتبہ رفیق روزگار، لاہور مواد: الیکٹرک بیٹری بنانا

عنوان: زراعت

1 فن زراعت: جے بی فلر (ص: 80، سال: 1891) مطبع: افگانی پریس، امرتسر

2 کتاب کھیت کرم: کالی رائے (ص: 150، سال: 1849) ناشر: اخبار پریس، دہلی

3 رہنمائے زراعت ہند: ہاگسن (ص: 184، سال: 1919)، مطبع: عمومی پریس، لاہور

4 اسرار زراعت: سنت سنگھ (ص: 300، سال: 1924) ناشر: کیور آرٹ پریس، لاہور

5 معاملہ زمین: برج نرائن (ص: 80، سال: 1935) ناشر: اردو بک سٹال، لاہور

6 کاشکار: کاشی ناتھ راؤ (ص: 160، سال: 1946)، ناشر: مکتبہ جدید، لاہور

مواد: کاشکاروں کے لیے کاشکاری اور پیداوار بڑھانے کے لیے ہدایات اور مشورے

7 علم زراعت: سرمادھر راؤ

عنوان: اناج

1 مکئی کی کاشت: رام پرشاد (ص [illegible])، ناشر: کاشی پریس، لاہور

مواد: پنجاب میں مکئی کی کاشت کے رقبے میں اضافے کی ترغیب اور پیداوار بڑھانے کے طریقے

عنوان: باغبانی

1 اسرار باغبانی: بنواری لال (ص: 60) مطبع: نول کشور، لکھنؤ

2 فن باغبانی: کے این گپتا (ص: 356، سال: 1951) مطبع: نول کشور لکھنؤ

عنوان: پھل

1 پھلوں کی کھیتی اور تجارت: دولی چند نارائن (ص: 248، سال: 1936) مطبع: نول کشور پریس لکھنؤ

2 ہندوستان میں پھلوں کے باغات: چیرمین وگیری (ص: 72)، ناشر: مفید عام پریس، لاہور

مواد: برصغیر پاک وہند میں پھل دار درخت لگانے، ان کی پیوندکاری اور نگہہ داشت کے طریقے

عنوان تعمیرات

1 جوشیز ماڈرن ڈیزائنیز المعروف رہنمائے تعمیرات (ص: 396) مطبع: ثنائی برقی پریس، امرتسر

مواد: تعمیرات کے اصول وقواعد، تعمیر میں استعمال ہونے والی اشیا اور تعمیراتی مصالحہ جات کے بنانے

اوراستعمال کے طریقے

2 سڑک تعمیر: ڈیویڈسنڈیمن (ص:64، سال: 1854)

مواد: ممالک متحدہ آگرہ اودھ میں زمانہ تصنیف کے حالات کے مطابق سڑکوں کی تعمیر کے اصول اور مشورے

عنوان: سواریاں

1 موٹر کار ٹیچر: حکیم رام کرشن (ص:88، سال: 1929)

2 موٹر انجن ڈفیکٹ ڈرائیونگ ٹیچر: بابو رام پرشاد ورما (ص: 72، سال: 1933) مطبع: فائن پرنٹنگ کالج

عنوان: ہوائی جہاز

1 جہاز اور ہوائی جہاز: شروپ (ص: 117، سال: 1931) ناشر: عطر چند کپور، لاہور

مواد: بحری اور ہوائی جہاز بنانے کی تاریخ

عنوان: انجینئرنگ

1 کرشنا میکینیکل گائیڈ (حصہ اول): پنڈت کشن سارد (ص: 320، سال: 1938)

2 قواعد حساب متعلقہ انجینئرنگ: مترجم: لالہ جگ موہن لال (ص:32، سال: 1885)

3 لوکو گائیڈ: ہری چند دتہ (ص: 520، سال: 1949)، ناشر: آتمارام پبلیشرز، دہلی

مواد: لوکو میں کام کرنے والوں کی رہنمائی کے لیے

3 الیکٹرک گائیڈ: نریندر ناتھ (ص: 400، سال: 1952) ناشر: سید رحمت علی شاہ اینڈ سنز، لاہور

4 انجینئرنگ کارخانے کے چار عملی سبق: سٹل سیاف (ص: 104) مطبع: جامعہ عثمانی، حیدرآباد

مواد: کارخانوں میں استعمال ہونے والے اوزاروں کے متعلق

5 الیکٹریشینز ہینڈ بک: خوش حال سنگھ (ص: 284) ناشر: مسلم جنرل بکس ایجنسی، لاہو

6 کارخانہ بجلی: پنڈت مادھو رام (ص: 191)، ناشر: رام لچھمن پرساد آہوجہ پبلیشرز، لاہور

مواد: مکانوں میں بجلی کے سیل اور بیٹریاں بنانے کے متعلق

7 آئل انجن گائیڈ: شنکر سنگھ (ص: 392)

مواد: ہر قسم کے آئل انجنوں کو چلانے اور ان کی خرابیوں کو درست کرنے اور ان کے پرزوں کے متعلق

8 گرڈ آئل انجن گائیڈ: شنکر سنگھ (ص: 392) ناشر: مسلم جنرل بکس ایجنسی، لاہور

9 بچوں کے وائرلیس: لوک ناتھ (ص: 64، سال: 1962) ناشر: رفیق وزگار، لاہور

10 جوہر جلائے برقی: جواہر لال (ص: 108، سال: 1908) ناشر: دارالاشاعت، پنجاب، لاہور۔

عنوان: حساب

1 رسالہ مساحت مستمل وعلم مثلث: پنڈت اجودھیا پرشاد (1844)

2 رسالہ درباب پیمائش: مترجم: ہردیو سنگھ• 1948)

3 رسالہ اصول حساب: مترجم: بابو ہردیو پرشاد

4 علم اسطرلاب کروی (قلمی): رتن لال (ص: 309، سال: 1939)

دہلی کالج اور ورنیکلر سوسائٹی کے ذریعے چند تالیف وترجمہ شدہ کتابوں کی فہرست:

1 علم حکمت (میکانکس): چارلیوفنک (1843)

2 اصول فوائد مائیات: اجودھیا پرشاد (1948)

3 مراۃ العلوم: ہری ورمن لال (1849)

4 جغرافیہ ہند: پنڈت سواروپ نرائن (1948)

5 خلاصہ نظام آسمانی: پنڈت واسی (1852)

6 ہندنامہ کاشکاری: موتی لال (1952)

7 ہوا کا بیان (طبعیات): بدری لال (1854)

8 بخار کی کل (اسٹیم انجن): ایشورلال (1855)

9 معدنیات: جواہر لال (1855)

یہ تو چند مثالیں تھیں ورنہ تلاش وجستجو کرنے پر سیکڑوں نہیں ہزاروں غیر مسلمین کی تصانیف ملیں گی۔ اب آیئے چند ایسے غیر مسلموں سے تعارف حاصل کیا جائے جنھوں نے حال میں اپنی اردو میں سائنسی تصانیف کے ذریعہ سائنسی اردو ادب میں خاطر خواہ اضافہ کیا۔

ماسٹر رام چندر: آپ ہندوستان کی ریاست ہریانہ علاقہ پانی پت میں 1821 میں پیدا ہوئے۔ آپ مشہور ریاضی داں، معلم، محقق، مترجم اور صحافی تھے۔ آپ دہلی کالج (موجودہ ذاکر حسین دہلی کالج) سے 1844 میں تعلیم مکمل کر کے اپنے مادر علمی یعنی دہلی کالج میں ہی مدرس برائے سائنس اور ریاضی کے عہدے پر فائز ہوئے، یہاں آپ نے اردو کے ذریعہ الجبرا، علم مثلث (Trigonometry) اور ریاضی کے دوسرے عنوانات کا درس دیا۔ آپ نے انڈین انسٹی ٹیوٹ آف ٹیکنالوجی رُڑکی میں بھی ملازمت کی۔ آپ نے بہت سارے سائنسی عنوانات پر اردو میں مضامین لکھے مثلاً چھاپے کی ایجاد کا بیان، دلچسپ بیان نمک کا علم ہیئت، حال دوربین، حال جسم اور عقل انسان، طبیعات اہل ہند کا بیان وغیرہ

دہلی کالج کے پرنسپل فیلکس بٹروز نے 1840 میں Delhi Vernacular Translation Society کی بنیاد ڈالی جس کا مقصد انگریزی میں لکھی نصابی کتابوں کا اردو میں ترجمہ کرنا تھا تو رام چند بابو پورے طور پر اس سوسائٹی سے منسلک ہو گئے۔ اس سوسائٹی کے ذریعے انگریزی میں لکھی ہوئی ادویات، ریاضی، سائنس، قانون، معاشیات اور تاریخ کی کتابوں کے تراجم ہوئے۔

رام چندر نے 23 مارچ 1845 کو اپنی ادارت میں ایک پندرہ روزہ اخبار 'فوائد الناظرین' جاری کیا جس میں تاریخ، سیاست، ہیئت و ریاضیات، مابعد الطبیعات والٰہیات کے علاوہ یورپ کے علوم وفنون سے مستفاد ماخوذ مضامین شائع ہوتے تھے۔ فوائد الناظرین میں شائع چند مضامین بیان پن چکی کا، علم ہیئت، بیانات حیوانات کا، حال جانوروں عجیب کا، معرفت طبی، مقناطیس بنانے کی ترکیب، حال ستارہ مشتری کا، مریخ ستارہ کا بیان اور وجود کیڑوں کا پانی میں وغیرہ۔ آپ نے اکتوبر 1847 میں ایک علمی وادبی ماہنامہ 'خیر خواہ ہند' بھی جاری کیا جس میں بھی سوانح، جغرافیہ، ریاضی اور طبیعات سے متعلق مضامین شائع ہوتے تھے۔ اس کے مدیر وہ خود تھے۔ رام چندر نے کئی کتابیں سائنسی اور ریاضی پر لکھیں۔ چند کے نام اس طرح ہیں:

1 اصول علم مثلث وتراشیائے مخروطی مع علم ہندسہ (1844)

2 اصول جبر ومقابلہ (1845) سریع الفہم حساب (1850)

3 ہندسہ الجبرا (1852)

آپ نے بے شمار سائنسی اور ریاضی کی کتابوں کے ترجمے اردو میں کیے۔ چند نام اس طرح ہیں:

1 رگھوناتھ کا رسالہ 'علم طبعیات'

2 دیارام کی 'آسمانی سائنس'

3 چندر لال کی 'ارض النجوم'

4 دیوی پرساد کی 'تلخیص الحساب'

5 جادو چند چکرورتی کی 'علم ریاضی'

6 ہندسہ بالجبر

7 عجائب روزگار (طبعیات)

آپ کی وفات 11 اگست 1880 کو ہوئی۔

کرشن چندر:

آپ کی پیدائش 23 نومبر 1914 کو وزیرآباد گوجرانوالہ، پنجاب (موجودہ پاکستان) میں ہوئی۔ آپ ممتاز افسانہ نگار اور ناول نگار تھے۔ آپ کی تعلیمی لیاقت ایم اے، ایل ایل بی ہے۔ آپ عرصہ تک رسالہ 'نیا ادب' کی ادارت سے وابستہ تھے۔ پھر آل انڈیا ریڈیو، دہلی میں پروگرام اسسٹنٹ ہوئے۔ اس کے بعد ملازمت ترک کر کے ممبئی چلے گئے جہاں آخری دم تک فلم انڈسٹریز سے منسلک رہے۔ آپ کے دو ناول الٹا درخت اور ستاروں کی سیر سے بچے سائنسی معلومات سے بہرہ ور ہوتے ہیں۔

اُلٹا درخت: یہ کتاب 149 صفحات پر مشتمل ہے جسے اوپندر ناتھ نے 1954 میں شائع کیا۔

ستاروں کی سیر: یہ کتاب 138 صفحات پر مشتمل ہے جسے قومی کونسل برائے فروغ زبان اردو نے 2013 میں مکتبہ جامعہ لمیٹیڈ، نئی دہلی کے اشتراک سے شائع کیا۔ یہ ایک سائنسی ناول ہے جو اردو بچوں کے فکشن میں ایک شاہکار درجہ رکھتا ہے۔ یہ بچوں کو سائنسی یجادات وکائنات کے اسرار سے واقفیت کراتا ہے۔

آپ کی وفات 8 مارچ 1977 کو ممبئی میں ہوئی۔

ظفر پیامی

آپ کا اصل نام دیوان بیرندر ناتھ ہے آپ کی پیدائش 6 جنوری 1932 کو بہرائچ (یوپی) میں ہوئی۔ آپ مشہور افسانہ اور ناول نگار ہیں۔ آپ ممتاز صحافی، ادیب، افسانہ نگار اور ناول نگار رہے ہیں۔ آپ نے بھی ایک ناول 'ستاروں کا قیدی' لکھ کر بچوں کو خوب سائنسی معلومات فراہم کیں ہیں۔ یہ کتاب 142 صفحات پر مشتمل ہے جسے کھلونا بک ڈپو، نئی دہلی نے شائع کیا ہے۔

آپ کی وفات یکم دسمبر 1989 کو دہلی میں ہوئی۔

پرکاش پنڈت

آپ کی پیدائش 1924 میں ہوئی۔ آپ مشہور ادیب اور افسانہ نگار ہیں۔ آپ نے بچوں کے لیے کئی سائنسی کتابیں لکھیں ہیں۔ چند کی تفصیلات اس طرح ہیں:

1 چاندی کی چوری (ص: 34، سنہ: 1958، ناشر: کھلونا بک ڈپو، دہلی)

مواد: یہ ایک ناول ہے جس میں ایٹم بم، ہائیڈروجن بم اور نائیٹروجن بم وغیرہ کی جانکاری فراہم کی گئی ہے۔

2 چاند کی سیر (ص: 34، سن: 1956، ناشر: کھلونا بک ڈپو، دہلی)

مواد: یہ ایک سائنسی ناول ہے جس میں فلکیات اور چاند تک پہنچنے تک کی تفصیل بیان کی گئی ہے۔

3 چڑیا گھر (ص: 50، سن: 1957، ناشر: کھلونا بک ڈپو، دہلی)

مواد: یہ کتاب کہانی کی شکل میں بچوں کو جانوروں کے بارے میں معلومات فراہم کرتی ہے۔

4 سرکس کے کھیل،

5 ستاروں کی سیر

آپ کی وفات 1982 میں ہوئی۔

اندر جیت لال

آپ کی پیدائش 26 اکتوبر 1926 کو راولپنڈی، پنجاب (پاکستان) میں ہوئی۔ آپ ہجرت کر کے ہندوستان آئے۔ آپ نے اردو میں کئی سائنسی کتابیں تصنیف کیں جیسے سائنس کی باتیں، آج کی سائنس، ایٹم کی کہانی اور ہمارے سائنس داں وغیرہ۔ آپ نے شکتی ایم گپتا کی کتاب 'بیربل سہانی' کا اردو میں ترجمہ بھی کیا۔

پریم پال اشک

آپ نے 'ہمارا سنیما' کتاب لکھی جسے ترقی اردو بیورو، نئی دہلی (موجودہ قومی کونسل برائے فروغِ اردو زبان) نے 1987 میں شائع کیا ہے۔ا۔ یہ کتاب 103 صفحات کی ہے جس کے اندر فوٹو گرافی کی ارتقا، سنیما کی ابتدا اور ارتقا، ہندوستانی سنیما کی ابتدا اور ارتقا، فلم سازی، فلم سازی کے چند اہم شعبے اور اصطلاحات جیسے عنوانات شامل ہیں۔

بلراج پوری

آپ نے 'سائنس دانوں کی کہانیاں' لکھی جسے قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان نے شائع کیا۔

یہ کتاب مختلف سائنس دانوں کی حیات وکارنامے کی جانکاری فراہم کرتی ہے۔

آنند موہن گلزار دہلوی

آپ کی پیدائش 7 جولائی 1926 کو قدیم دہلی کے گلی کاشمیران میں ہوئی۔ آپ ہندوستان کا سہ ماہی رسالہ 'سائنس کی دنیا' کے پہلے مدیر تھے جس کے پہلے شمارے کا اجرا 20 جون 1975 کو ہوا۔ آپ نے سائنس کی دنیا کے اول شمارے سے اپنی مدت ادارت تک لگاتار سائنسی اداریہ، سائنس نامہ اور سائنسی لغات لکھا۔ آپ کے کئی سائنسی مضامین رسالہ سائنس کی دنیا کی زینت بنے۔ مثلاً لغات کے ستارے: سائنسی اصطلاحوں کے قریبی مفہوم (اکتوبر-دسمبر 1978)، 1400 سال ہجری میں سائنسی علوم سے متعلق چند مسلمان (جولائی-دسمبر 1980)، ایٹم اور خلا کی میدان میں ہند وامریکی حلقہ تعاون (جولائی-ستمبر 1982) اور سویوزٹی 11، خلائی جہاز اور سکواڈرن: لیڈر راکیش شرما کا معرکہ (اپریل- جون 1984) وغیرہ۔ آپ ایک بہترین ترجمہ نگار بھی تھے۔ آپ نے سائنس کی دنیا کے اول شمارے میں ڈاکٹر ایس سدھو کے مضمون کوئلہ، قوت اور کیمیات کا ذریعہ اور ایم آر رمن کے مضمون پانچویں پنج سالہ منصوبے میں سائنس اور ٹیکنالوجی کا اردو میں ترجمہ بھی کیا۔ آپ بہترین شاعر بھی تھے۔ سائنس کی دنیا کے ایک شمارے میں ایک بہترین سائنسی شعر رسالے کی زینت بنا ہوا ہے۔

پس بلندی عرفان طور جانا ہے
ابھی تو ہم کو ستاروں سے دور جانا ہے

آپ نے کئی سائنسی قطعات اور نظمیں بھی لکھیں۔ نمونے کے طور پر سائنس کی دنیا (جولائی۔ ستمبر 1976) میں شائع ایک سائنسی نظم دیکھیے۔

یہ کم احسان ہے سائنس کا ہم خاک دانوں پر
کہ اب بڑھ کر کمندیں ڈالتے ہیں آسمانوں پر
کرشمہ ہے یہی علمِ آدم کا بزم آدم میں
کوئی شے بھی نہیں ہے دور ہم سے دونوں عالم میں
مگر ہم کو ابھی منزل بہ منزل دور جانا ہے
عطارد سے پرے بن کر پیام نور جانا ہے
ابھی تقدیر کو بھی تابع تدبیر کرنا ہے
ابھی مریخ و زہرہ کو ہمیں تسخیر کرنا ہے
اُدھر راز مشیت آشکارا ہوں گے ہم تم پر
اِدھر نقش قدم انسان کے نیچے ماہ و انجم پر
اگر جوش جنوں عزم وعمل پھر اوج پر آئیں
تو پھر معراج آدم کی حقیقت کیوں نہ دہرائیں
یہ دو عالم میں اب اعلان کردو، بے گماں ہوگا
کہ انساں ہی وزیر اعظم کون و مکاں ہوگا
ستارے پیش پا ہوں گے فرشتے کامراں ہم سے
ملے گی عافیت انساں کو دنیا کے ہر اک غم سے
یہی اصل شہود و غیب ہستی عدم ہوگا
یہی دنیا میں عالم نو گلزار ارم ہو گا

آپ نے ایک نہایت ہی معلوماتی مضمون 'اردو سائنسی صحافت ایک سرسری جائزہ' لکھا جس میں انھوں نے ماقبل آزادی اور بعد آزادی ہندوستان کی سائنسی صحافت کی ہر ممکن جانکاری فراہم کی ہے جو محققین کے لیے نعمت غیر مترقبہ سے کم نہیں ہے۔

آپ کی وفات 12 جون 2020 کو نوئیڈا میں ہوئی۔

حواشی ومراجع

1 اردو میں سائنسی ادب کا اشاریہ: ڈاکٹر ابواللیث صدیقی، پروفیسر ایمریطس، کراچی یونیورسٹی
سنہ اشاعت: 1981 (اول)، سلسلہ مطبوعات مقتدرہ قومی زبان (1)

2 اردو کے ہندو شعرا (حصہ اول): جگدیش مہتہ درد: 1972، ناشر: جگدیش مہتہ درد، بیانی ویکلی، دہلی-6.

3 اردو میں سائنسی ادب: ڈاکٹر خواجہ حمیدالدین شاہد، سنہ اشاعت: 1964، ایوان اردو کتاب گھر، کراچی

4 اردو میں سائنسی ادب (قدیم ترین کارنامے): خواجہ حمیدالدین شاہ، سنہ اشاعت: 1957، سب رس کتاب گھر، حیدرآباد

5 شمس الامرا کے سائنسی کارنامے، سلسلۂ مطبوعات: خواجہ حمیدالدین شاہ، ادارہ ادبیات اردو

6 سائنس کی دنیا، نئی دہلی کے مختلف شمارے

■

Abdul Wadood Ansari
Shadaab Manzil, House No:43/2, Gali No:6
P.O.Kankinara-743126 (W.B)
Mob: 9674895235
Email:ansariwadood85@gmail.com

رفیعہ سلیم

فضل الرحمن: شخص اور شاعر

فضل الرحمن 25 /دسمبر 1901 میں حیدر آباد میں پیدا ہوئے، اپنے والد مولوی عبداللہ کے دامن تربیت میں عربی اور فارسی کی ابتدائی تعلیم حاصل کی، چادر گھاٹ ہائی اسکول سے میٹرک پاس کیا،پھر حیدر آباد کے نظام کالج سے انٹر میڈیٹ کرنے کے بعد پونہ چلے گئے، وہاں اپنے تعلیمی جوہر دکھاتے ہوئے اعلیٰ تعلیم کے مدارج طے کرتے چلے گئے، ان کی صلاحیتیں دیکھ کر پونہ دکن کالج نے انھیں فیلو شپ کے اعزاز سے نوازا، بعد ازاں بمبئی یونیورسٹی سے انھوں نے 1923میں بی،اے آنرز کی ڈگری حاصل کی۔

بیسویں صدی کا آغاز ہندوستان میں مسلمانوں کے لیے ایک کشمکش کا دور تھا۔مسلم معاشرے کے سامنے سب سے پہلے اہم سوال یہ تھا کہ کون سی راہ اختیار کرنی ہے۔ ایک طرف زوال پذیر تہذیب تو دوسری طرف مغربی تہذیب کے اثرات ہندوستانیوں کو متاثر کر رہے تھے۔ یہ ابتدائی زمانہ مسلمانوں کی سیاسی پستی کا آئینہ دار تھا۔جو آہیں بھرتی سسکیاں لیتی تہذیب کا مظہر بھی تھا لیکن اس کے ساتھ ہی ساتھ اردوادب کے عروج کا دور بھی نظر آتا ہے۔ایسے دور میں ہندوستانی ادب کے افق پر کئی ستارے جلوہ گر ہوئے جن میں قابل ذکر فضل الرحمٰن بھی ہیں۔ جنھوں نے اپنی ادبی زندگی کے حوالے سے شعروادب کے ایوانوں کو منور کیا۔

فضل الرحمٰن نے بیسویں صدی کے ماحول میں آنکھیں کھولیں جو ہر لحاظ سے ہندوستان میں جمود کا دور تھا اور جب شباب کی منزل پر پہنچے تو پہلی جنگ عظیم کے بادل سارے ماحول پر چھائے ہوئے تھے اور مشرقی تہذیبی قدروں کے درمیان کشاکش عروج پر تھی۔

فضل الرحمٰن کا تعلق نوائط خاندان سے تھا۔ اہل نوائط کے متعلق یہ بات مشہور ہے کہ وہ بہت زیادہ پڑھے لکھے اور ذہین وفطین ہوتے ہیں۔بقول عزیز رضوی:

’’فضل الرحمٰن نوائط خاندان کے چشم و چراغ تھے۔جس کا مقصد ہی حصول علم رہا ہے۔حتیٰ کہ اس خاندان کی خواتین بھی کافی پڑھی لکھی اور علم دوست ہوتی ہیں۔‘‘

(شخصی انٹرویو:عزیز رضوی)

فضل الرحمٰن کے آباواجداد کسی زمانے میں مدراس کی سکونت ترک کر کے شہر حیدرآباد چلے آئے۔آج بھی ان کے خاندان کے افراد حیدرآباد کے علاقہ ’بنجارہ ہلز‘ پر قیام پذیر ہیں۔فضل الرحمٰن کے والد مولوی عبداللہ موروثی منصب دار، خاندانی عالم دین،صوفی منش،اور پیشہ ور حکیم تھے۔ وہ چاہتے تھے کہ ان کی اولاد حدیث وفقہ کا درس حاصل کریں اور دینی مدارس میں درس وتدریس کا سلسلہ قائم رکھیں۔

مولوی عبداللہ کے خیال میں انگریزی تعلیم حاصل کرنا کفر کے برابر تھا۔اس لیے انھوں نے اپنے بچوں کو ایک دینی مدرسے میں داخل کروایا۔لیکن ان کی دور اندیش والدہ شمس النساء بیگم کی کاوشوں سے فضل الرحمٰن، ان کے بڑے بھائی عطاالرحمٰن اور خلیل الرحمٰن کو انگریزی مدرسے میں داخلے کی اجازت مل گئی۔ شمس انساء بیگم کی کاوشوں کا نتیجہ تھا کہ علم وادب کی دنیا میں تینوں بھائیوں نے اپنے نام روشن کیے۔

فضل الرحمٰن 25 /دسمبر 1901 میں حیدرآباد میں پیدا ہوئے۔ اپنے والد مولوی عبداللہ کے دامن تربیت میں عربی اور فارسی کی ابتدائی تعلیم حاصل کی۔ چادر گھاٹ ہائی اسکول سے میٹرک پاس کیا،پھر حیدرآباد کے نظام کالج سے انٹر میڈیٹ کرنے کے بعد پونہ چلے گئے۔ وہاں اپنے تعلیمی جوہر دکھاتے ہوئے اعلیٰ تعلیم کے مدارج طے کرتے چلے گئے۔ ان کی صلاحیتیں دیکھ کر پونہ دکن کالج نے انھیں فیلوشپ کے اعزاز سے نوازا۔ بعد ازاں بمبئی یونیورسٹی سے انھوں نے 1923 میں بی۔اے آنرز کی ڈگری حاصل کی۔

تعلیم سے فارغ ہو کر فضل الرحمٰن نے ملازمت کا آغاز بحیثیت لکچرر معاشیات،سٹی کالج کیا جو آج بھی شہر حیدرآباد کا ایک نامور کالج مانا جاتا ہے۔ درس وتدریس کے علاوہ آزادی ہند کی تحریکوں میں سرگرم حصہ لینے کی وجہ سے انھیں ملازمت سے استعفیٰ دینا پڑا۔ ملازمت سے مستعفی ہونے کے بعد انھوں نے اسٹیج اور ڈراما نگاری کی طرف رخ کیا۔ انھیں بحیثیت ڈراما نگار ملک گیر شہرت حاصل ہوگئی تھی۔ اس شہرت اور مقبولیت کے نتیجے میں جب سنہ 1938 میں محکمہ نشریات کی تنظیم جدید ہوئی تو علی یاور جنگ جو محکمہ نشریات کے معتمد تھے، انھوں نے فضل الرحمٰن کی خدمات حاصل کیں۔ملازمت کے دوران انھیں حکومت کی طرف سے بی بی سی نشریات کی باقاعدہ ٹریننگ حاصل کرنے کے لیے لندن روانہ کیا گیا۔ وہاں انھوں نے چھ ماہ تربیت حاصل کی۔ بعد ازاں مارکونی (مصر) میں ایک ماہ کی تربیت حاصل کر کے 1941 میں

ہندوستان لوٹے اور انھیں دکن ریڈیو میں ناظم لاسلکی کے عہدے پر فائز کیا گیا۔

1946 تک وہ ریڈیو سے وابستہ رہے۔ کچھ عرصے بعد ان کی خدمات محکمہ تعلیم کے سپرد کر دی گئی جہاں وہ محکمہ تعلیم کے ڈائریکٹر کی حیثیت سے اپنی خدمات انجام دیتے رہے اور وہیں سے وظیفے پر سبکدوش ہوئے۔ علاوہ ازیں تقریباً پندرہ سال تک شعر وادب، اسٹیج اور ڈراما نگاری سے وابستہ رہے۔ اسی اثنا میں علی یاور جنگ کے کہنے پر جو حیدرآباد کے محکمہ تعلیم اور بعد میں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے وائس چانسلر ہوئے، فضل الرحمٰن علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں بحیثیت پرو وائس چانسلر کا عہدہ سنبھالا اور وہیں سے سبکدوش ہوئے۔ بعد ازاں انھیں علی یاور جنگ نے اردو انسائیکلوپیڈیا کی ذمے داری سونپی، 1973 میں یہ کام شروع ہوا اور فضل الرحمٰن نے بحیثیت چیف ایڈیٹر اپنی ذمے داری بخوبی نبھائی۔ 1981 میں اردو انسائیکلوپیڈیا کے کام کی تکمیل ہوئی۔

محمد فضل الرحمٰن تاعمر مجرد رہے۔ آپ کی طبیعت میں سادگی کوٹ کوٹ کر بھری تھی۔ جس سے بھی ملتے بڑے ہی پرخلوص انداز میں ملتے۔ جس محفل میں جاتے رونق پیدا کر دیتے، جس محفل میں بیٹھتے وہاں چار چاند لگا دیتے، طبیعت میں انکساری، ملنساری کے علاوہ ہمدردی کا جذبہ بے حد نمایاں تھا۔ خاندانی افراد ہوں کہ دوست احباب ہر ایک کے ساتھ ہمدردانہ رویہ رکھتے تھے۔ آخر کار اردو ادب کی مشہور و معروف شخصیت فضل الرحمٰن نومبر 1992 کو علی الصبح چار بج کر 30 منٹ پر آفتاب کے طلوع ہونے سے پہلے غروب ہوگئی۔ یہ شہر حیدرآباد کا ایک ایسا آفتاب تھا جو آسمان علم و ادب پر نور کی کرنیں بکھیرتا رہا۔ فضل الرحمٰن نے تقریباً 91 برس اس دنیائے آب وگل میں ایک دانشورانہ حیات کی تکمیل کی اور مالک حقیقی سے جا ملے۔

ان کی موت پر ادارہ ادبیات سے شائع ہونے والا ماہنامہ رسالہ 'سب رس' شمارہ 12 جلد 54، دسمبر 1992 میں مغنی تبسم کا دیا ہوا تعزیتی بیان اس طرح ہے:

''اردو کے ممتاز ڈرامہ نگار اور شاعر جناب فضل الرحمٰن صاحب 1992 کو 91 برس کی عمر میں انتقال کر گئے۔ وہ قدیم ریاست حیدرآباد میں نائب ناظم لاسلکی رہے۔ پھر محکمہ تعلیمات سے وابستہ ہو کر نائب ناظم کے عہدے سے سبکدوش ہوئے۔ بعد ازاں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے پرو وائس چانسلر بنائے گئے۔ ترقی اردو بیورو نے اردو انسائیکلو پیڈیا کے ڈائریکٹر کی حیثیت سے ان کی خدمات حاصل کیں اور ان کی عالمانہ رہنمائی میں یہ کام تکمیل کو پہنچا۔ وہ مرکزی انجمن ترقی اردو دہلی اور انجمن ترقی اردو آندھرا پردیش سے وابستہ رہے۔ جناب فضل الرحمٰن صاحب مرحوم منفرد رنگ کے شاعر تھے۔ ان کے کلام کے مجموعے 'دھوپ چھاؤں'، 'بساط نو'، 'نوائے فطرت' اور 'نگار حکمت' کے نام سے شائع ہو چکے ہیں۔ انھوں نے اردو میں ڈرامائی صنف کو فروغ دینے میں نمایاں حصہ لیا۔ ڈراموں کے متعدد مجموعے شائع کیے۔ جن میں 'ظاہر و باطن'، 'روشنی'، 'سقراط'، 'چنگیز' اور 'آئندہ زمانہ' قابل ذکر ہیں۔ انھوں نے گوئٹے کی ڈرامائی نظم 'ہیلنا' کا منظوم ترجمہ کیا جو ادارہ ادبیات اردو کی طرف سے شائع ہوا۔ اس کے علاوہ البسن کے ڈرامے 'سمندری لٹیرے' کو اردو کا جامہ پہنایا۔ ادارہ 'سب رس' ان کے انتقال پر گہرے جذبات غم کا اظہار کرتا ہے۔ اللہ انھیں مغفرت عطا کرے اور متعلقین کو صبر جمیل کی توفیق دے۔''

فضل الرحمن کی قد آور شخصیت کا اندازہ ھمیں ان کی تخلیقات شعر وادب اور صنف ڈراما نگاری کے مطالعے سے ہوتا ھے۔ وہ ادب کو برائے ادب نھیں بلکہ ادب کو برائے زندگی سمجھتے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ ادب صرف مطالعے کے لیے نھیں ہوتاھے بلکہ ادب دراصل زندگی کا نچوڑ ھے۔ جس کے ذریعے ھم زندگی کے نشیب و فراز بھتر انداز میں طے کر سکتے ھیں۔انھیں دوران تعلیم ھی سے صنف ڈراما نگاری سے دلچسپی رھی۔اس لیے انھوں نے آگے چل کر اپنی توجہ ڈراما نگاری پر منعطف کر دی۔ اس بات کا اندازہ ھمیں ان کی ڈراما نگاری کے مطالعے سے ہوتا ھے۔ وہ اردو ڈراما نگاری کی انجمن کے اساسی رکن نظر آتے ھیں۔

فضل الرحمٰن کی شخصیت ایک پہلو دار شخصیت تھی۔ وہ ملنسار، خوشگوار، سادگی پسند، خوش مزاج، خوش اطوار انسان تھے۔ انھوں نے اپنی ادبی زندگی کی ابتدا ڈراما نویسی سے کی، اس کے باوجود شاعری فضل الرحمٰن کے دامن سے چمٹی رہی۔ ان کی شاعرانہ صلاحیتوں کا اندازہ ان کے کلام سے ہوتا ہے۔ اعلیٰ اقدار کے حامل شاعروں میں شہر حیدرآباد کے ممتاز و معروف ترقی پسند شاعر فضل الرحمٰن کی ہمہ گیر شخصیت بھی پورے آب وتاب کے ساتھ سامنے آتی ہے۔ بلکہ ایک طرف تو وہ ڈراما نگار نظر آتے ہیں تو دوسری طرف شعر و شاعری میں ایک عندلیب، قادر الکلام شاعر، تصنیف وتالیف کے پیمانے سے دیکھیے تو مواد، اسلوب، ترتیب اور تحقیق کے اعتبار سے ہر تصنیف ایک شاہکار کا درجہ رکھتی ہے۔ بحیثیت ناظم ریڈیو کنٹرولر تو کبھی پرو وائس چانسلر (علی گڑھ مسلم یونیورسٹی) تو کبھی انگریزی کے استاد تو کبھی رسالوں کے مدیر، بہرحال ان کی شخصیت ایک صاحب ایجاد کی حیثیت رکھتی ہے۔ جسے انھوں نے صرف تصنیف وتالیف کے لیے وقف کر دی۔

فضل الرحمٰن کی قد آور شخصیت کا اندازہ ہمیں ان کی تخلیقات شعر وادب اور صنف ڈراما نگاری کے مطالعے سے ہوتا ہے۔ وہ ادب کو برائے ادب نہیں بلکہ ادب کو برائے زندگی سمجھتے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ ادب صرف مطالعے کے لیے نہیں ہوتا ہے بلکہ ادب دراصل زندگی کا نچوڑ ہے۔ جس کے ذریعے ہم زندگی کے نشیب وفراز بہتر انداز میں طے کر سکتے ہیں۔ انھیں دوران تعلیم ہی سے صنف ڈراما نگاری سے دلچسپی رہی۔ اس لیے انھوں نے آگے چل کر اپنی توجہ ڈراما نگاری پر منعطف کر دی۔ اس بات کا اندازہ ہمیں ان کی ڈراما نگاری کے مطالعے سے ہوتا ہے۔ وہ اردو ڈراما نگاری کی انجمن کے اساسی رکن نظر آتے ہیں۔

فضل الرحمٰن نے اپنی ادبی زندگی کی ابتدا ڈراما نویسی سے تو کی لیکن وہ ایک اچھے شاعر بھی رہے ہیں۔ انھوں نے کوئی تخلص اختیار نہیں کیا۔ بقول فضل الرحمٰن کہ ''اس دور میں بھی شعر کہنا ان کا مشغلہ تھا۔'' اس بارے میں فضل الرحمٰن خود رقم طراز ہیں:

''میں ہر چیز زیر لب کہتا ہوں اور تحت اللفظ سناتا ہوں۔ محفل آرائیوں سے الگ، جماعت بندیوں سے دور گوشۂ تنہائی میں فکر سخن کرنے کا عادی ہوں۔ جب ڈراموں کے مکالموں سے تشفی نہیں ہوتی تو اشعار گنگناتا ہوں کیوں کہ ڈرامے کی نسبت شاعری میں اپنے جذبات اور خیالات کے راست اظہار کا بہتر موقع حاصل ہے۔ شاید اظہار خیال کا یہی شوق مجھے اس میدان میں لے آیا ہے۔'' (بساط نو از فضل الرحمٰن، ص:20)

گویا شاعری کا یہ ابتدائی دور جو ڈھکا چھپا ہی رہا، آخر ان کا یہ شوق اس وقت سامنے آیا جب ان کا اولین مجموعہ 'دھوپ چھاؤں' کے نام سے 1945 میں شائع ہوا۔ فضل الرحمٰن اپنی شاعری اور مجموعوں کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

فضل الرحمن کا ماننا تھا کہ شاعری دراصل دل و دماغ کو سر سبز و شاداب کرتی ھے۔جو خیالات اور موضوعات شاعری میں پیدا کیے جا سکتے ھیں وہ نثر نگاری میں نھیں کر سکتے۔وہ اپنی ذات میں ایک انجمن تھے۔ علم و ادب کی راھوں کو روشن کرنے کے لیے انھوں نے نمایاں خدمات انجام دیں۔عالمی امن کی تحریک اور ایٹمی دور کی انقلابی تبدیلیوں سے متاثر ھو کر انھوں نے جو نظمیں کھیں ان میں قابل ذکر ’طلسم تخلیق‘، ’جوھری بم‘، ’جگ بیتی‘ وغیرہ ھیں۔

’’پچھلے برسوں میں نے اردو شاعری میں جو تجربے کیے تھے وہ سب مختلف موقعوں پر شائع کیے جا چکے ہیں۔ مجموعوں کی اشاعت سے قبل ان میں سے اکثر نظمیں ریڈیو سے نشر کی گئیں۔ بعض نظمیں مقامی اخباروں اور رسائل میں طبع ہوئیں یا مشاعروں میں پڑھی گئیں۔ میری نظموں کا پہلا انتخاب ’دھوپ چھاؤں‘ کے نام سے 1945 اور دوسرا انتخاب ’نقش حیات‘ 1948 میں چھپا۔ اس کے بعد ’گوتم بدھ‘ (منظوم سوانح) 1953 میں ’ہیلنا‘ گوئٹے کے ڈرامے کا منظوم ترجمہ 1958 میں ’نیا انسان‘ طبع زاد ڈرامائی نظم 1960 اور انگریزی اردو نظمیں جو منتخب انگریزی غنائی نظموں کے شعری ترجموں کا مجموعہ 1961 میں شائع ہوا۔ 1965 میں ’سرور وقت‘ کے نام سے ان کا انتخاب شائع ہو چکا ہے۔ لیکن اب یہ سارے مجموعے بازار میں تقریباً نایاب ہیں۔ اس لیے ان کا اب مزید انتخاب اپنی غیر مطبوعہ نظموں اور منظوم ترجموں کے ساتھ نذر ناظرین کر رہا ہوں۔‘‘ (پیش لفظ، نوائے فطرت، ص،3)

فضل الرحمٰن کی شاعری کے متعلق نصیر الدین ہاشمی لکھتے ہیں:

’’ان کے کلام میں زبان کی پاکیزگی، بحور کی موزونیت، تخیل کی لطافت اور مضامین کی بلندی قابل داد ہوتی ہے۔ وہ ترقی پسند شعرا میں بلند مقام رکھتے ہیں۔ وہ ترقی پسند ادب کے ایک نئے باب کی ترجمانی کرتے ہیں۔ ان کے کلام میں غنائیت کوٹ کوٹ کر بھری ہے۔ ان کا کلام لحن اور لطافتوں کا گنجینہ ہے۔ غلام یزدانی صاحب ان کو ان کی بلند پایہ شاعری اور بہترین نقاد کی بنا پر ان کو شاعری کا میتھو آرنلڈ قرار دیتے ہیں۔‘‘ (دکن میں اردو از نصیر الدین ہاشمی)

فضل الرحمٰن کی شاعری میں معنی آفرینی ہے۔ حسن و عشق کی رنگینیاں موجود ہیں۔ سلیس انداز میں انسان دوستی اور انسانی مسائل کے علاوہ سائنسی موضوعات پر مبنی نظمیں بھی موجود ہیں۔ زیادہ تر نظمیں مناظر فطرت، مسائل حکمت اور انسانی زندگی کے مراحل حیات کے مختلف عنوانات پر خیال آرائی کی گئی ہے۔ فضل الرحمٰن اپنی شاعری کے بارے میں لکھتے ہیں:

’’مغربی شاعروں کی طرح جدید اردو شاعری زندگی کے تمام مسائل پر طبع آزمائی کرتی ہے۔ نہ صرف حسن و عشق کی معاملہ بندیاں بلکہ سماجی، سیاسی اور اخلاقی مسائل کی پیچیدگیاں بھی ہماری شاعری میں داخل ہو گئی ہیں۔ اب یہ نہیں کہا جا سکتا کہ فلاں موضوع شعر و سخن کے لیے موزوں نہیں ہے۔ صرف یہ اعتراض کیا جا سکتا ہے کہ فلاں نظم میں شعریت نہیں ہے۔ اسی کسوٹی پر میں چاہتا ہوں کہ اس انتخاب کو پرکھا جائے اگر یہ محسوس ہو کہ جن موضوعات پر جس طرح ان نظموں میں اظہار خیال کیا گیا ہے نثر میں بہتر طریقے پر انھیں پیش کیا جا سکتا تھا۔ یوں پھر میں تسلیم کروں گا کہ ساری کوششیں رائیگاں ہوئی ہیں۔‘‘

یقیناً فضل الرحمٰن نے قدیم روایتی شاعری جس میں حسن و عشق کی سرمستی ہوا کرتی تھی، صنف نازک کی خوبصورتی میں شعرائے کرام تعریفوں کے پل باندھتے تھے، اس سے ہٹ کر الگ روش اختیار کی۔ قدیم شعرا سے انحراف ان کا مقصد نہیں بلکہ عصر حاضر کے تقاضوں کو اپنی شاعری کے ذریعے انسانی زندگی اور کائنات کی افادیت کو اجاگر کرنے کی کوشش کی ہے۔ عصری تقاضے میں آزاد خیالی، انسان دوستی، بھائی چارے اور قدرتی مناظر کے اچھے نمونے ملتے ہیں۔ جیسے ان کی نظمیں ’کار گاہ حیات‘، ’کرشمہ وجود‘ جو اپنے اندر شاعرانہ اسلوب کے ساتھ ساتھ انسانی زندگی اور کائنات کی افادیت کو اجاگر کرتی نظر آتی ہیں۔ ان کی نظموں میں نئے عہد کی نشاندہی بھی ملتی ہے۔ مثلاً ’نیا زمانہ‘ اور ’نئے صبح و شام‘ وغیرہ۔

فضل الرحمٰن کی شاعری اردو ادب کا بیش بہا سرمایہ ہے۔ بقول فضل الرحمٰن:

’’ڈرامے کی نسبت شاعری میں اپنے جذبات اور خیالات کے راست اظہار کا بہتر موقع حاصل ہے۔ شاید اظہار خیال کا ہی شوق مجھے اس میدان میں لے آیا ہے۔‘‘ (پیش لفظ، نوائے فطرت، ص:4)

بعض خیالات و جذبات کو صرف شاعری میں ہی موزوں و مناسب انداز سے ظاہر کر سکتے ہیں۔ فضل الرحمٰن کو قدرتی مناظر سے بے حد دلچسپی تھی۔ جنگل، پہاڑ، سمندر، دریا، چٹانیں وغیرہ اس بات کا اندازہ ان کے کلام میں موجود منظر کشی کے نمونوں سے ملتا ہے۔ مثلاً

منظر زندگی سراب نہیں
یہ نظارہ خیال و خواب نہیں
ہر گھڑی ایک نئی چمک ہے و لے
سیمیا کی یہ آب و تاب نہیں

اس کے علاوہ انھیں مشاعروں سے بھی دلچسپی تھی۔ ملازمت سے لے کر سبکدوش ہونے تک وہ مشاعروں میں شرکت کرتے رہے اور بہت لطف اندوز ہوتے رہے۔ مشاعروں سے دلچسپی کا یہ عالم تھا کہ سبکدوشی کے بعد اپنے ہی گھر کی چھت پر شعری نشست کا اہتمام کرتے۔ جس میں اس وقت کی شاعرانہ شخصیتیں حصہ لیتیں۔ خاص طور پر مخدوم محی الدین اہمیت کے حامل ہیں جو خود بھی اپنا کلام سناتے تھے۔

فضل الرحمٰن کا ماننا تھا کہ شاعری دراصل دل و دماغ کو سر سبز و شاداب کرتی ہے۔ جو خیالات اور موضوعات شاعری میں پیدا کیے جا سکتے ہیں وہ نثر نگاری میں نہیں کر سکتے۔ وہ اپنی ذات میں ایک انجمن تھے۔ علم و ادب کی راہوں کو روشن کرنے کے لیے انھوں نے نمایاں خدمات انجام دیں۔ عالمی امن کی تحریک اور ایٹمی دور کی انقلابی تبدیلیوں سے متاثر ہو کر انھوں نے جو نظمیں کہیں ان میں قابل ذکر ’طلسم تخلیق‘، ’جوہری بم‘، ’جگ بیتی‘ وغیرہ ہیں۔ طلسم تخلیق سے چند اشعار دیکھیے۔

بساط مہر بنے بزم ماہتاب بنے
نئے سرے سے یہ دنیائے خاک و آب بنے
اگر یہی ہے سماں ارتقائے فطرت کا
عجب نہیں جو ہر اک ذرہ آفتاب بنے

فضل الرحمٰن نے روایتی اسلوب کو قائم رکھتے ہوئے جدید تقاضوں کو پوری طرح ملحوظ رکھا۔ ان کے کلام میں انسان دوستی، آزاد خیالی، بھائی چارگی وغیرہ کے جذبے ملتے ہیں۔

نظم ’چالیس کروڑ‘ سے یہ شعر ملاحظہ ہوں۔

جب آگے بڑھیں گے دست و قدم
چالیس کروڑ انسانوں کے
ہل جائیں گے گنبد مشرق سے
مغرب تک سب ایوانوں کے

فضل الرحمٰن کی شاعری کی بنیاد قوم پرستی پر ہے اور اردو ادب میں اہمیت کی حامل اس لیے ہے کہ انھوں نے آزادی وطن اور مساوات پر اثر انگیز نظمیں کہی ہیں۔ ان کے خیالات میں وسعت اور افکار میں گہرائی ہے۔ انسانی

فضل الرحمن صاحب کا کوئی تخلص نہیں ہے۔ان کے کلام میں زبان کی پاکیزگی،بحور کی موزونیت، تخیل کی لطافت اور مضامین کی بلندی قابل داد ہوتی ہے۔ وہ ترقی پسند شعرا میں بلند مقام رکھتے ہیں۔ وہ ترقی پسند ادب کے ایک نئے باب کی ترجمانی کرتے ہیں۔ ان کے کلام میں غنائیت کوٹ کوٹ کر بھری ہے۔ ان کا کلام لحن اور لطافتوں کا گنجینہ ہے۔

زندگی کے مدوجزر، انسانی زندگی سے گہری محبت نے ان کے یہاں ایسی نغمگی پیدا کی ہے جس میں انسانیت کا سوز وگداز موجزن ہے۔ فضل الرحمٰن لکھتے ہیں:

''اگر یہ محسوس ہو کہ جن موضوعات پر جس طرح ان نظموں میں اظہار خیال کیا گیا ہے نثر میں بہتر طریقہ پر انھیں پیش کیا جا سکتا تھا۔ یوں پھر میں تسلیم کروں گا کہ ساری کوششیں رائیگاں ہوئی ہیں۔''

فضل الرحمٰن کی شاعری میں انگریزی کے مشہور شاعر میتھو آرنلڈ کا سا انداز ہے۔ اسی لیے ڈاکٹر یزدانی نے انھیں دکن کی شاعری کا میتھو آرنلڈ قرار دیا ہے۔ فضل الرحمٰن کی شاعری دراصل عوامی شعور کو جلا بخشنے کی ایک اچھوتی کوشش ہے۔ جس کا مطالعہ دل ودماغ کو نور وسرور ہی نہیں کارزار حیات کو ایک نئی جہت بھی عطا کرتی ہے۔ ان کی شاعری گھٹا ٹوپ اندھیرے کو دور کر کے بے حوصلہ انسانوں کے دلوں میں تزئین چمن کا جذبہ پیدا کرتی ہے۔ علاوہ ازیں فضل الرحمٰن کی شاعری میں رمزیت کے ساتھ ساتھ ترنم اور آہنگ سب میں ایک جدت کا احساس ہوتا ہے اور ایک نئی ابھرتی ہوئی روایت نظر آتی ہے۔ بقول فضل الرحمٰن:

''میری شاعری کی بنیاد اردو ادب کی ان ہی روایت پر رکھی گئی ہے۔ چنانچہ زیر نظر انتخاب میں چند سائنسی موضوعات سے قطع نظر کئی نظمیں مناظر قدرت سے متعلق ہیں یا وطنی آزادی، قومی اتحاد امن اور ترقی پر کہی گئی ہیں۔ متعدد ایسی نظمیں بھی ملیں گی جن سے اس ہنگامہ خیز زمانے کے حالات پر روشنی پڑتی ہے جس کے عہد آفریں نتائج آج بھی ہمارے سامنے ہیں۔''

1953 میں انھوں نے 'گوتم بدھ' (منظوم سوانح) نظم لکھی۔ 1958 میں المانوی شاعر اعظم گوئٹے کی تصنیف 'فاوسٹ' کا ترجمہ 'ہیلینا' کے نام سے منظوم ڈرامائی نظم کی شکل میں کیا جسے ادارہ ادبیات اردو کی طرف سے شائع کیا گیا۔ اس ترجمے کے تعلق سے فضل الرحمٰن لکھتے ہیں:

''اپنے ترجمہ کے بارے میں کیا عرض کروں۔ میں جرمن زبان سے واقف نہیں اس لیے میں نے البرٹ لیتھام کے انگریزی ترجمے سے استفادہ کیا ہے۔ یوں بھی نظم کا نظم میں ترجمہ مشکل ہے۔ اصل اور نقل میں بڑا فرق ہو جاتا ہے اور یہ نقل کی بھی نقل ہے۔ اردو میں ڈرامائی شاعری کی اس قدر کمی نہ ہوتی تو شاید اس کی اشاعت کا بھی جواز نہ تھا۔ بہرحال اگر اس میں کوئی خامیاں ہیں تو وہ میری اپنی کوتاہی کا نتیجہ ہیں اور کچھ خوبی نظر آئے تو اسے المانوی شاعر اعظم کا فیض خیال کیجیے۔''

33 مارچ 1950 میں انھوں نے ڈرامائی نظم 'نیا انسان لکھی' جسے نیشنل فائن پرنٹنگ پریس چارکمان حیدرآباد سے شائع کیا گیا۔ اس منظوم ڈرامائی نظم کی تعریف کرتے ہوئے سلیمان اریب لکھتے ہیں:

''پہلے تو اردو ادب میں ڈرامے کی صنف باوجود بہت سی قابل قدر انفرادی کوششوں کے ابھی عہد طفولیت ہی میں ہے۔ پھر اردو نظم بھی مغربی زبانوں میں نظم نگاری کے ارتقا کو سامنے رکھتے ہوئے ابھی بہت پیچھے ہے۔ ایسی صورت میں منظوم ڈرامہ لکھنے کی ہمت کرنا ہی ایک مشکل کام ہے پھر اس میں فکر شاعری کرنا اور بھی مشکل ہے۔''

1961 میں فضل الرحمٰن نے 'انگریزی اردو نظمیں' کے نام سے منتخب انگریزی غنائیہ جس میں شکسپیر سے میتھو آرنلڈ تک تین صدیوں کی مشہور اور منتخب نظموں کا انتخاب جمع کیے اور 'انگریزی اردو نظمیں' کے نام سے شائع کیا۔ اس کتاب میں انگریزی نظموں کے انتخاب کے ساتھ ان کا انتخاب اردو ترجمہ بھی شامل کیا گیا ہے۔

1965 میں 'سرود وقت' کے نام سے ان کا انتخاب اردو زبان میں شائع ہو چکا۔ اور پھر تقریباً چودہ سال کی خاموشی کے بعد فضل الرحمٰن نے مارچ 1980 میں اپنا ایک اور مجموعہ کلام 'اسرار فطرت' کے نام سے شائع کیا۔ جس میں غیر مطبوعہ نظموں کے علاوہ منظوم ترجمے بھی شامل ہیں۔ ان کے سارے مجموعے بازار میں تقریباً نایاب تھے۔ اس لیے انھوں نے ان سب کا مزید انتخاب 'نوائے فطرت' کے نام سے شائع کیا۔ فضل الرحمٰن کے مطابق:

''سرود وقت کی اشاعت کے چودہ سال بعد اب یہ انتخاب جو زیادہ جامع ہے پیش کیا جا رہا ہے۔ اس میں منظوم ترجموں کے علاوہ اسرار فطرت کے موسومہ حصے میں چند تازہ ترین غیر مطبوعہ نظمیں بھی شامل کی گئی ہیں۔ جو چودہ سال کی خاموشی کے بعد کہی گئی ہیں۔ برخلاف سابقہ نظموں کے یہ نہ کسی رسالے میں شائع ہوئی ہیں اور نہ کسی محفل میں سنائی گئی ہیں۔ اس لیے ان کے حسن وقبح کے بارے میں کوئی رائے قائم کرنا خود میرے لیے بھی مشکل ہے۔''

اس کے بعد 'نگار حکمت' کے نام سے ان کی چند منظومات منظر عام پر آئیں۔ فضل الرحمٰن کی خواہش تھی کہ ان کا کلام پاکستان سے بھی شائع ہو اور پاکستانی احباب تک پہنچے۔ چنانچہ بہادر یار جنگ اکیڈمی کراچی نے ان کے کلام کا انتخاب 'بساط نو' کے عنوان سے 1987 میں شائع کیا۔ بقول عزیز رضوی:

''ان کی یہ دیرینہ خواہش رہی ہے کہ ان کا کلام پاکستانی بھائیوں تک پہنچے۔ خدا کے فضل وکرم سے ان کی یہ خواہش اب پوری ہو رہی ہے۔ اس انتخاب میں ان کے ساتھ شاید پورا انصاف نہ ہو لیکن انتخاب بہرحال انتخاب ہی ہوتا ہے۔'' (بساط نو، عزیز رضوی، ص16)

1991 میں 'سخن پارے' جو مختصر قطعات کا شعری مجموعہ ہے منظر عام پر آیا جسے انجمن ترقی اردو آندھرا پردیش نے شائع کیا۔ نصیرالدین ہاشمی لکھتے ہیں:

''فضل الرحمٰن صاحب کا کوئی تخلص نہیں ہے۔ ان کے کلام میں زبان کی پاکیزگی، بحور کی موزونیت، تخیل کی لطافت اور مضامین کی بلندی قابل داد ہوتی ہے۔ وہ ترقی پسند شعرا میں بلند مقام رکھتے ہیں۔ وہ ترقی پسند ادب کے ایک نئے باب کی ترجمانی کرتے ہیں۔ ان کے کلام میں غنائیت کوٹ کوٹ کر بھری ہے۔ ان کا کلام لحن اور لطافتوں کا گنجینہ ہے۔''

فضل الرحمٰن کی شاعرانہ عظمت کا سیر حاصل جائزہ ایک مختصر سے مضمون میں ممکن نہیں۔ لیکن اتنا ضرور عرض کر دوں کہ وہ روایتی انداز کے ساتھ ساتھ جدید تقاضوں کی بھی بھرپور عکاسی کرتے نظر آتے ہیں۔ ان کے یہاں فکر انسانی کا خوب اظہار ملتا ہے۔ جو فضل الرحمٰن کی انفرادیت کا خاصہ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ شاعر بے ساختہ کہہ اٹھتا ہے

نسل آدم ظلم کی چوکھٹ پہ جھک سکتی نہیں
بندشوں سے زندگی کی موج رک سکتی نہیں

■

Rafia Saleem
Asst. Professor, Dept of Urdu
University of Hyderabad
Hyderabad- (Telangana)
Mob.: 9700681530

محمد علم اللہ

بہت یاد آتے ہیں مر جانے والے

عبید صدیقی کی یاد میں

بچھڑ جانے کے بعد ملنے پر یقین نہیں کرنے والے عبید صدیقی ہمارے درمیان بیچ نہیں رہے۔ جانے کس وقت رات کی خاموشی اور تاریکی میں وہ چپ چاپ اس دنیا سے چلے گئے، نہ کسی سے کچھ کہا نہ سنا۔ اب وہ محض یادوں کے زنداں میں قید رہیں گے، شاید یہ شعر انھوں نے اپنے ہی لیے کہا تھا:

بچھڑیں گے اگر ہم تو دوبارہ بھی ملیں گے
مجھ کو تو بھروسہ نہیں کیا تجھ کو یقیں ہے

عبید صاحب سے میری پہلی ملاقات اس وقت ہوئی جب میں جامعہ ملیہ اسلامیہ میں انور جمال قدوائی ماس کمیونی کیشن ریسرچ سینٹر میں ماسٹرز میں داخلے کے لیے انٹرویو پینل کے سامنے پیش ہوا۔ انھوں نے اپنی بھاری آواز میں مجھ سے پوچھا کہ میں یہ کورس کیوں کرنا چاہتا ہوں۔ میں نے اس وقت کیا جواب دیا یہ تو یاد نہیں لیکن ان کی مسکراہٹ اب بھی یاد ہے جو اس بات کا عندیہ تھی کہ وہ میرے جواب سے مطمئن تھے۔ انٹرویو پینل میں ان کی موجودگی اور سوالات نے مجھے خود اعتمادی بخشی اور اپنے خواب کو شرمندہ تعبیر کرنے کا حوصلہ ملا۔

عبید صاحب اردو کے عمدہ شاعر ہونے کے ساتھ ساتھ انگریزی زبان پر بھی عبور رکھتے تھے۔ ماس کمیونی کیشن ریسرچ سینٹر کے ڈائریکٹر کے طور پر، انھیں بجا طور پر ایک سخت منتظم کے طور پر دیکھا جاتا تھا، باوجود اس کے ان کے سینے میں ایک مہربان اور حساس دل ہمیشہ دھڑکتا رہتا تھا۔

عبید صاحب ایک ذمے دار منتظم اور مشفق استاد بھی تھے۔ انھوں نے ہمیں چند دن ریڈیو پڑھایا تھا، مگر جو کچھ بھی پڑھایا تھا اب تک یاد ہے۔ عبید صاحب شاعری اور صحافت دونوں سے کما حقہ نباہ کرنے کی صلاحیت رکھتے تھے۔ جہاں ایک طرف صحافت کے پروفیسر کے طور پر صحافی گڑھے وہیں دوسری جانب بحیثیت شاعر انھوں نے اپنے مجموعہ کلام 'رنگ ہوا میں پھیل رہا ہے' کی شکل میں یادگار ادبی سرمایہ چھوڑا۔ شاعری اور صحافت دونوں میں عبید صاحب کے کارناموں نے انھیں ایک متاثر کن شخصیت بنا دیا تھا۔

بی بی سی سے وابستہ رہنے والی نعیمہ احمد مہجور عبید صدیقی کو گزشتہ تیس برسوں سے جانتی تھیں۔ ان کے بقول عبید صدیقی آل انڈیا ریڈیو میں پروگرام ایگزیکٹو بننے کے بعد سری نگر گئے جہاں ان کی ملاقات نعیمہ احمد سے ہوئی۔ نعیمہ بتاتی ہیں کہ عبید ایک صحافی سے زیادہ ایک ادبی شخصیت کے مالک تھے۔ 'ان کے سری نگر آنے کے بعد پہلی مرتبہ ایسا ہوا کہ کشمیری شاعروں اور ادیبوں کو باقاعدگی کے ساتھ ریڈیو سری نگر میں بلایا جانے لگا'۔ وہ کہتی ہیں کہ 'عبید ریڈیو پر زیادہ تر غیر سیاسی مباحثے بھی کرایا کرتے تھے لیکن کشمیر ایک ایسا خطہ ہے کہ جہاں غیر سیاسی اور ادبی محفلیں بھی سیاسی بن جایا کرتی ہیں اور ایسا ہی عبید صدیقی کے پروگراموں میں ہوا کرتا تھا۔ 'انھوں نے یہی انداز بی بی سی میں شمولیت کے بعد بھی اپنایا۔ بی بی سی میں بھی وہ انگریزی مراسلوں کے اردو میں ترجمے پر ہی اکتفا کرتے تھے، وہ اور ینگل جرنلزم کی حوصلہ افزائی نہیں کرتے تھے۔' نعیمہ کہتی ہیں لیکن وہ اپنے ساتھیوں کی بہت زیادہ حوصلہ افزائی کرتے تھے۔

عبید صدیقی 27 مئی 1957 کو مغربی یوپی کے شہر میرٹھ میں پیدا ہوئے تھے۔ انھوں نے ابتدائی تعلیم اپنے وطن ہی میں حاصل کی اور اعلی تعلیم کے لیے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی چلے گئے، شعبہ اردو میں ایم اے میں گولڈ میڈل حاصل کیا۔ اپنے کیریئر کا آغاز آل انڈیا ریڈیو سے کیا تھا اور سری نگر اسٹیشن سے وابستہ ہوئے۔ 1988 میں ان کا انتخاب بی بی سی لندن کی اردو سروس کے لیے ہوا اور 1996 تک بی بی سی میں خدمات انجام دیتے رہے۔

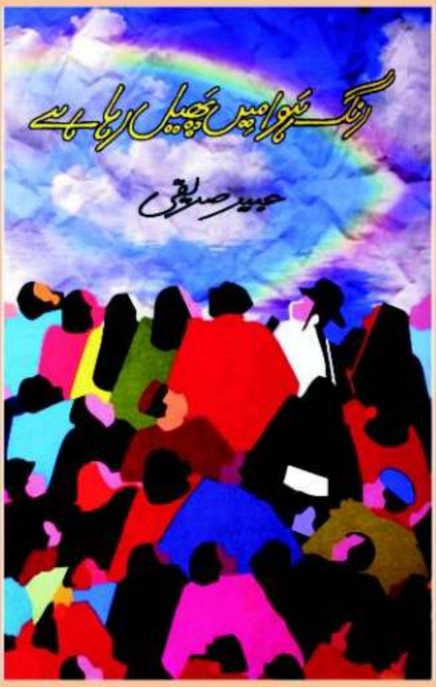

لندن سے واپسی کے بعد این ڈی ٹی وی میں شمولیت اختیار کی اور میگزین ایڈیٹر کے طور پر کام کیا۔ 2004 میں جامعہ ملیہ اسلامیہ کے ایم سی آر سی شعبے سے بطور پروفیسر وابستہ ہوئے۔

بی بی سی نے ان کے انتقال پر جو خبر شائع کی ہے، اس سے ان کے دوستوں کی نگاہ میں ان کی قدر و منزلت کا اندازہ ہوتا ہے۔ ان کے انتقال پر ان کے دوست راشد اشرف کہتے ہیں 'وہ ہمیشہ اپنی طبیعت میں کبھی بھی چین سے نہ بیٹھ سکے یہی وجہ ہے کہ انھوں نے ایک بہت ہی معروف شعر کہا تھا جس کا مصرعہ تھا': 'زندگی ریت کی دیوار بناتے گزری۔

بی بی سی میں ان کے دور کے ایک ساتھی یاور عباس بتاتے ہیں کہ 'عبید کے دوست بہت کم تھے لیکن جو بھی دوست تھے وہ ان سے ہر حال میں دوستی نبھایا کرتے تھے۔' یاور عباس نے عبید صدیقی کی زندگی کے بارے میں کہا کہ وہ ایک اسکاٹش ادیب رابرٹ لوئیس سٹیونسن کے ناول 'ڈاکٹر جیکل اینڈ ہائیڈ' کے کردار کی مانند تھے جو دوہری شخصیت اور لاابالی پن کی صفات کی وجہ سے کسی بھی وقت کچھ بھی کہہ سکتے تھے۔

رضا علی عابدی نے روزنامہ جنگ (17 جنوری 2020) میں ان کی وفات پر تعزیتی مضمون 'ایک روشن دماغ تھا نہ رہا' کے عنوان سے جو کالم لکھا ہے، اس کا ایک اقتباس ملاحظہ کریں:

''عبید صدیقی نے عجب مزاج پایا تھا۔ اپنی رائے قائم کرتے تھے تو اس رائے پر ڈٹ کر کھڑے ہوتے تھے۔ جو لوگ پسند تھے ان سے بہت قریب تھے لیکن جو لوگ اس سے مختلف ہوتے، ان سے فاصلہ رکھتے اور وہ بھی غضب کا فاصلہ۔ بے حد حساس، بہت زود رنج، نازک مزاج اور شکست تسلیم کرنے سے صاف انکار۔ بی بی سی سے خفا ہوئے تو استعفیٰ دے مارا۔ احباب نے اور گھر والوں نے لاکھ سمجھایا، کسی کی ایک نہ سنی، ساقی فاروقی اور ارشد لطیف سے بہت قریب تھے لیکن اپنی رائے پر ان کو بھی اثر انداز نہیں ہونے دیتے تھے۔ جب نئے نئے لندن آئے تو ارشد لطیف کے ساتھ اپنے لیے مکان تلاش کرنے نکلے۔ انھوں نے مشرقی لندن کے پاکستانی علاقے میں ایک مکان دکھایا جہاں نہاری کی دیگیں کھنک رہی تھیں اور گرم جلیبیاں تلی جا رہی تھیں، سخت برہم ہوئے اور بولے کہ اگر یہیں رہنا تھا تو دلّی میں کیا برے تھے۔''

اس مضمون کی ابتدا میں رضا علی عابدی نے لکھا ہے کہ:

''بی بی سی کی ملازمت کے دوران وہ ترقی کی راہ پر چل نکلے تھے اور انھیں اپنی لیاقت، قابلیت اور تجربے کی بنیاد پر دور تک جانا تھا کہ ایک روز جی میں جانے کیا آئی کہ استعفیٰ دیا اور واپس ہندوستان چلے گئے۔ احباب نے سمجھایا، قرابت داروں نے منایا مگر پسپا ہونا انھیں آتا ہی نہ تھا۔ مجھے یاد ہے، ان کے جانے سے پہلے ان کے احباب نے ایک مشاعرے کا اہتمام کیا جس کی خاص بات یہ تھی کہ مشاعرے میں تنہا عبید پڑھیں گے۔ خدا جانے کیسا سماں بندھا تھا اور لوگوں پر کیا کیفیت طاری تھی، حاضرین نے ان کے ایک ایک مصرعے پر دل کھول کر داد دی اور تعریف و توصیف کا مسلسل اتنا شور ہوتا رہا کہ ایک بار خود عبید نے حیرت کا اظہار کیا۔ یہ شاید ان کے لیے شہر والوں کا الوداعی خراجِ تحسین تھا۔''

لندن میں قیام کے دوران عبید صدیقی نے مغربی معاشرے، تہذیب اور سیاست سے آگاہی حاصل کی۔ اس تجربے نے مغرب کے بارے میں ان کے زاویہ نگاہ کو بدل دیا اور مغربی معاشرے کے بارے میں ان کی بہت سی غلط فہمیوں کا ازالہ کر دیا۔ ان کے ساتھ رضا علی عابدی، اطہر علی، وقار احمد، آصف جیلانی، سارہ نقوی، شاہد ملک، صغریٰ شہاب، شفیع نقی جامعی، عارف وقار، یاور عباس اور راشد اشرف جیسے کئی دوسرے ادیب اور فنکار بھی شامل ہوئے۔ افتخار عارف کی سربراہی میں لندن میں اردو مرکز ادبی سرگرمیوں کا مرکز تھا جہاں روزانہ ادبی محفلیں اور مشاعرے ہوتے تھے۔ ان محفلوں کا حصہ بننے والوں میں ساقی فاروقی، صادقہ شبنم، جتندر بلو، مصطفیٰ علی خان شہاب، محسنہ جیلانی اور ارشد لطیف شامل تھے جنھوں نے لندن کی ادبی زندگی پر انمٹ نقوش چھوڑے۔

2010 میں شعری مجموعے کی اشاعت سے چند روز قبل والدہ کے انتقال نے ان کے دل کو گہرا زخم دیا۔ اس غم میں انھوں نے اپنے دکھ اور درد کو انڈیلتے ہوئے چند خوبصورت غزلیں کہیں جو ہر حساس دل کو جھنجھوڑ کر رکھ دیتی ہیں۔ جب میں نے ان کے اشعار پڑھے تو مجھے یوں لگا جیسے میرا اپنا دل بیٹھا جا رہا ہے۔ ان کے یہ اشعار اپنی مرحومہ والدہ کے لیے ان کی بے نہایت محبت کا ثبوت تھے اور ہماری زندگیوں میں ماں کی اہمیت کی یاد دہانی بھی، چند اشعار ملاحظہ فرمائیں۔

دکھانا تھا یہ دل دکھایا نہیں
کہ تم سو گئے تھے جگایا نہیں
بہت دیر تک سامنے میں رہا
مگر پاس تم نے بلایا نہیں
بہت آج آنکھوں کو دقت ہوئی
کبھی تم نے رونا سکھایا نہیں

عبید صاحب مشاعروں میں شاذ و نادر ہی شریک ہوتے تھے۔ حالانکہ علی گڑھ میں طالب علمی کے زمانے سے وہ شاعری کر رہے تھے، معروف شاعر شہریار کی رہنمائی اور دیگر نامور شعرا جیسے فرحت احساس، آشفتہ چنگیزی اور مہتاب حیدر نقوی ان کے احباب میں تھے۔ ان کے یہ چند اشعار دیکھیں۔

شام ڈھلے آنکھوں میں آنسو لانا مت
میں جلدی لوٹ آؤں گا گھبرانا مت
رم جھم کرتی بادل جیسی آنکھیں یاد آتی ہیں
دیکھو اگر کوئی دامن کھینچے، عزم سفر مت کرنا
اک یاد وہ ہوتی ہے سہانی نہیں ہوتی
اور اس پہ ستم یہ کہ بھلائی نہیں ہوتی

عبید صاحب کی شاعری میں غیر معمولی ندرت دکھائی دیتی ہے۔ ان کے الفاظ بے عیب طریقے سے روزمرہ کی زندگی کے جذبات اور کہانیوں کو سمیٹتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں، جس سے قارئین کو دوسروں کے تجربات سے ہمدردی اور اس سے جڑنے کا موقع ملتا ہے۔ ذرا یہ اشعار دیکھیے۔

کار دنیا کے تقاضوں کو نبھانے میں کٹی
زندگی ریت کی دیوار اٹھانے میں کٹی
عمر رواں کے روز تقاضے نئے نئے
جو کام رہ گیا وہ کبھی ہو نہیں سکا
سنے گا کون اب یہ داستانیں
حقیقت خود حکایت ہو گئی ہے
ان دنوں محکوم کرتے ہیں اسی پر گفتگو
کس لیے پیدا ہوئے تھے اور کیا کرنے لگے

عبید صاحب کی زندگی میں بہت نشیب و فراز تھے۔ ان

کے لچکدار جذبے کے باوجودان کی شاعری اکثر اس درد اور جدوجہد کو ظاہر کرتی ہے جس کا انھوں نے تجربہ کیا۔ انھوں نے مشکلوں کا مقابلہ ہمت کے ساتھ کیا، اپنی پریشانیوں کا اپنے پرامید نقطہ نظر پر سایہ نہ پڑنے دیا۔ انھوں نے اپنے کلام کے ذریعے ہمیں مشکلات کا سامنا کرتے ہوئے ہمت اوراستقامت کا سبق دکھایا۔

عذاب یہ بھی کسی اور پر نہیں آیا
کہ ایک عمر چلے اور گھر نہیں آیا

اپنی پسند کی زندگی گزارنے کی قیمت ہرایک کو چکانی پڑتی ہے، عبید صاحب بھی اس کلیے سے مستثنیٰ نہیں رہے، بلکہ یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ وہ ایک ایسے شخص کی بہترین مثال تھے جس نے سمجھوتہ کرنے سے انکار کر دیا، دنیا چاہے جو سوچے، اس سے انھیں کچھ فرق نہیں پڑتا تھا۔ انھوں نے دوست اور دشمن یکساں بنائے لیکن اپنے منفرد طرز زندگی سے کبھی منحرف نہ ہوئے۔ اگرچہ اس طرز زندگی کو باغیانہ سمجھا جاتا تھا لیکن وہ اپنی شرائط پر زندگی گزارنے پر اٹل تھے اور کبھی کسی کے دباؤ میں نہیں آئے۔ اس کا اثر ان کی شاعری میں بھی تھا، یہ اشعار دیکھیں ؎

میں خواب اپنے سارے نیلام کر رہا ہوں
اور یہ بھی جان لو کہ بے دام کر رہا ہوں
اس سے غرض نہیں ہے بولی لگے گی کیسے
جو کام کرنا ہے بس وہ کام کر رہا ہوں

عبید صدیقی کا شعری مجموعہ 'رنگ ہوا میں پھیل رہا ہے' لفظوں کی تاثیر اور زبان کے حسن کی تلاش ہے۔ خوشی کے روح پرور لمحات سے لے کر مایوسی کی گہرائیوں تک صدیقی زندگی کی باریکیوں کو شاعرانہ کمال کے ساتھ سمیٹتے ہیں۔ ہر نظم اور غزل کے ساتھ، صدیقی ہمیں دریافت، عکاسی اور ربط کے گہرے سفر پر اپنے ساتھ شامل ہونے کی دعوت دیتے ہیں۔ عرض حال کے تحت وہ لکھتے ہیں:

''اپنی شاعری کے بارے میں کسی خوش فہمی (یا غلط فہمی) میں مبتلا نہیں ہوں۔ گذشتہ بارہ تیرہ برس کے دوران بھلے ہی شاعری نہ کی ہو لیکن شاعری، بالخصوص آزادی کے بعد کی جانے والی غزلیہ شاعری کا مطالعہ بدستور جاری رکھا۔ شاعری کا ایک سنجیدہ قاری ہونے کے ناطے یہ بات شدت کے ساتھ محسوس کرتا ہوں کہ ہمارے عہد کے کسی بھی شاعر کے لیے اردو غزل کی تاریخ میں اپنی کوئی مخصوص جگہ بنانا اگر ناممکن نہیں تو حد درجہ دشوار ضرور ہے۔ میں شعر کہتے وقت دو باتوں کا خاص طور پر خیال رکھتا ہوں۔ اول یہ کہ میرا کہا ہوا ہر شعر میرا اپنا ہو اور اس میں میری شخصیت کا عکس نظر آئے، جبکہ دوسری کوشش یہ ہوتی ہے کہ میرے اشعار سنتے یا پڑھتے وقت کسی کو اکتاہٹ اور بیزاری محسوس نہ ہو۔''

(رنگ ہوا میں پھیل رہا ہے، ص 21)

یہ ایک ایسے شاعر کا اعتراف ہے جس نے شہریار، افتخار عارف، ساقی فاروقی، مظہر امام، محمود ہاشمی اور فرحت احساس جیسے شعرا کی ہم راہی میں اپنا شعری سفر طے کیا ہو۔ یہ اس بات کا ثبوت ہے کہ وہ ایک سچے فنکار تھے۔ فرحت احساس نے ان کے مجموعہ کلام 'رنگ ہوا میں پھیل رہا ہے' کے دیباچے میں 'دیکھو پھول کیسا کھلا' کے عنوان سے عبید صدیقی کی شعری کائنات کو روشن کیا ہے۔ وہ ایسے جذبے اور بصیرت کے ساتھ لکھتے ہیں کہ ان کے لفظوں کی خوبصورتی دیکھ کر انسان حیران رہ جاتا ہے۔ وہ کہتے ہیں:

''علی گڑھ کی سنہری 1970 کی دہائی کا آخری باضابطہ مفرور شاعر بھی بالآخر پکڑا گیا اور اس کا سارا مال 'رنگ ہوا میں پھیل رہا ہے' کی صورت میں برآمد کرلیا گیا۔ 1970 کے اوائل میں مسلم یونیورسٹی میں تخلیقیت کا جو حلقہ نور پیدا ہوا تھا، عبید خواب گزینوں اور ماورا نصیبوں کے اس حلقے کے ایک لازمی جز تھے، لیکن کچھ اس طرح کہ ان کی آنکھ باہر کی طرف بھی کھلی رہتی تھی۔ یہی چشم بیروں بیں آگے چل کر ان کا ایک بڑا اثاثہ ثابت ہوئی۔ ایک دریچہ جس نے انھیں خارجی دنیا کی بنتی بگڑتی شکلوں کے درمیان، باطن میں موجود اُن کے اصل عکس کی بنیاد پر ایک نئی ترتیب پیدا کرنے کی راہ دکھائی۔ عبید کے یہاں ان دنوں ایک خاص قسم کی تیزی و تندی اور شعلگی ہوا کرتی تھی جو شاید ان کے خاندانی پس منظر اور ان کے خلقی عناصر کی عطا تھی۔ یہ شعلگی آج بھی برقرار ہے مگر اب آگ میں روشنی کا عنصر زیادہ ہوگیا ہے۔ اس کے ساتھ ہی ایک اور وجودی قدر جو عبید سے خاص ہے، ان کی مفاہمت نا آشنا صداقت مزاجی اور صداقت طلبی ہے جس نے انھیں اس دنیا میں رہتے بستے اور اسے اختیار کرتے ہوئے اس سے دور رہنے اور اس پر حملہ زن ہونے کی طاقت دی ہے۔ لیکن اس سب سے بڑھ کر وہ دریائے افسردگی بھی ان میں سے ہوکر بہتا ہے جو اس پورے حلقے کی جائے پیدائش رہا ہے، دریائے افسردگی جو وجود کے خاکی کناروں کو سیراب کرتا ہے اور انھیں بہا بھی لے جاتا ہے۔''

(رنگ ہوا میں پھیل رہا ہے، ص 213)

عبید صدیقی کا تخلیقی رویہ واقعی فرحت احساس کے بیان میں سمایا ہوا ہے جس سے ان کے جذبات کی شدت کا اندازہ ہوتا ہے۔ عبید صدیقی نے خود لکھا ہے کہ فرحت احساس کو اپنی ادبی اور جذباتی زندگی میں مرکزی حیثیت حاصل ہے۔ اس تعلق کے گہرے معنی کو الفاظ میں بیان کرنا واقعی مشکل ہے ؎

اداسی آج بھی ویسی ہے جیسے پہلے تھی
مکیں بدلتے رہے ہیں مکاں نہیں بدلا
گرمی سی یہ گرمی ہے
مانگ رہے ہیں لوگ پناہ
میں پہلے بے باک ہوا تھا جوش محبت میں
میری طرح پھر اس نے بھی شرمانا چھوڑا تھا
میں بس یہ کہہ رہا ہوں رسم وفا جہاں میں
بالکل نہیں مٹی ہے کمیاب ہوگئی ہے

عبید صاحب کی زندگی میں وصال کی بہاروں کے بعد ہجرتوں کی خزائیں آئیں۔ انھوں نے بدلتے موسموں کو بڑی ہمت اور عزم کے ساتھ قبول کیا ؎

سر شام تاروں کی چھاؤں میں اکثر
بہت یاد آتے ہیں مر جانے والے

کسے پتہ تھا کہ سر شام تاروں کی چھاؤں میں بیٹھ کر دوسروں کا ماتم کرنے والا ہمیشہ کے لیے خود ہی افق پار چلا جائے گا۔

9 جنوری 2021 کی ایک سرد اور دھند میں لپٹی صبح کو انھوں نے دہلی میں آخری سانس لی۔ ان کی عمر 62 برس تھی۔ ان کی تدفین جمعہ 10 جنوری کی صبح 10 بجے جامعہ ملیہ اسلامیہ کے قبرستان میں عمل میں آئی، جہاں انھوں نے اپنی منفرد شوخی اور تیز ذہانت سے طلبہ کو پڑھانے اور متاثر کرنے میں کئی سال گزارے تھے۔ ان کی زندگی مشکلات سے بھری ہوئی تھی اوران کا سفر آخرت بھی مختلف نہیں رہا۔ خدا عبید صاحب کی روح کو ابدی سکون دے۔

■

Mohd Alamullah
Research Scholar,
K R Narayanan Centre for Dalit
& Minority Studies, Jamia Millia Islamia
New Delhi- 110025
Mob.:9911701772

عبید کے یہاں ان دنوں ایک خاص قسم کی تیزی و تندی اور شعلگی ہوا کرتی تھی جو شاید ان کے خاندانی پس منظراور ان کے خلقی عناصر کی عطا تھی۔ یہ شعلگی آج بھی برقرار ہے مگر اب آگ میں روشنی کا عنصر زیادہ ہوگیاہے۔ اس کے ساتھ ہی ایک اور وجودی قدر جو عبید سے خاص ہے، ان کی مفاہمت نا آشنا صداقت مزاجی اور صداقت طلبی ہے جس نے انہیں اس دنیا میں رہتے بستے اور اسے اختیار کرتے ہوئے اس سے دور رہنے اور اس پر حملہ زن ہونے کی طاقت دی ہے۔لیکن اس سب سے بڑھ کروہ دریائے افسردگی بھی ان میں سے ہوکر بہتا ہے جو اس پورے حلقے کی جائے پیدائش رہا ہے، دریائے افسردگی جو وجود کے خاکی کناروں کو سیراب کرتا ہے اور انہیں بہا بھی لے جاتا ہے۔

شموئل احمد کے افسانوں کا موضوعاتی حصار

ریاض توحیدی

شموئل احمد ایک ایسے معروف افسانہ نگار تھے جو فکشن تخلیق کرنے کا ہنر بھی جانتے تھے اور عصری مسائل و موضوعات کو فن کے قالب میں پیش کرنے میں کامیاب بھی ہوتے تھے۔ان کی افسانہ نگاری کی پذیرائی ہر جگہ ہورہی ہے کیونکہ ان کے افسانوں میں تخلیقی رچاؤ، عمدہ کردار نگاری، دلچسپ پلاٹ سازی، موضوع کو برتنے کا تیکھا پن اور اسلوب کی دلکشی مثالی ہوتی تھی۔

شموئل احمد کا فکشن خصوصاً چند افسانے پڑھ کر Anne Frank کا قول یاد آتا ہے:

"I can shake off everything as I write;my sorrows disappear, my courage is reborn."

شموئل احمد کے کئی بیباک افسانے (Bold Short Stories) نملوس کا گناہ، اونٹ، ظہار، لنگی وغیرہ اتنے متنازع فیہ بن گئے اور کئی لوگوں کو ہلا کر رکھ دیا۔ وہ معتوب بھی ہوئے مگر اپنے رویے پر قائم رہے اور ان کا خیال تھا کہ ’’ادیب کا کام ہی یہی ہے کہ وہ سماج کی برائیوں کو اجاگر کرے۔لوگوں کے رویے سے میں مایوس نہیں ہوں بلکہ میری ہمت اور بڑھ جاتی ہے۔‘‘

شموئل احمد خان قلمی نام: شموئل احمد (پیدائش 4 مئی 1945۔وفات 25 دسمبر 2022) بھاگلپور بہار سے تعلق رکھتے تھے۔سول انجینئرنگ کی ڈگری کے بعد حکومت بہار کے شعبہ پبلک ہیلتھ انجینئرنگ سے بطور چیف انجینئر سبکدوش ہوئے۔کئی لوگ اگرچہ تعلیمی سطح پر ادب کی تعلیم وتدریس سے عملی طور پر جڑے ہوئے نہیں ہوتے ہیں تاہم ذہانت و فطانت اور ادبی ذوق و شوق انھیں ادبی خدمات انجام دینے میں کلیدی رول ادا کرتے ہیں۔ شموئل احمد بھی سائنس کے طالب علم رہے تھے اور انجینئرنگ کے پیشے سے وابستہ رہے لیکن اردو فکشن میں اپنا ایک منفرد مقام بنانے میں کامیاب ہوئے۔نویں کلاس میں انھوں نے دو افسانے ’چچا کا تارا‘ اور ’شب برات‘ لکھ کر ادبی میدان میں قدم رکھا تھا۔ اس کے بعد لکھنے کا سلسلہ جاری رہا اور کئی کتابیں سامنے لائیں جن میں چھ افسانوی: مجموعے بگولے (1988)، سنگھاردان (1996)، القمبوس کی گردن (2002)، عنکبوت (2010)، نملوس کا گناہ (2017)، کوچہ قاتل کی طرف (2019)، چار ناول: ندی (1993)، مہاماری (2003)، گرداب (2006)، چمراسر (2019) ناولوں کی کلیات: کلیسا مرے آگے۔ (2022)، ایک خودنوشت ’اے دل آوارہ‘ (2015)، اردو افسانے کی بے وفا عورتیں (مرتب: شموئل احمد / رمانہ تبسم)، اردو کی نفسیاتی کہانیاں (مرتب: 2014)، کیکٹس کے پھول (مضامین: 2018)، کشف الاعداد (علم نجوم) شامل ہیں۔ ’کعبہ مرے پیچھے (افسانوں کی کلیات زیر اشاعت) ان کے ناول ’ندی‘ اور افسانوی مجموعے ’سنگھاردان‘ کا انگریزی ترجمہ ’’River‘‘ اور ’The Dressing Table‘ کے نام سے ہوا ہے اور ان کے اردو افسانوں کا ہندی میں بھی ترجمہ ہوا ہے۔خود بھی ہندی میں لکھتے تھے۔چند افسانوں پر ٹیلی فلمیں/ ڈرامے بھی بن چکے ہیں۔ شموئل صاحب کو کئی اعزازات سے بھی نوازا گیا‘ جن میں 2012 میں مجلس فروغ اردو ادب دوحہ قطر کا عالمی اعزاز بھی شامل ہے۔شموئل احمد کی شخصیت اور ادبی کام پر کئی رسائل نے خصوصی گوشے بھی نکالے ہیں جن میں نیا ورق (ممبئی)، چہار سو (راولپنڈی)، مژگاں (کولکاتا)، ثالث (پٹنہ)، تحریک ادب (وارانسی) اور ’عالمی فلک‘ (جھارکھنڈ) شامل ہیں۔علاوہ ازیں ان کی فکشن نگاری پر تحقیقی نوعیت کا کام بھی ہوا ہے۔

ایک ذہین ادیب کی تحریر یا تخلیق کا موضوعاتی حصار بہت وسیع ہوتا ہے اور ایک باشعور تخلیق کار اپنی تخلیق میں سماج کے مشترک محسوسات (Common Sensibles) کو مخصوص محسوسات (Special Sensibles) میں ڈھال دیتا ہے تاکہ تخلیق کا فنی رچاؤ برقرار رہے نہ کہ صحافتی انداز سے سماجی صورت حال بیان کی جائے‘ یہی ایک کامیاب فکشن کی خوبی ہوتی ہے۔شموئل احمد کی فکشن نگاری کا موضوعاتی دائرہ کافی وسیع ہے اور ان کے ناول یا بیشتر افسانوں میں ایک بات یکساں نظر آتی ہے کہ ان میں سماج کے مشترک محسوسات کو مخصوص محسوسات بنا کر تخلیق کے پیکر میں ڈھالا گیا ہے‘ اس طرح ایک کہانی یا کردار کے توسط سے معاشرے کی مجموعی صورت حال سامنے لانے کی کوشش کی گئی ہے۔

شموئل احمد کا پہلا افسانوی مجموعہ ’بگولے‘ اگرچہ 1988 میں شائع ہوا تھا، تاہم فکشن نگاری میں ان کی پہچان کا باعث افسانہ ’سنگھاردان‘ بنا۔ غالباً یہی وجہ ہے کہ وہ ایک مجموعہ سنگھاردان کے نام سے 1996 میں سامنے لایا۔ افسانہ ’سنگھاردان‘ موضوعاتی پیش کش اور فنی برتاؤ میں ایک مثالی افسانہ ہے۔موضوعاتی سطح پر اس میں ایک تہذیب کا المیہ، بدلتے وقت کا عذاب، نفسیاتی پیچیدگی کو عمدہ فنکاری سے برتا گیا ہے۔ یہ افسانہ اتنا مشہور ہوا ہے کہ کئی زبانوں میں اس کے ترجمے بھی ہو چکے ہیں اور ٹیلی فلمیں اور ڈرامے بھی بنائے گئے ہیں۔ اس افسانے کے موضوعاتی پس منظر سے متعلق خود شموئل احمد اپنی خودنوشت ’اے دل آوارہ‘ میں لکھتے ہیں:

’’کہانی سنگھاردان مجھے راحت کیمپ میں ملی۔ بھاگلپور فساد میں طوائفوں کا بھی راحت کیمپ لگا تھا۔ وہاں ایک طوائف نے رو رو کر مجھے بتایا تھا کہ دنگائی اس کا موروثی سنگھاردان لوٹ کر لے گئے....یہی تو ایک چیز آباواجداد کی نشانی تھی۔‘‘ (رسالہ: ثالث، اپریل تا دسمبر 2018، ص 31)

’سنگھاردان‘ کا مطالعہ کرنے کے بعد دیکھنے کی چیز یہ ہے کہ کہانی کا پس منظر یعنی بھاگلپور فسادات (1989) میں ایک طوائف کا موروثی سنگھاردان کا لٹ جانا، اپنی جگہ....لیکن افسانہ نگار نے مشاہدے کو فن کی بھٹی میں تپا کر اس طرح کندن بنایا ہے کہ تخیل کی سطح پر کہانی فسادات کی روداد کے بجائے ایک ایسے فن پارے کی صورت میں ڈھل گئی ہے کہ افسانے کا ایک نیا نفسیاتی پہلو سامنے آیا ہے اور یہ نفسیاتی پہلو رنڈی کے سنگھاردان کا عکس و معکوس والا نفسیاتی اثر، جو کہ لوٹنے والے کردار برجموہن، اس کی بیوی اور تینوں بیٹیوں کے تغیر شدہ فکر وعمل سے ظاہر کیا گیا ہے۔ایک طرح سے پورا گھر رنڈیوں جیسی

صورت اختیار کر گیا تھا۔ جیسے:

''برجوہن کو نسیم جان کا سنگھار دان ہاتھ لگا تھا۔ سنگھار دان کا فریم ہاتھی دانت جیسا تھا جس میں قد آدم شیشہ جڑا ہوا تھا اور برجوہن کی لڑکیاں باری باری سے شیشے میں اپنا عکس دیکھا کرتی تھیں۔ فریم میں جگہ جگہ تیل، ناخن پالش اور لپ اسٹک کے دھبے تھے جس سے اس کا رنگ مٹ میلا ہو گیا تھا اور برجوہن حیران تھا کہ ان دنوں اس کی بیٹیوں کے لچھن.....''

''اور برجوہن حیران رہ گیا۔ اس کو لگا کہ واقعی نسیم جان شیشے میں بند ہو کر چلی آئی ہے اور ایک دن نکلے گی اور گھر کے چپے چپے میں پھیل جائے گی۔''

اور افسانے کے کلائمکس میں واقعی برجوہن کا شک حقیقت میں بدل گیا کیونکہ اس کی نفسیات پر بھی سنگھار دان اثر انداز ہو چکا تھا:

''برجوہن بستر سے اٹھا۔ سنگھار دان کی دراز سے سرمہ دانی نکالی۔ آنکھوں میں سرمہ لگایا۔ کلائی پر گجرا لپیٹا اور گلے میں لال رومال باندھ کر نیچے اتر گیا اور سیڑھیوں کے قریب دیوار سے لگ کر بیڑی کے لمبے لمبے کش لینے لگا۔''

شموئل احمد کے کئی افسانے احتجاجی نوعیت کے ہیں یعنی ان میں ادبی احتجاج فنی پیکر میں پیش ہوا ہے جس کی ایک عمدہ مثال افسانہ 'مرگھٹ' ہے۔ افسانہ 'مرگھٹ' میں فنی اور موضوعاتی طور پر احتجاجی عناصر واضح نظر آتے ہیں، کیونکہ افسانے میں عصر حاضر کے ایک اہم ایشو کو دو کرداروں کے مکالمے اور کہانی کے منظر نامے میں اس طرح سمویا گیا ہے کہ آج کے ہر حساس انسان کے مشترک محسوسات کو مخصوص محسوسات میں پیش کیا گیا ہے۔ اب اگر بنیادی موضوع کی بات کریں تو افسانے میں اگرچہ علامتی انداز اپنایا گیا ہے تاہم اگر متن کی رد تشکیل کر کے فوکس کریں تو یہ ان دہشت پسند لوگوں کی خوں آشام کہانی کا بیانیہ ہے جو مختلف جگہوں یا ملکوں میں مذہب یا سیاست کے نام پر اپنے ہی لوگوں یا عام معصوم لوگوں کو قتل کرتے جا رہے ہیں' یہ سوچے سمجھے بغیر کہ جس مقصد کے لیے وہ یہ انسانیت سوز کام انجام دے رہے ہیں کیا وہ صحیح ہیں... یا... غلط.....؟

شموئل احمد کے افسانوں کی تخلیقی نثر دلکش ہوتی ہے، جس کی وجہ سے ایک عام سی سماجی کہانی بھی اپنی تخلیقی ساخت برقرار رکھنے میں کامیاب ہو جاتی ہے۔ افسانہ 'لمبالیٹ' کی کہانی کے تخلیقی جملوں پر غور کریں تو عام طور پر افسانوں میں برتے جا رہے سطحی قسم کے جملوں اور تخلیقی جملوں کے مابین واضح فرق نظر آئے گا۔ جیسے:

''فرمان علی بیٹے قربان علی کی پیٹھ پر لمبالیٹ گیا تھا اور بیٹا بھی قریب المرگ باپ کو اینیس (Aeneas) کی طرح پیٹھ پر لادے شہر شہر گھماتا تھا۔ بیٹے کی پیٹھ دکھتی نہیں تھی۔ باپ کی قربت میں اس کے چہرے پر سورج کی روپہلی کرنوں کی تمازت ہوتی اور آنکھیں دوپہر کی طرح روشن... اور بیوی... بیوی کی آنکھوں میں دھواں سا تیرتا۔ وہ بڑبڑاتی۔''

افسانے کا موضوع والدین کی خدمت، لالچ اور مادیت پرستی کے اردگرد گھومتا ہے۔ فرمان علی (والد)، قربان علی (وفادار بیٹا)، مرجان علی (مادیت پرستی کا اسیر خود کو ماڈرن سمجھنے والا) اور عثمان علی (جو باپ کی بیماری کو بھی کیش کرتا رہتا ہے۔) افسانے میں یونانی اساطیر اینیس (Aeneas) کا بھی ذکر آیا ہے جو اپنے بیمار باپ کی خدمت گزاری میں وفادار ہوتا ہے اور ہمیشہ اسے اپنے کندھے پر اٹھاتا رہتا تھا۔ اینیس کا ذکر ہومر کی ایلیڈ میں بھی آیا ہے۔ افسانے کے انجام تک بیٹے قربان علی کی فرمانبرداری مثالی نظر آتی ہے۔

شموئل احمد کے چند افسانے اگرچہ جنسی چٹخارے کی بھی عکاسی کرتے ہیں تاہم ان میں بھی زیادہ تر دوہرے معیار کے لوگوں کے کردار پر ارتکاز نظر آتا ہے۔ باقی افسانے تو سماجی موضوعات کی کہانیاں پیش کر رہے ہیں۔

عصری فکشن منظر نامے میں شموئل احمد کی فکشن نگاری خصوصاً افسانہ نگاری چند متنازعہ پہلوؤں کی وجہ سے بحث وتمحیص کا موجب بنتی آئی ہے۔ جن میں افسانہ 'لنگی' کا نام اختصاص کا حامل ہے۔ اس قسم کے بیشتر افسانوں کا گراف Erotic Fiction کے دائرے میں آتا ہے اور اس میں بھی Psycho sexual کے عناصر کا عمل دخل زیادہ ہوتا ہے۔ مثلاً افسانہ 'لنگی' یا 'حلالہ' میں بھی اگرچہ جنسی عناصر کی آمیزش ہے تاہم ان کا بنیادی مقصد جنسی لذت کی بجائے شہوت پرست افراد کی داخلی کثافت کو نشانہ بنایا گیا ہے۔

افسانہ 'ظہار' کی طرف توجہ دیں تو ظہار ایک مذہبی اصطلاح ہے جس کی تشریح یہاں پر کرنا اس لیے بھی ضروری نہیں ہے کیونکہ افسانے میں وہ خود ہی پیش ہوئی ہے۔ اس کے بعد بنیادی مسئلہ یعنی فقہی مسئلہ 'ظہار' کو موضوع بنا کر کہانی کو مختلف سمتوں میں گھمایا گیا ہے اور اصلی مسئلہ جانے انجانے یا غصے کی حالت میں بیوی کو ماں کا درجہ دینا اور مبرزی شہوت (یہاں پر مبرز کا معنی قاری خود سمجھے گا)... سے شروع ہوتا ہے اور یہیں سے نفسیاتی طور پر میاں بیوی کی نفسیاتی الجھنوں اور تھوڑے وقفے کی علاحدگی کی کہانی شروع ہو جاتی ہے۔ بعد میں کیا ہوتا ہے وہ کہانی سے صاف ظاہر ہے۔

اب افسانے میں بنیادی نکتے یا کہانی کا کنفلیکٹ موڑ کون سا ہے جو کہ افسانے کو قابل بحث بناتا ہے۔ افسانے میں بیوی ایک انسانی وجود کے برعکس بے روح خوبصورت گڑیاں دکھائی گئی ہے۔ جس کی طرف قاری خوبصورت تخلیقی جملوں کو پڑھ کر خود اندازہ لگا سکتا ہے اور پھر شوہر کو بھی آخر پر 'ظہار' کے کفایہ کے بعد عبادت کی ساتگی کی وجہ سے خواہشات سے عاری ایک الگ ہی مخلوق بنا کر دکھایا گیا ہے:

''تف ہے مجھ پر کہ پیشاب دان سے پیشاب دان کا سفر کروں... اس نے وضو کیا اور نماز کے لیے کھڑا ہو گیا۔''

اس طرح سے ظاہر ہو رہا ہے کہ مذہبی احکامات کی انجام دہی کے دوران نفس کی ہر تمنا کو کنٹرول کرنا یا بھلا دینا انسان کو پتھر بنا دیتا ہے... اور وہ صرف باوضو ہو کر ایک عابد یا فرشتہ بن کر رہ جاتا ہے۔ کیونکہ افسانہ بنیادی طور پر مذہبی مسئلے پر ہی لکھا گیا ہے۔ تو ہر باشعور انسان جانتا ہے کہ دین اسلام ایک دین فطرت ہے جو انسان کی فطرت کا خاص خیال رکھتا ہے۔ وہ دین پر چلنے کا طریقہ بھی سکھاتا ہے اور دنیوی زندگی گزارنے کی رہنمائی بھی کرتا ہے۔ اس تناظر میں دیکھیں تو افسانے کا بنیادی مسئلہ یعنی عبادات کے زیر اثر نفسیاتی پیچیدگی یا نفسیاتی خواہشات کو دبا کر رکھنا کس قسم کے منطقی جواز کی عکاسی کرتا ہے کہ اس کو پڑھنے کے بعد ظہار، مولوی کے فتوے یا مذہبی احکامات کی پیروی کو موضوع بحث بنایا جائے۔ میں سمجھتا ہوں کہ افسانہ کوئی سماجی یا مذہبی بحث چھیڑنے میں ناکام ہے۔ اس میں صرف جمالیاتی حظ کی خفیف سی کیفیت اور ایک ایسے مسئلے کو پیش کیا گیا ہے جس کا کوئی دینی' علمی' سماجی اور منطقی جواز ہی نہیں نکلتا ہے۔ اگر کوئی خود ہی مذہبی تعلیم پر چل کر اپنے نفس پر ظلم کرے تو اس میں مذہب کا کیا قصور ہے؟

بہر حال شموئل احمد ایک ایسے معروف افسانہ نگار تھے جو فکشن تخلیق کرنے کا ہنر بھی جانتے تھے اور عصری مسائل و موضوعات کو فن کے قالب میں پیش کرنے میں کامیاب بھی ہوتے تھے۔ ان کی افسانہ نگاری کی پذیرائی ہر جگہ ہو رہی ہے کیونکہ ان کے افسانوں میں تخلیقی رچاؤ، عمدہ کردار نگاری، دلچسپ پلاٹ سازی، موضوع کو برتنے کا تیکھا پن اور اسلوب کی دلکشی مثالی ہوتی تھی۔

■

Dr. Reyaz Ahmad Bhat
Wadipora Handwara
Kashmir - 193221 (J&K)
Cell.:9906834877

عبدالحی

ایک نڈر افسانہ نگار شموئل احمد

کہانی شروع ہوتی ہے 7 ستمبر 2012 سے جب شموئل احمد صاحب سے میری پہلی دفعہ گفتگو ہوئی تھی۔ میں نے انھیں سلام کیا لیکن کئی دنوں تک انتظار کے باوجود میرے سلام کا جواب نہیں آیا۔ پھر 15 مارچ 2013 کو انھیں فیس بک پر آن لائن دیکھ کر سلام کیا تو ان کا جواب آیا۔ میں نے ان سے درخواست کی کہ آپ کا انٹرویو لینا ہے اردو دنیا کے لیے، بتائیں آپ کا قیام کہاں ہے، انھوں نے کہا کہ فی الحال پونے میں ہوں۔ میں نے فوراً کہا کہ وہاں رفیق جعفر صاحب ہیں انھیں کہہ رہا ہوں وہ جاکر آپ کا انٹرویو لے لیں گے۔ وہ بولے کہ ٹھیک ہے۔ میں نے رفیق جعفر کو کہہ دیا اور وہ شموئل احمد سے ملنے پہنچ گئے اور پھر ایک شاندار انٹرویو لیا اور اردو فکشن اور اردو ادب کے ہم عصر منظرنامے پر شموئل صاحب کے تاثرات اور خیالات سے اردو والوں کو آگاہی ہوئی۔ ان دنوں وہ پونے اور پٹنہ آتے جاتے رہتے تھے کیوں کہ پٹنہ میں کسی ٹیلی فلم میں بھی کام کر رہے تھے اور اس کی شوٹنگ کے سلسلے میں پٹنہ جانا رہتا تھا۔ کچھ دنوں بعد بہت خوشی خوشی مجھے فون کیا اور کہنے لگے کہ پٹنہ دوردرشن نے ایک ٹیلی فلم مرگ ترشنا بنائی ہے جس کی کہانی اسکرین پلے اور مکالمے میں نے لکھے ہیں۔ وہ مکمل ہوگئی ہے۔ ان کا انٹرویو جب چھپ کر آیا تو اردو دنیا کی کاپی دیکھ کر بہت خوش ہوئے اور مجھے شکریہ کہنے کے لیے بھی فون کیا جس پر میں نے جواب دیا کہ یہ آپ کا رسالہ ہے اور اس کے صفحات پر آپ جیسے عظیم فکشن نگار کے انٹرویو سے اس کے معیار اور وقار میں اضافہ ہوا ہے۔ 2013 میں ہی میں فکر و تحقیق کا نیا افسانہ نمبر ترتیب دے رہا تھا تو اس خصوصی نمبر کے لیے جب ان سے ایک طویل مضمون کی درخواست کے ساتھ ہی یہ بھی گزارش کہ سرکاری رسالہ ہے تو اس کی پالیسی کو نظر میں رکھتے ہوئے ہی مضمون لکھیں گے۔ اس تخمینم اور یادگار نمبر کے لیے انھوں نے اردو افسانے کی بے وفا عورتیں کے عنوان سے ایک قیمتی مضمون عنایت کیا جس کی بڑی پذیرائی ہوئی۔ اس دوران ان کے تقریباً ایک درجن تنقیدی مضامین ہوگئے تھے، انھوں نے ایک دن مجھ سے کہا کہ خان صاحب میں اپنے تنقیدی مضامین کا مجموعہ شائع کرنا چاہتا ہوں۔ میرے دس بے حد اہم مضامین ہیں، کیا ان کے لیے قومی اردو کونسل سے تعاون مل سکتا ہے۔ میں نے اس سلسلے میں ان کی مناسب رہنمائی کردی اور بتا دیا کہ آپ مالی تعاون کے لیے یا پھر کتاب کی اشاعت کے بعد تھوک خریداری کے لیے درخواست دے سکتے ہیں۔ ایک دن کہنے لگے کہ میں علم نجوم پر ایک مہان گرنتھ کی رچنا کرنا چاہتا ہوں کشف الاعداد جو 2000 صفحات پر مبنی ہوگی۔ اس پروجیکٹ کو اگر قومی اردو کونسل تعاون دے دے تو بہت بڑا کام ہوجائے گا جس پر میں نے کہا کہ کونسل کو اس پر ضرور غور کرنا چاہیے اور میں خود اس سلسلے میں ڈائرکٹر صاحب سے بات کروں گا۔ پھر کئی دنوں تک ان سے گفتگو نہیں ہوئی۔ اچانک جنوری 2014 کی 14 تاریخ کو ان کا پیغام آیا کہ خان صاحب آج کل آپ گھاس نہیں ڈالتے ہیں مجھے۔ جس پر میں نے جواب دیا کہ آپ کے سامنے میں طفل مکتب ہوں اور دعائیں اور نیک خواہشات مجھے آپ سے چاہئیں۔ بھلا میری کیا بساط جو آپ کو نظرانداز کروں جس پر وہ کہنے لگے کہ ارے مذاق کر رہا تھا یار۔ چہار سو کا شموئل احمد نمبر آیا تو مجھے کہا کہ اگر ممکن ہو تو تبصرہ کردیں۔ ان دنوں وہ اپنا سوانحی ناول اے دل آوارہ بھی مکمل کرچکے تھے اور اس کی اشاعت کے سلسلے میں پریشان تھے۔ قومی اردو کونسل نے اس کے لیے مالی تعاون کو منظوری دی اور پھر یہ ناول منظر پر آیا۔ جب میں منع کردیتا تو کہیں اور بھیج دیتے۔ اردو کی چند نفسیاتی کہانیاں نامی مضمون بھی بھیجا جو اردو دنیا میں شائع ہوا۔ جب بھی مجھ سے بات کرتے تو کہتے خان صاحب یا ہیلو خان۔ میں نے بھی ان کے انداز میں انھیں بڑے خان کہنا شروع کردیا۔ جب بھی وہ ہیلو خان کہتے میں انھیں جواب دیتا کہ یس بڑے خان صاحب۔ شموئل احمد کی نہ صرف اردو ادب پر بلکہ عالمی ادب پر بھی گہری نظر تھی۔ 100 عالمی افسانے بھی انھوں نے ترتیب دیے تھے۔ یہ 100 Great stories of the world کا اردو ترجمہ تھا۔ انھوں نے یہ بھی اطلاع دی کہ اس پروجیکٹ پر دس لاکھ کا خرچ آئے گا۔ کیا کونسل اتنا دے سکے گی۔ ان دنوں شموئل صاحب مجھ سے کچھ زیادہ ہی قریب تھے، جو بھی لکھتے اس کے بارے میں بتاتے اور کئی دفعہ اپنے ذاتی معاملات بھی بتاتے۔ اپنے نواسے کے لیے ایک رشتہ تلاش کر رہے تھے تو مجھ سے کہا کہ خان فیملی میں ایک رشتہ بتاؤ لیکن لڑکی ورکنگ ہونی چاہیے لڑکا دہلی میں انجینئر ہے۔ پاکستان ادب کے آئینے میں جب لکھی تو اس کی ایک کاپی خاص طور سے مجھے بھیجی اور تیسرے چوتھے دن ان کا فون آگیا کہ کیسی لگی کتاب۔ میں نے ویسے ہی گول مول جواب دیا کہ بے حد محنت سے لکھی ہے اور اچھی کتاب ہے تو اس پر بہت سخت لہجے میں کہنے لگے کہ آپ نے بھی وہی بات کردی۔ صاف کہہ دیتے کہ ابھی پڑھی نہیں ہے۔ میں خاموش ہوگیا کہ اسی میں بھلائی تھی۔ پڑھنے کے بعد میں نے انھیں اپنی رائے سے آگاہ کیا تو خوش ہوئے اور بولے کہ اب لگا کہ کتاب پڑھی ہے آپ نے۔ بہار کے ایک افسانہ نگار اور ادبی صحافی کے حوالے سے ایک دن کہنے لگے کہ ایسے لوگوں کو چھیڑنے میں مزہ آتا ہے۔ وہ افسانہ نگار بلبلا اٹھا ہے اور مجھے بلاک بھی کردیا ہے۔ افسانہ فورم ان دنوں بہت مقبول تھا اور اس میں ایک بحث چھڑ گئی تھی جس میں کئی افسانہ نگار اور ناقدین شامل تھے۔ آخرکار اس فورم کو بند کردینا پڑا۔ شموئل صاحب کا افسانہ فورم میں اہم رول تھا۔

شموئل احمد ایک سچے فنکار تھے۔ انھیں بات سے بات پیدا کرنا یا باتوں میں مزاح پیدا کرنا خوب آتا تھا۔ وہ بہت بڑے افسانہ نگار تھے لیکن ان میں کچھ عادتیں حرکتیں ایسی بچوں والی دیکھیں جو عمر کے اس مقام پر شاید ہی کوئی کرتا ہو۔ بچپن میں جس طرح بھڑ کے چھتے میں بچے پتھر مار کر دور ہٹ جاتے ہیں اور دور سے بیٹھ کر اس راستے سے گزرنے والوں کی اچھل کود کو انجوائے کرتے ہیں۔ یہی حال شموئل احمد کا تھا۔ ایک شگوفہ چھوڑ دیا اور پھر تماشہ دیکھ رہے ہیں اور سب سے الگ الگ رائے لے رہے اور اپنی رائے دے رہے۔ جب اے دل آوارہ مجھے بھیجی تو میں نے انھیں اپنی رائے دی کہ آپ کے بے باک لہجے اور خوبصورت و منفرد اسلوب نے اس سوانحی ناول کو ایک الگ حسن دیا ہے۔ فاطمہ بوا کا جن، شرابی روزے دار کی داستان، جیوتشی کا انداز بیان، رانچی کی کہانی.....ان

دنوں روزے چل رہے تھے۔ جب اے دل آوارہ کے حوالے سے یہ سب بتایا تو کہنے لگے کہ رمضان میں شیطان بند رہتا ہے اور آپ رانچی گھوم رہے ہیں۔ان کا ناول اے دل آوارہ اپنی طرز کا منفرد سوانحی ناول ہے۔ یوں تو یہ ان کی داستان حیات ہے لیکن اس میں خوب خوب چٹخارے دیے گئے ہیں۔ایک دن کہنے لگے کہ آپ کا چیلا (جب کہ وہ ریٹائرڈ ادیب ہیں جن کا شموئل احمد صاحب کی کتاب پر تبصرہ چھپ چکا تھا) مجھ سے اے دل آوارہ مانگ رہا پڑھنے کو۔ میں نے کہا کہ بھیج دیں تو بولے کہ جلدی ہی بھیجوں گا۔اے دل آوارہ جب پاکستان سے شائع ہوئی تو اس کی اطلاع مجھے دی، وہ وہاں اس کی اشاعت سے بہت خوش تھے۔ اپنی تصنیف کشف الاعداد سے برج حمل پر لکھا گیا اپنا مضمون مجھے بھیجا اور اسے شائع کرنے کی درخواست کی لیکن جب تک میں اسے چھاپنے کو فائنل کرتا تب تک وہ زبان وادب میں شائع ہوگیا۔ اس دوران ان کا افسانوی سفر بھی جاری تھا اور گھر واپسی جب لکھا تو مجھے خاص طور سے پڑھنے کو کہا اور بولے بڑی دھانسو کہانی ہے ضرور پڑھیں۔ 2016 میں ان کا ناول گرداب جب چھپا تو اس کی دو کاپیاں مجھے بھیجیں اور یہ کہتے ہوئے پڑھنے کی تاکید کی کہ ضرور پڑھیے گا گرداب سے باہر نکلنا مشکل ہوگا۔ جب میں نے پڑھنا شروع کیا اور شروع کے پچیس صفحات پڑھ لیے تو ان سے پوچھا کہ کیا ہندو اساطیر اور علم نجوم کو شامل کرنا ضروری تھا؟ کیوں کہ ناول پڑھتے ہوئے قاری بھٹک جاتا ہے، تسلسل ٹوٹ جاتا ہے اور آپ کرداروں کی زندگی دکھاتے ہوئے ستاروں کی باتیں کرنے لگتے ہیں جس پر وہ ہنستے ہوئے کہنے لگے کہ تسلسل نہیں ٹوٹتا بلکہ مزے میں خلل پڑ جاتا ہے۔ان کے ناول کے مطالعے کے دوران بھی ان سے گفتگو ہوتی رہی تھی اور ناول پر بہت ساری باتیں ہوئیں۔ جب میں نے گرداب پورا پڑھ لیا تو انھیں اپنی رائے غیر جانب داری سے بھیج دی جو کچھ یوں تھی۔ ''جناب! گرداب پورا پڑھ لیا ہے۔ پڑھ کر ایک عجیب سی اذیت اور کرب میں گرفتار ہوں۔ آپ نے ناول کا اتنا دردناک انجام کیوں دیا، کوئی اور رخ بھی تو دے سکتے تھے، حد ہے جناب..... کہیں ایسے بھی کسی عورت کو مارا جاتا ہے۔ بھلے ہی وہ عورت آپ پر قبضہ کرنے لگی تھی حاوی ہورہی تھی ، کوئی دوسرا انجام دے دیتے، میری ناقص سمجھ میں تو یہی آرہا کہ بہت بے چارگی اور کرب اور تکلیف میں اس نے اپنی زندگی کو الوداع کہا اور ہاں ایک بات یہ بھی کھٹک رہی کہ کمار کے بارے میں اس کی بیٹیوں نے کبھی کوئی اعتراض کیوں نہیں کیا؟ آخر یہ کیسے ممکن ہے۔ کسی کو قتل کردینا محض ایک ٹیروٹ کارڈ پر منحصر کرتا ہے۔ درجات کو سمجھ میں آتا ہے، منصوبہ اور شبنم بڑی ہیں تو انھیں کیسے پتہ نہیں چلا۔ کرداروں کے نام بھی آپ نے عجیب وغریب رکھے ہیں..... خیر ان باتوں کے پیچھے آپ کا اپنا جواز ہوگا۔ میرے اس تبصرے پر انھوں نے صفائی دی کہ میں خود اس کی موت سے غمگین ہوں، کمار کی بیٹیاں چھوٹی عمر کی ہیں اور اس نے اپنی بیٹیوں کو خود آزادی دے رکھی ہے۔ اس کے بعد پھر اس ناول پر انھوں نے مزید گفتگو نہیں کی۔ ایک دن کہنے لگے کہ گرداب پر پروفیسر قنبر علی خاں کا تبصرہ آپ کو بھیجا جائے گا۔ شاید منفی ہو لیکن مجھے اعتراض نہیں ہے کیوں کہ ضروری نہیں کہ ہر آدمی تعریف ہی کرے، گرداب کو سمجھنے کے لیے پیار، نفرت کی نفسیات کو سمجھنا ہوگا اور Fetish کی نفسیات جاننی ہوگی جس سے اردو دنیا ناواقف ہے۔ کچھ دنوں بعد بتایا کہ ڈاکٹر فیاض احمد وجیہہ نے میرے ناول پر شاندار تبصرہ کیا ہے اور حقیقی معنوں میں میرے ناول کو انھوں نے ہی سمجھا ہے۔

فکر وتحقیق کے ناول نمبر کے لیے ان کے اپنے تجربات پر مبنی ایک دو صفحے کا مضمون میں نے مانگا تو فوراً بھیج دیا۔ 14 اکتوبر 2016 کو جب میں نے انھیں 12.30 بجے آن لائن دیکھا تو میسج کیا کہ جمعے کا دن ہے سر، کئی لوگ وضو کرنے کے بعد بھی فیس بک پر جھانک لیتے ہیں۔ اس پر انھوں نے لکھا۔ تیرا دل تو ہے صنم آشنا تجھے کیا ملے گا نماز میں.....

جب دوحہ قطر عالمی ایوارڈ کا اعلان ہوا اور وہ قطر جانے والے تھے تو مجھ سے بولے ایک خطرناک مضمون لکھا ہے وہ جلدی ہی بھیجوں گا، ناول نگاری کا فن، ساتھ ہی ایک انٹرویو کا ذکر کیا کہ بہت Controversial ہے اسے اپنے رسالے میں چھاپ دیں، جس پر میں نے انھیں انکار کردیا کہ آپ کا انٹرویو پہلے ہی چھپ چکا ہے اور اوپر سے انٹرویو کی جو خوبی آپ نے بتائی ہے تو اس کا یہاں شائع ہونا مشکل ہے۔ کچھ دنوں بعد ان کا فون آیا کہ میں ناول نگاری کے فن پر ایک مضمون لکھ رہا تھا جو مکمل ہوگیا ہے لیکن میرا یہ مضمون کچھ ناول نگاروں کو برا لگے گا۔ مضمون پڑھنے کی ان کی تاکید پر میں نے مطالعے کے بعد اپنی رائے دی۔ جب میں نے یہ مضمون چھاپنے سے انکار کیا تو کہنے لگے کہ نہیں شائع کرنے کی وجہ بتائیں؟ کیا وہاں بھی کسی گروپ کی لابنگ چلتی ہے۔ جس پر میں نے صاف طور پر کہا کہ یہاں کسی کی لابی نہیں ہے، سرکاری رسالہ ہے اس لیے کوشش ہوتی ہے کہ کسی کی بھی دل شکنی نہ ہو۔ لیکن میری اپنی رائے ہے کہ یہ مضمون یہاں نہیں چھپنا چاہیے، جس پر ان کے جواب نے ان کی عظمت میرے دل میں مزید بڑھادی۔ انھوں نے کہا کہ آپ کی رائے اچھی لگی ، اسے کہیں اور بھیج دوں گا۔ بعد میں اس مضمون کے زبان وادب میں شائع ہونے کی اطلاع دی۔ 28 مئی 2017 کو انھوں نے اطلاع دی کہ بہت جلد آپ میری دھماکہ خیز کہانی پڑھیں گے لنگی۔ 8 جون 2017 کو جب یہ قصہ منظر عام پر آیا تو میں نے انھیں لکھا کہ تو یہی تھا آپ کا دھماکہ، دھماکہ تو آپ نے واقعی کردیا، بس ذرا چوک ہوگئی، نام، کردار بدل دیتے، کہانی کو اور بڑھاتے، کچھ کمی رہ گئی، موضوع تو صحیح ہے، کالج اور یونیورسٹیوں میں ایسے واقعات ہورہے ہیں لیکن آپ نے تھوڑی جلد بازی کردی، کہانی کو مزید بہتر بنایا جاسکتا تھا اور کہانی کو کہانی رہنے دیتے یوں گندہ نہ کرتے۔ میری رائے پر انھوں نے ایک لفظ لکھا، ''گریٹ''

شموئل احمد اردو فکشن کے لجنڈ ہیں، انھوں نے اپنے افسانوں اور ناولوں سے اردو ادب کے دامن میں بیش بہا اضافہ کیا ہے۔ وہ ساری زندگی اپنی شرطوں پر جیے کبھی کسی سے نہیں ڈرے، جو لکھنا چاہا، جس پر لکھنا چاہا بلا خوف لکھا، ان کے آخری دنوں میں لکھے گئے لنگی اور پروفیسر کا حرم جیسے افسانوں سے شدید اختلاف کے باوجود اس سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ شموئل احمد اردو فکشن کا درخشاں ستارہ تھے جس کے غروب ہونے سے اردو افسانے کا میدان سونا سونا ہوگیا ہے۔ شموئل احمد کو دنیا جہان کے علوم سے واقفیت تھی اور انھوں نے اپنے افسانوں، ناولوں میں بھی اسے برتا ہے۔ علم نجوم پر تو خاصی دسترس رکھتے تھے۔ خواتین سے متعلق موضوعات پر لکھنے اور گفتگو کرنے میں انھیں مہارت حاصل تھی۔ انسانی نفسیات اور اس کی پیچیدگیوں کو افسانوں میں بہت کامیابی سے پیش کیا ہے۔ جنس اور رومان بھی ان کا پسندیدہ موضوع رہا ہے۔ سنگھاردان، القموس کی گردن، آنگن کا پیڑ، چھگمانس، عنکبوت، گھر واپسی، اونٹ، مصری کی ڈلی، بگولے جیسے افسانوں کی بدولت وہ ہمیشہ یاد رکھے جائیں گے۔ ان کے ناول ندی، گرداب، مہاماری، اے دل آوارہ اور چمراسر وغیرہ نے انھیں بطور ناول نگار ایک مستحکم شناخت عطا کی۔ پاکستانی ادب اور ہندی ادب پر بھی گہری نظر تھی۔ بہار کے منظرنامے پر دیکھیں تو ادھر دو برسوں میں اردو فکشن کے کئی لعل و گہر ہم سے بچھڑ گئے۔ شوکت حیات، شفیع جاوید، مشرف عالم ذوقی، تبسم فاطمہ، مناظر عاشق ہرگانوی، حسین الحق اور اب شموئل احمد کا جانا بہت افسوسناک ہے۔ بہت نڈر افسانہ نگار تھے۔ اللہ ان کی مغفرت فرمائے۔ آمین!

■

Abdul Hai
CM College,Darbhanga-846004 (Bihar)
Mob.:9899572095

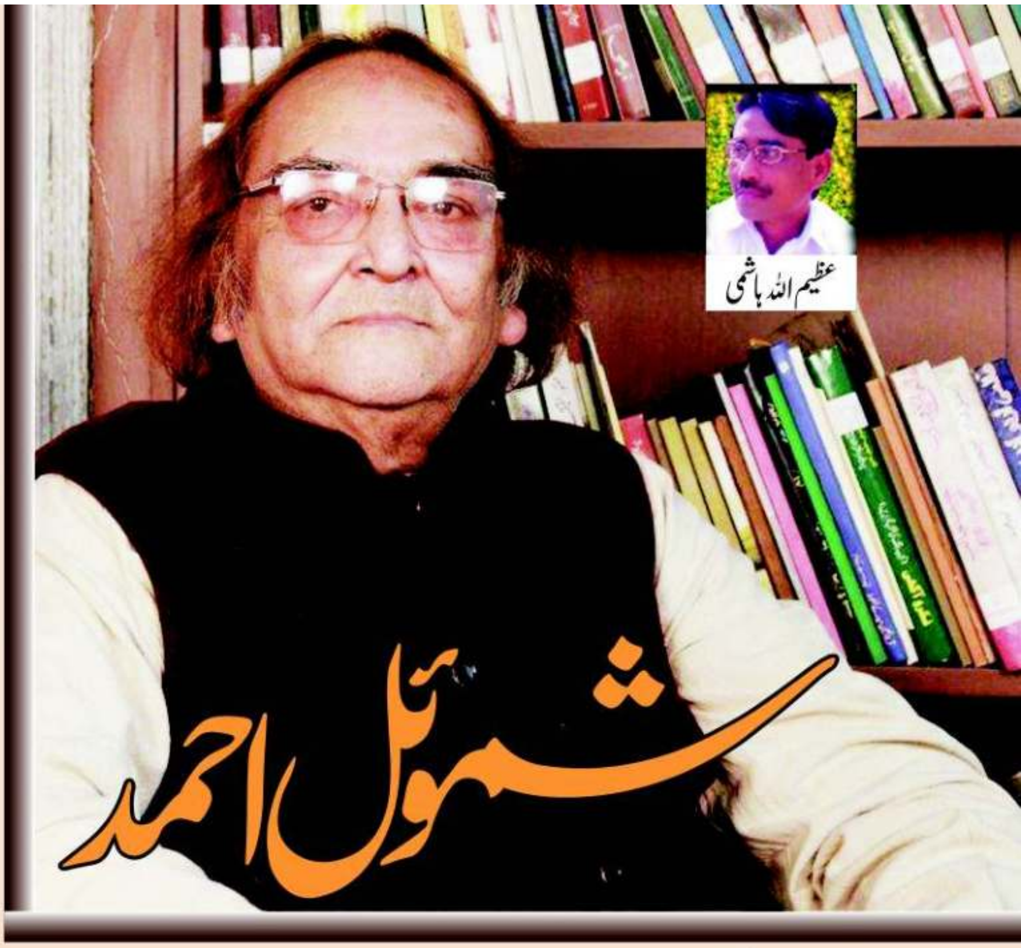

شموئل احمد

عظیم اللہ ہاشمی

معروف فکشن نگار شموئل احمد کی پیدائش 4 مئی 1945 کو بھاگلپور بہار میں ہوئی۔ موصوف نے سیول انجینئرنگ میں گریجویشن کی ڈگری لی اور حکومت بہار کے ماتحت پبلک ہیلتھ انجینئرنگ سے بحیثیت چیف انجینئر ریٹائرڈ ہوئے۔ سنگھاردان، عنکبوت، بگولے، القموس کی گردن، نملوس کا گناہ ان کے افسانوی مجموعے اور ندی، مہاماری، گرداب، اے دل آوارہ ناول ہیں۔ انھوں نے اپنے ناولوں میں انحطاط پذیر زندگی کا نقشہ خوب کھینچا ہے جس میں اقدار کا المیہ اور اس کے بد اثرات نیز ذہنی اقدار کی پستی کا دھند چھائی رہتی ہے۔ اس کے علاوہ متعدد مضامین اور تراجم کی کتابیں بھی منظر عام پر آئیں۔ انگریزی کے علاوہ ہندوستان کی دوسری زبانوں میں بھی ان کے افسانوں کا ترجمہ ہوا۔ موصوف کو فکشن نگاری کے لیے عالمی فروغ اردو ادب دوحہ قطر 2023 کے ایوارڈ سے بھی سرفراز کیا گیا۔ شموئل احمد نے بنیادی طور پر سائنس کے طالب علم ہوتے ہوئے ادب سے دلچسپی بحال رکھی اور ان کو شہرت بھی اسی میدان سے زیادہ ملی۔ اس دوران صحافتی زندگی سے بھی ان کا واسطہ رہا۔ اردو کے علاوہ موصوف ہندی زبان میں بھی لکھا کرتے تھے۔ اپنی تخلیقات میں انھوں نے سماجی، سیاسی اور عصری مسائل کو بڑی ہنر مندی سے فن پارے میں منتقل کیا لیکن جنس کی نفسیات پر ان کی نظر گہری تھی۔ چونکہ جنس انسانی زندگی کا جزو لاینفک ہے اس لیے انھوں نے اس کا مطالعہ کچھ زیادہ کیا اور اس کے نفسیاتی پہلو کو کرداروں کی مدد سے افسانے اور ناول کے کینوس پر ابھارا۔ شموئل احمد کو علم نجوم سے بھی دلچسپی تھی، اس لیے ان کے افسانے اور ناولوں میں اس کی اصطلاحات دیکھنے کو ملتی ہیں جو تھوڑی دیر کے لیے قاری کو غیر مانوس لگتی ہیں۔ عوامی اور نجی زندگی میں جن محرکات سے متاثر ہوئے، ان کو کمال مشاقی سے فن پارے کے قالب میں ڈھال کر قاری کے سامنے پیش کیا۔

متن قرأت کا محتاج ہے۔ اگر اس میں قوت نہیں تو اسے معتبر نقاد بھی بڑا نہیں بنا سکتے ہیں جبکہ دم دار متن کو ناقد چھوٹا کرنے سے قاصر ہے۔ شموئل احمد کے متون کا شمار ذکر ثانی قبیلے میں ہوتا ہے جس کو چاہ کر بھی چھوٹا نہیں کیا جا سکتا ہے۔ شموئل احمد کو رسول حمزہ توف کے اس خیال سے پورا پورا اتفاق ہے کہ:

''ادیب کو اس بھیڑیے کی طرح ہونا چاہیے جس نے خرگوش کو ہڑپ لیا ہے یا پھر اس خرگوش کی طرح جو بھیڑیے کے پنجے سے بچ نکلا ہو۔'' (بگولے، ص5)

موصوف نے اپنے افسانوں کے کینوس پر ٹوپی سے شتر مرغ نکالنے کی کوشش نہیں کی بلکہ ان ہی کھٹی میٹھی حقیقت اور کڑوی حقیقت کو صفحۂ قرطاس پر ابھارا جن سے ان کی روزانہ کی زندگی نبرد آزما ہے۔ تخلیقی عمل کو قدرتی اور وجدانی تصور کرنے والے شموئل احمد شعور اور لاشعور دونوں کے قائل ہیں لیکن کسی ادبی مکتب فکر کی ذہنی غلامی کے انکاری ہیں۔ ان کے تراشیدہ کرداروں کی تحلیل نفسی سے ان کی شخصیت کا عکس ابھرتا ہے اور موضوع سے منسلک ان کا نقطۂ نظر قاری کے سامنے آتا ہے۔ اسلوب کی سطح پر وہ اس پر ایمان رکھتے ہیں کہ موضوع کے اعتبار سے کہانی اپنے اسلوب کا انتخاب خود کرتی ہے۔ ان کی فکر اس کی پابند ہے کہ معنیاتی تہہ داری کہانی کا حسن ہو سکتی ہے لیکن یہ ضروری وصف نہیں ہے۔ بقول صغیر افراہیم:

''آٹھویں دہائی اردو فکشن کے لیے فال نیک ثابت ہوئی۔ اس دہائی میں حقیقت نگاری کو پھر سے اعتبار ملا اور افسانے میں کہانی پن کی واپسی ہوئی۔ 1975 کے آس پاس منظر عام پر آنے والے افسانہ نویسوں اور ناول نگاروں نے اپنے عہد کے فنی اور فکری مسائل پر توجہ دی اور کسی دباؤ میں آ کر یا کسی مصلحت کے پیش نظر فن پارے تخلیق نہیں کیے بلکہ رائج رویوں سے کسب فیض کرتے ہوئے ایک ایسی تخلیقی کائنات آباد کی جس سے اردو فکشن کے وقار کو اور بھی اعتبار حاصل ہوا۔ یہی وجہ ہے کہ اس نئی نسل کے یہاں حقیقت نگاری ہے، تمثیل ہے، بیانیہ ہے، منظری اسلوب ہے، فینٹیسی ہے اور سب سے بڑھ کر اس کے یہاں ایک آزاد تخلیقی فضا کا احساس ہوتا ہے۔''

(اردو فکشن: تنقید اور تجزیہ: ڈاکٹر صغیر افراہیم، ص15)

ان کے بعض افسانوں میں جن واقعیات کا ذکر آیا ہے وہ ایمرجنسی سے قبل یا پھر اسی دورانیے کے ہیں جب کہ 'دوسرے قصبہ' میں ایک نامور سربراہ کے قتل کے بعد تبدیل ہوتے سیاسی منظر نامے کا نقشہ علامتی جملوں میں قلم بند ہوا ہے جو زیادہ غیر شفاف نہیں ہے۔ سیاسی انحطاط پزیر اس عصر میں مذہب اور سیاست میں ہونے والی تبدیلیاں، قدروں کا زوال، رشتوں کا بکھراؤ، ذات کی شناخت کا مسئلہ، سیاست کے بدلتے ہوئے رجحانات اردو فکشن کے سرمایے رہے ہیں۔ مجموعہ 'بگولے' 1988 میں منظر عام پر آیا لیکن اس میں وہ افسانے شامل ہیں جن کا زمانہ 70 اور 73 کے درمیان ہے۔ 'قصبہ کا المیہ' اور 'قصبہ کی دوسری کہانی' میں مادر وطن ہندوستان کو موضوع بنایا گیا ہے جس کو فرنگیوں سے آزاد کرانے کے بعد اس کے اندر کے مسائل کو پیش کرتے ہوئے یہ اشارہ دینے کی کوشش ہوئی ہے کہ جنگ آزادی کے بعد ملک کے سیاسی نگہبانوں کے پیٹ بڑے ہوتے رہے اور قصبہ واسیوں کے پیٹ اندر دھنستے گئے۔ ان افسانوں کے متون میں سیاسی ریشہ دوانیوں، لوٹ کھسوٹ کو نفیس پیرائے میں بیان کیا گیا ہے۔ 70 سے 77 تک ملک کے جمہوری نظام کا عبوری

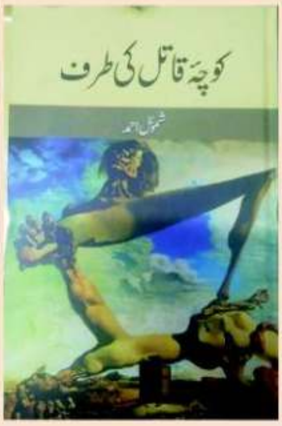

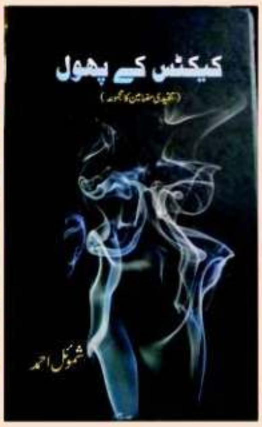

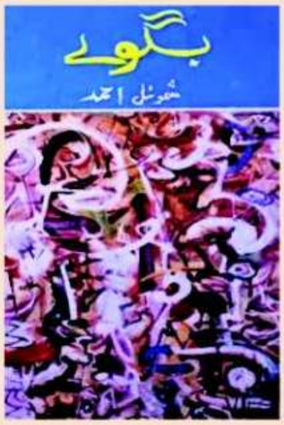

دور تھا اس کی منظر کشی بھی ہوئی ہے جو برہنہ نگاری سے دامن کش ہوتے ہوئے ہو بہو اس عصر کی تصویر کشی ہے:

''اکثر ایسا ہوا کہ ہمارے اطراف میں ندیاں مسلسل بارشوں میں زور سے ہنس پڑی تھیں اور قصبہ واسی رو پڑے تھے۔ ہنستی ہوئی ندیاں ہماری جھونپڑیاں ہمارے مویشی بہالے گئی تھیں تب اہل بینار فضا میں پرواز کرتے ہوئے ہماری ڈوبتی کشتیوں کا منظر دیکھتے اور پھر بینار سے اناج کی تقسیم کا اعلان ہوتا۔ اہل بینار مٹھی بھر اناج قصبہ میں چھینٹ دیتے اور بوریاں گھر لے جاتے۔''

(قصبہ کا المیہ، ص 13)

مہنگائی، بے روزگاری اور غریبی کی لمبی ہوتی لکیریں اور سیاسی استحصال ملک کو کھوکھلے کر رہے تھے ایسے میں ایک پرعزم شخصیت کا سامنے آنا اور صفائی ضروری ہے کی آواز بلند کرنا ملک کے عوام اور ان کے مستقبل سے ہمدردی کے مترادف ہے کیونکہ یہ عوام کو ان کی آنکھوں کو صرف خواب سونپنے کا قائل نہیں ہے لیکن اختتام پر اس کی انگلیوں میں بھی ناخن نکل آئے۔ سیاسی تکڑم بازی، مکر وفریب، چور بازاری، رشوت خوری اور ریاکاری کی بڑھتی جڑوں کی نشاندہی بھی ان افسانوں کا خاصہ ہیں۔ جس سے معاصر سنگینیاں قاری کی آنکھوں کی اسکرین پر رقص کرنے لگتی ہیں۔ اس عصر کے چند مسائل میں سے ایک مسئلہ دہشت گردی ہے جس سے عوامی زندگی اجیرن بن گئی ہے۔ اس لیے لوگ ایسا محسوس کرنے لگے ہیں کہ ہواؤں میں سانپ اڑتے رہیں گے، فضا میں بارود کی بو رچی رہے گی، رتھ بکتر بند گاڑیوں میں گھومتے رہیں گے، لوگ خوف سے کانپتے رہیں گے۔ ان کی باری کبھی بھی آسکتی ہے کیونکہ یہ مرگھٹ ہے:

''یکا یک ایک دھماکہ ہوا اور ایک گولی سنسناتی ہوئی میرے کان کے قریب سے گزر گئی۔ میں اچھل کر دور ہٹ گیا۔ پھر دوسرا دھماکہ ہوا اور اونٹ کے گھٹنے کی شکل کا وہ آدمی... لاش اٹھالی گئی تھی... وہاں پر گرا ہوا خون دھوپ کی مری ہوئی روشنی میں کہیں کہیں جم کر تازہ کلیجی کی مانند چمک رہا تھا... بھیڑ چھٹنے لگی تھی... دکانوں کے شٹر گرنے لگے تھے...'' (افسانہ: مرگھٹ)

انٹرنیٹ اور سائبر کے زمانے میں نئی نسل جس جال میں پھنستی جارہی ہے اس کی روداد افسانہ 'عنکبوت' میں ہے۔ افسانے کو پڑھ کر ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے یہ منٹو کے افسانوں کی ترقی یافتہ شکل ہے۔ معاصر زندگی میں انٹر نیٹ ایسا تار عنکبوت بن گیا ہے۔ جس میں نئی نسل مثل مکھی الجھ گئی ہے جہاں اس کی اخلاقی موت کے سوا کچھ بھی نہیں ہے۔ افسانے کے کرداروں میں جنسی نفسیات کا مطالعہ گہرا ہے۔ مذہب اور سیاست میں ہونے والی تبدیلیوں کا عکس افسانہ 'جھگمانس' میں ہے۔ جس میں سماجک نیائے کا نعرہ بیک وارڈ اور فارورڈ کے مہرے کا سیاسی بساط پر گہری چال کا ذکر ہے۔ افسانے میں جیوتش ودیا کا سہارا لیا گیا ہے۔ اس میں وہ الفاظ استعمال ہوئے ہیں جو علم نجوم میں استعمال ہوتے ہیں۔ ہندی کے الفاظ بھی خوب خوب استعمال ہوئے ہیں۔ افسانہ 'ظہار' میں شرعی مسائل کو موضوع بنایا گیا ہے۔ دور جاہلیت میں کچھ روایتیں ایسی رائج تھیں جس سے عوامی زندگی بزن تھی، اس کو اس میں فوکس کیا گیا ہے۔ اس افسانے میں بھی جنس کی نفسیات ہے۔ افسانے میں کچھ غیر مانوس الفاظ کا استعمال ہوا ہے جیسے۔ ظہار، متبنی، چر بیانے، السائی، ممتع وغیرہ۔ ایسے الفاظ سے قاری کو کوفت ہوتی ہے۔ اس افسانے میں جہاں کردار ابھرتے ہیں وہیں منظر نگاری بھی خوب ہوئی ہے۔ افسانے میں شوہر کی جانب سے قلب ماہیت ہے جس کو احساس ہے کہ وہ جبلت کے پنجوں میں گرفتار ہے۔ اس لیے وہ قوم لوط کی طرح غارت ہونے کی خواہش کا اظہار کرتا ہے۔ نفسیاتی جبلت کا شکار انسان اختتام پر تقوی کا پابند ہوجاتا ہے۔ پرہیزگاری کا لبادہ زیب تن کرلیتا ہے اور پاکیزہ زندگی جینے کی راہ پر چلنے کے لیے وضو کرکے جانماز پر کھڑا ہوجاتا ہے۔ افسانہ خوف خدا کا استعارہ ہے جو انسان کے اندر سرایت کر جائے تو اس کے تمام گناہ دھل جاتے ہیں۔ افسانے میں عورتوں کی حمایت میں آوازیں بلند ہوئی ہے:

''کیا قصور نجمہ کا...؟ قصور ہے میرا اور سزا اس معصوم کو...؟ کیا ہوتا قاضی صاحب اگر نجمہ کہے کہ میرا شوہر میرے باپ جیسا ہے؟ پھر کون حرام ہوتا...؟ نجمہ یا شوہر...؟ پھر بھی آپ مرد کو بری کرتے ہیں... اور نجمہ کو دو دڑے لگانے کا حکم صادر کرتے... اس کے جی میں آیا زور سے چلائے... یا اللہ کیا مذہب ایک جبر ہے...؟ تیرے نظام میں سارے فتوے عورتوں کے ہی خلاف یوں ہوتے ہیں؟ نجمہ حرام کیوں۔؟ حرام تو مجھے ہونا چاہیے۔''

(افسانہ: ظہار)

افسانہ 'سراب' کالونی میں رہنے والوں کے مسائل کو پیش کرتا ہے جہاں محلے کے لوگوں کے درمیان کی قربت مفقود ہے۔ دوسرے کے دکھ سکھ میں ساتھ دینے کا جذبہ کم ہے۔ یہاں کی زندگی مہاجر جیسی ہوتی ہے۔ معاشرے میں پھیلی ذات برادری کی بو اس افسانے میں ہے۔ شموئل احمد کے افسانوں میں اپنے ماحول کے واقعات اور سانحات کی ماجرا سازی ان کے افسانوں کی جان ہے، جہاں کردار نگاری کا طلسم اپنے شباب پر ہے۔ ہر کردار رخصت ہوتے ہوتے قاری کی نبض پر انگلی رکھ جاتا ہے۔ شوکت حیات کے مقابلے ان کے یہاں شفاف حقیقت نگاری کا عنصر زیادہ ہے۔ شوکت حیات کے افسانوں میں پرندے عصر کے زندہ جاوید کردار کے طور پر سامنے آتے ہیں جبکہ شموئل احمد نے بطور کردار پرندوں کے استعمال سے گریز کیا ہے۔ شوکت حیات اور شموئل احمد دونوں کے یہاں اپنا بیانیہ ہے جس میں ترسیل کے مسائل کم ہیں۔ دونوں کے افسانوں کے مکالمے حیاتی اور جذباتی تاثر کو ابھارنے میں معاون ہیں۔ فرق یہ ہے کہ شموئل احمد کے یہاں جنس مرغوب ہے جبکہ شوکت حیات کے یہاں سیاست اور فرقہ واریت۔!

افسوس شموئل احمد جیسا افسانہ نگار 25 دسمبر 2022 کو 77 سال کی عمر میں لیور کینسر جیسے موذی مرض کا شکار ہوکر نوئیڈا میں اس جہاں فانی کو الوداع کہا اور یہیں سپرد خاک ہوئے۔ آسماں تیری لحد پر شبنم فشانی کرے۔!

■

Azeemullah Hashmi
H. No.: 1/A, B L. No: 23, Kela Bagan
Jagatdal, North 24
Parganas - 743125 (WB)

تبصرہ و تعارف

تبصرہ نگاری ادبی تنقید ہی کی ایک شکل ہے جس میں کتاب کے مواد، اسلوب اور معیار کا تجزیہ کیا جاتا ہے۔ کتاب کے مالہ وماعلیہ اور دیگر جزئیات کے حوالے سے قارئین کو بہت قیمتی معلومات عطا کی جاتی ہیں۔ اردو میں تبصرہ نگاری کی ایک مضبوط اور مستحکم روایت رہی ہے، خاص طور پر قدیم مجلّات نے مطبوعات جدیدہ کے تعارف کا جو سلسلہ قائم کیا تھا وہ بہت ہی مفید تھا۔ تبصرہ بہت ذمے داری کا کام ہے اس لیے مبصرین کو چاہیے کہ وہ کتابوں کے انتخاب میں بھی اپنے اعلیٰ ذوق کا ثبوت دیں اور تبصرہ کرتے وقت غیر ضروری تمہید، افراط وتفریط، بے معنی تحسین اور بے جا تنقید سے گریز کرکے کتاب کے اہم اور افادی نکات کی نشاندہی کریں۔ اردو کے علاوہ انگریزی، ہندی یا دیگر زبانوں میں اردو زبان وادب سے متعلق جو کتابیں شائع ہوتی ہیں ان پر بھی آپ تبصرے بھیجیں تو بہتر ہوگا۔

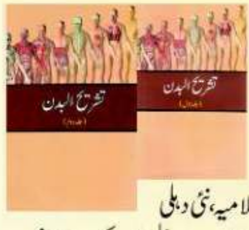

تشریح البدن (دو جلد)

صفحات : 889 (دونوں جلد)

قیمت : 415 (مکمل سیٹ)، سنہ اشاعت: 2022

ناشر : قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان

مبصر : عبدالرحمٰن شافی، ریسرچ اسکالر، جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی

'تشریح البدن' جیسا کہ کتاب کے نام ہی سے ظاہر ہے یہ علم طب کی وہ شاخ ہے جس میں انسانی جسم کو بنانے والے اعضا کی ساخت (Structure)، وضع (Position) اور مجاورت (Relation) سے بحث کی جاتی ہے۔ یہ کتاب دو ضخیم جلدوں پر مشتمل ہے۔ جلد اول میں 419 صفحات ہیں، جس کو چار ابواب میں تقسیم کیا گیا ہے۔ پہلے باب میں تشریح عمومی (Genral Anatomy) سر سے پاؤں تک کا ذکر بالتفصیل کیا گیا ہے۔ جس میں اعضا کی ساخت، ان کو جوڑنے والے حصے، حرکات کی ترتیب اور ان کے طبی ناموں کا ذکر تصویری شکل میں دکھا کر سمجھایا گیا ہے۔ باب دوم جس کا عنوان ابتدائی علم النسل ہے۔ جس میں انسان میں موجود خلیوں اور انسانی ساخت سے بحث کی گئی ہے۔ باب سوم میں تشریح ارتقائی/علم الجنین جنینی زندگی میں کیا کیا تغیرات واقع ہوتے ہیں اور ان کا نشو ونما کس طرح ہوتا ہے۔ اس سلسلے میں برسوں سے تحقیق جاری ہے اور ہر زمانے میں مختلف نظریات رکھنے والے محققین نے الگ الگ نظریات پیش کیے ہیں اور جنینی زندگی کی تبدیلیاں، اعضا کے اندر تغیرات، نشو ونما اور ان کے افعال پر اس باب میں روشنی ڈالی گئی ہے۔ باب چہارم، جس میں طرف اعلی (Upper limb) کے متعلق سمجھایا گیا ہے۔ طرف اعلی اور طرف اسفل وہ ہوتا ہے جو انسان کے روزمرہ کے مختلف افعال جیسے کھانے، پینے، چلنے، وزن اٹھانے جیسے افعال انجام دینے والے حصوں کے حوالے سے بیان کیا جاتا ہے اس کو تصویری شکل میں سمجھایا گیا ہے۔

اسی طرح دوسری جلد کو تین ابواب میں تقسیم کیا گیا ہے۔ جس کی تفصیل کچھ اس طور پر ہے کہ پہلا باب جس میں 'راس وعنق یعنی سر اور گردن'' کے حوالے سے باریکیاں بتائی گئی ہیں۔ جس کو اجمالی طور پر اس طرح سمجھا جاسکتا ہے کہ:

راس وعنق یہ دو حصوں پر مشتمل ہوتا ہے۔ ان کے مشمولات/اعضا ایک دوسرے سے مسلسل ہوتے ہیں جو آسانی سے علیحدہ نہیں کیے جاسکتے ہیں۔ راس کے اندر 'چہرہ' بھی شامل ہے۔ دوسرا باب دماغ ونخاع مطلب اس کا یہ ہے کہ کتاب کا یہ حصہ نظام اعصاب سے متعلق ہے جو کہ انسانی جسم کا سب سے حساس وپیچیدہ نظام ہوتا ہے۔ جس چاہے خارجی ہو یا باطنی یہ فوراً اثر قبول کر لیتا ہے۔ اسی لیے جسم کے اس حصے کو بہترین منتظم بھی کہتے ہیں۔

اور تیسرے باب میں صدر سے متعلق تفصیلات دیکھنے کو ملتی ہیں۔ صدر جسم کے اس حصے کو کہتے ہیں جو گردن اور بطن کے درمیان واقع ہوتا ہے۔ اس کے اندر نظام تنفس اور نظام دوران خون کے اہم اعضا کے علاوہ دوسرے اہم حصے بھی شامل ہوتے ہیں۔ مزید تفصیل کے لیے آپ کو مذکورہ کتاب کی طرف رجوع کرنا ہوگا۔ اب تک میڈیکل کی تعلیم کا میڈیم انگریزی زبان رہا ہے اور ملک یا بیرون ملک میں جہاں بھی دیکھا جاتا ہے تو علم طب کے حصول کے لیے یہی زبان مستعمل ہے۔ پہلے یہ صرف ایک خیالی بات تھی لیکن اب یہ حقیقت ہے کہ ہم میڈیکل کی تعلیم زبانِ اردو میں بھی حاصل کر سکتے ہیں۔ اگر چہ اردو میں اس کی ایک کامیاب کوشش دارالترجمہ عثمانیہ میں پہلے بھی کی جا چکی ہے، مگر جیسے جیسے وقت گزرا گردشِ ایام نے اسے ماضی کا حصہ بنا دیا اور اب وہ تمام کاوشیں ایک مخصوص ادارے تک ہی محدود ہوکر رہ گئی ہیں۔ نئی نسل اور بالخصوص وہ طلبہ جن کا میڈیم اردو رہا ہو یا جن کا بیک گراؤنڈ مدرسہ بورڈ سے ہے اور وہ اس میدان میں آگے بڑھنے کے خواہاں ہوں تو یہ کتاب ان کے لیے مددگار ثابت ہوگی۔ جس کامیابی اور خوش اسلوبی سے قومی کونسل نے کتاب کو تیار کیا ہے وہ لائق تحسین ہے۔

تحقیق و تنقید

رشحات قلم

مصنف: وسیم حیدر ہاشمی

صفحات: 400، قیمت: 200 روپے، سنہ اشاعت: 2022

مطبع: مرکزی پبلی کیشنز، نئی دہلی

مبصر: محمد حفظ الرحمٰن ندوی

C-145/1، گراؤنڈ فلور، طیب لین، شاہین باغ، نئی دہلی

وسیم حیدر ہاشمی کا نام اردو ادب میں اب غیر معروف نہیں رہا۔ ان کے ادبی سفر کا آغاز 1993 میں 'جھینی جھینی بینی چدریا' کے اردو ترجمے سے ہوا جو ہندی سے اردو میں ایک اعلی ترجمے کی حیثیت رکھتا ہے۔

وسیم حیدر ہاشمی تخلیق و تصنیف کی دنیا میں، جہاں ایک ہنرمند افسانہ نگار، کامیاب مترجم اور معتبر شاعر کے طور پر متعارف ہوئے ہیں، وہیں ایک سنجیدہ ناقد اور ماہر مضمون نگار کی حیثیت سے بھی انھوں نے اپنی شناخت قائم کی ہے۔

زیرِ تبصرہ کتاب 'رشحات قلم' ہاشمی صاحب کے 15 مضامین اور مقالات کا ایک بہترین مجموعہ ہے۔ اس مجموعے کے تمام مقالات و مضامین معلوماتی نہج کے ہیں۔

ہاشمی صاحب نے متذکرہ کتاب کے پہلے مقالے کا عنوان 'بنارس ہندو یونیورسٹی کے اولین صدر شعبہ عربی و فارسی: فائز بنارسی' ہے، جس میں انھوں نے استاذ الشعرا فائز بنارسی کے کلام کے تعلق سے بحث کی ہے اور ان کی شاعری کا مختصر و جامع جائزہ پیش کیا ہے۔

اس کتاب کا دوسرا مقالہ بعنوان 'شیخ علی حزیں کا فاطمان (بنارس کی تاریخی میراث)' ہے۔ اس تحقیقی مقالے کو انھوں نے تقریباً ایک درجن کتب کے حوالہ جات سے پر مغز و مدلل بنایا ہے، جس سے ان کی جانفشانی کا پتہ بھی چلتا ہے۔ اس مقالے میں ہاشمی صاحب نے حزیں کی ولادت، ان کے اساتذہ، ایران کے اس دور کے بدتر حالات، حزیں کے ایران سے ہندوستان تک کے سفر اور پریشانیوں کا ذکر ایک عمدہ افسانہ نگار کی طرز پر اس طرح پیش کیا ہے کہ قاری اس کے پورے مطالعے سے قبل کتاب نہیں رکھنا چاہے گا۔ ہاشمی صاحب نے اپنے اس مقالے میں یکے بعد دیگرے، شیخ علی حزیں سے متعلق جتنے بھی تاریخی بیانات پیش کیے ہیں ان میں شروع سے اخیر تک ایک ربط قائم رہتا ہے۔ ایران کے علاوہ حزیں کے ہندوستان پہنچنے کے بعد، دہلی، پٹنہ اور بنارس کا ذکر بھی تمام تاریخی شواہد کے ساتھ محکم طریقے سے کیا ہے۔

'سید اعجاز حسین ضامن کے رثائی کلام کی جمالیت' بھی اس کتاب کا ایک منفرد مضمون ہے۔ راقم السطور کا خیال ہے کہ ضامن صاحب کے متعلق ہاشمی صاحب کا یہ مضمون غالباً اب تک کا واحد اور نہایت پرلطف مضمون ہے۔ اس مضمون میں مصنف نے ضامن کے ایک مرثیے میں تغزل اور جمالیات کی نہایت عمدہ عکاسی بڑے جاذب طریقے سے پیش کی ہے جو لائق مطالعہ ہے۔

'نذیر بنارسی کی دل خوشکن کاشی' اس کتاب کا چوتھا مقالہ ہے، جس کو ہاشمی صاحب نے نذیر کے ہی مندرجہ ذیل اشعار سے شروع کیا ہے۔

میں بنارس کا نواسی، کاشی نگری کا فقیر
ہند کا شاعر ہوں، شیو کی راجدھانی کا سفیر
لے کے اپنی گود میں، گنگا نے پالا ہے مجھے
نام ہے میرا نذیر اور میری نگری بے نظیر

ہاشمی صاحب نے ان کی شاعری کا ذکر کرتے ہوئے اپنی پیش کردہ مثالوں سے بخوبی ثابت کر دیا ہے کہ نذیر صاحب کا کلام ان کی خاص زبان کی وجہ سے زیادہ پسند کیا گیا ہے۔ جب بھی نذیر بنارسی کا ذکر آتا ہے تو ہر ادیب ان کی غزلوں، نظموں اور قطعات، گو کہ صرف شاعری کا ذکر کرتا ہے لیکن وسیم حیدر ہاشمی نے ان کی شاعری کے ذکر کے ساتھ نذیر صاحب کی نثر کے بڑے حصے کا بھی ذکر کیا ہے جو راقم کے خیال سے نذیر صاحب کے تعلق سے ایک عمدہ اور حیرت انگیز اضافہ ہے۔

اس کتاب کے دو مقالات 'تحفۃ الاحباب بنارس از منشی بشیشر پرساد وار' (انیسویں صدی کے بنارس کا چشم دید حال بیان کرتا ایک مہتم بالشان نسخہ) اور دوسرا 'کاشی استت از لالہ متن لعل آفرین' (انیسویں صدی کی ایک مہتم بالشان فارسی مثنوی) ہے۔ 'تحفۃ الاحباب بنارس' اس نسخے کی کیفیت بیان کرتے ہوئے ہاشمی صاحب لکھتے ہیں کہ کتاب کے حاشیے پر تقریباً چودہ سو فارسی اشعار پر مشتمل مثنوی 'کاشی استت' چھپی ہوئی ہے۔ یعنی یہ دونوں گوہر نایاب ایک ہی صدف میں مقید ہیں۔ منشی بشیشر پرساد وار کی کتاب، جو درمیانی چوکھٹے میں چھپی ہے۔ اس میں انھوں نے 1860 کے بنارس کی عکاسی مقفیٰ و مسجع اردو نثر میں کی ہے۔ اس کتاب میں وار نے 1860 کی دہائی کے بنارس کا حال توجہ اور دلچسپی کے ساتھ بتدریج بیان کیا ہے۔ مثنوی 'کاشی استت' سے متعلق ہاشمی صاحب کا عمیق مقالہ اپنے آپ میں بہت اہمیت کا حامل ہے۔ اسی مقالے میں ہاشمی صاحب نے لالہ متن لعل آفرین کا مختصر تعارف کرانے کے بعد 'کاشی استت' کے متعلق لکھتے ہیں کہ اس کتاب کا ہر شعر اپنی جگہ اس لیے اعلی مقام رکھتا ہے کہ اس کے اشعار میں بنارس کی بہترین تصویر کشی کی گئی۔ ہاشمی صاحب کے مطابق یہ مثنوی تقریباً 1400 فارسی اشعار پر مشتمل ہے۔ اس کی زبان نہایت آسان اور رواں ہے۔

اپنے ایک پر مغز مقالے 'اقبال سہیل کی قصیدہ نگاری کے چند محاسن' میں اقبال سہیل کی مہتم بالشان قصیدہ نگاری اور دیگر صلاحیتوں پر عالمانہ بحث کی ہے۔ اسی طرح ہاشمی صاحب نے اپنے ایک تجزیاتی مضمون 'نجیب محفوظ کا مختصر افسانہ' کوچۂ بدنام کی مسجد' کا تجزیہ بھی اچھے طریقے سے پیش کیا ہے۔

زیر تبصرہ کتاب میں دو مضامین ایسے ہیں جو زمانے کی بھیڑ میں کھوئے ہوئے دو شاعروں سرسوتی سرن کیف اور اصغر مہدی کے ادبی کارنامے سپرد قلم کیے گئے ہیں۔ آغا حشر کاشمیری پر بھی وسیم حیدر ہاشمی نے ایک اچھا مضمون قلم بند کیا ہے۔ آغا حشر کے مختصر اور جامع مطالعے کے لیے بلا شبہ وسیم حیدر صاحب کے اس مضمون سے استفادہ کیا جا سکتا ہے، جو آغا حشر کو جاننے کے لیے کسی حد تک معاون ہے۔

'رشحات قلم' کا ایک مضمون 'عشرت کرتپوری کی صبح بنارس' کے عنوان سے بھی ہے۔ ہاشمی صاحب کا یہ مضمون اس کتاب کا غالباً سب سے طویل مضمون ہے، جس میں عشرت کرتپوری کا ضمنی تعارف پیش کرنے کے بعد ہاشمی صاب نے اس کتاب میں شامل متعدد شعرا کے کلام کا جائزہ بھی پیش کیا ہے۔

اپنے ایک مضمون بعنوان 'مرزا غالب کا مہتم بالشان بنارس (مثنوی چراغ دیر کی روشنی میں)' میں مصنف نے غالب کے ضمنی تعارف کے بعد ان کی 'چراغ دیر' پر روشنی ڈالتے ہوئے ان کے سفر کلکتہ کی وجہ بھی بیان کی ہے۔ اس کتاب کے اخیر میں مصنف نے مجتبیٰ حسین اور ان کے کلام کا مختصر تعارف پیش کیا ہے۔ اس کتاب کی خوبیوں کے پیش نظر امید ہے کہ ادبی حلقوں میں اس کتاب کو مقبولیت حاصل ہوگی۔

مکاتیب

خیر اندیش (خطوط کا مجموعہ) ایک جائزہ

مصنف: پروفیسر غیاث الدین
صفحات: 407، قیمت: 500 روپے، سنہ اشاعت: 2022
ناشر: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی
مبصر: ڈاکٹر نازنین سلطانہ آصف احمد، اسسٹنٹ پروفیسر،
شعبہ اردو، چشتیہ کالج آف آرٹس، سائنس اینڈ کامرس خلدآباد

'خیر اندیش' پروفیسر محمد غیاث الدین کے خطوط کا مجموعہ ہے۔ جو انھیں مختلف اوقات میں دوستوں اور اردو ادب کی اہم شخصیتوں نے لکھا تھا۔ ان خطوط کو خود پروفیسر محمد غیاث الدین نے ترتیب و تدوین کیا ہے۔ 'خیر اندیش' محمد غیاث الدین کی پانچویں کتاب ہے جو انھوں نے مرتب کی ہے۔ اس کتاب میں انھوں نے ان خطوط کو جمع کیا ہے جو انھیں مختلف اوقات میں مختلف علمی و ادبی شخصیتوں نے لکھے تھے۔ ان میں چند خطوط انگریزی زبان میں موجود ہیں چند خطوط ایسے بھی ہیں جو علمی و ادبی حوالے سے بڑی اہمیت کے حامل ہیں۔ ان خطوط کو پڑھ کر ہمیں اس دور کے حالات و واقعات کا بھی اندازہ ہوتا ہے۔ چند خطوط ایسے ہیں جو تحقیق کے لیے مشعل راہ ثابت ہو سکتے ہیں۔ ویسے تو اس کتاب کو مرتب کرنے کے تعلق سے خود مصنف نے ایک جگہ تحریر کیا ہے کہ:

''مجھے یقین ہے کہ یہ کتاب دیر سویر اگر ان احباب اور بزرگوں تک پہنچتی ہے تو اس کا مطالعہ کر کے وہ چند لمحوں کے لیے ضرور مسکرائیں گے، خوش ہوں گے اور مجھے بھی یاد کریں گے۔ اور ایک کتاب کی کامیابی یہ بھی ہے کہ اسے پڑھنے کے بعد کوئی خوش ہو جائے، یادوں میں کھو جائے، اس کے دل کی کلی کھل جائے اور واقعی اس کے لبوں پر مسکراہٹ نمودار ہو جائے۔ مجھے یقین ہے ایسا ضرور ہوگا۔'' (ص 21)

اس اقتباس سے تو ظاہر ہوتا ہے کہ مصنف نے ان خطوط کو اس لیے مرتب کیا ہے کہ ان کے دوست احباب اور جن حضرات نے بھی انھیں یہ خطوط لکھے تھے وہ ان کو پڑھ کر اپنی پرانی یادوں میں کھو جائیں۔ ان کے لبوں پر مسکراہٹ نمودار ہو۔ یہ تمام اپنے احساسات و جذبات دیکھ کر شادمانی حاصل کریں۔ لیکن جب ہم ان خطوط کا بغور مطالعہ کرتے ہیں تو ان خطوط میں جذبات و احساسات کے علاوہ ہمیں اس وقت کے حالات، معاشرت اور زندگی جینے کا انداز نظر آتا ہے۔ یہ خطوط جو محمد غیاث الدین کو لکھے گئے ہیں وہ 1977 تا 2014 کے عرصے میں لکھے گئے ہیں۔ تقریباً چالیس سال کے عرصے میں جو ہمارے معاشرے میں تبدیلیاں رونما ہوئیں ہیں اس کا احساس ہمیں ان خطوط کو پڑھ کر ہوتا ہے۔

'خیر اندیش' کے خطوط سے ہم ریسرچ اسکالر کے ساتھ دوران تحقیق آنے والی مشکلات اور پرشانیوں کو دیکھ سکتے ہیں۔ اس خطوط کے مجموعے میں اردو ادب کی اہم اور مشہور شخصیتوں کے خطوط بھی شامل ہیں جو محمد غیاث الدین نے اپنے تحقیق کے مقصد سے لکھے تھے۔ جن میں اہم نام حیات اللہ انصاری، پروفیسر بیگ احساس، رجسٹرار مگدھ یونیورسٹی، ڈائرکٹر، پنجابی یونیورسٹی، پٹیالہ، خورشید عالم،، اوپندر ناتھ اشک، جوگندر پال، امرت رائے وغیرہ ہیں۔ یہ خطوط بھلے ہی کسی مقصد کے تحت لکھے گئے ہوں یا جواباً محمد غیاث الدین کو آئے ہوں، لیکن ان خطوط میں ہمیں اس دور کے معاشی، سیاسی، سماجی مسائل کا بھی احساس ہوتا ہے۔

'خیر اندیش' کی ترتیب کی بات کی جائے تو محمد غیاث الدین نے بڑی محنت لگن سے اس کو ترتیب دیا ہے جس کا اعتراف انھوں نے اپنے مقدمے میں کیا۔ اس کتاب میں کل خطوط کی تعداد 264 ہے جسے مصنف نے سینٹرل یونیورسٹی آف کشمیر کے نام سے انتساب کیا ہے۔

'یادیں' انسان کو اپنے ماضی سے جوڑے رکھتی ہیں۔ یہ یادیں ہی تو ہے جو انسان کو کبھی ہنساتی ہیں تو کبھی رلاتی ہیں تو کبھی سوچنے پر مجبور کرتی ہیں۔ یہ یادیں ہی تو ہیں جن کی وجہ سے انسان اپنے ماضی کو یاد کر کے کبھی کبھی ہنستا ہے تو کبھی روتا، کبھی افسوس کرتا ہے تو کبھی مسرت محسوس کرتا ہے۔ یہ اور بھی زیادہ تازہ ہو جاتی جب پروفیسر غیاث الدین کے خطوط کا مجموعہ 'خیر اندیش' کا مطالعہ کیا جائے۔ یہ ایک ایسی کتاب ہے جس کی وجہ سے قاری اپنے گزرے ہوئے کل کو آج سے اور آج کو آنے والے کل سے جوڑ سکتا ہے اور یہ محسوس کر سکتا ہے کہ سچ میں انسان کیا ہے؟ انسان کیا تھا؟ اور انسان کیا ہو سکتا ہے؟

پروفیسر غیاث الدین میرے بھی استاد محترم ہیں اور میں بھی ان کی اتنی ہی عزت کرتی ہوں جتنی کہ ہر طالب علم کو اپنے استاد کی کرنی چاہیے۔ استاد محترم کی کتاب پر کچھ تحریر کرنا میری خوش قسمتی ہے مجھے یہ موقع میسر ہوا۔ بہر حال کتاب 'خیر اندیش' کے لیے پروفیسر غیاث الدین یقیناً مبارکباد کے حقدار ہے۔ اس کتاب کی اہمیت اس لیے بھی بڑھ جاتی ہے کہ یہ کتاب آنے والے ریسرچ اسکالر اور اردو ادب کے چاہنے والوں کے لیے مشل راہ ثابت ہوگی۔ پروفیسر محمد غیاث الدین نے یہ کتاب ترتیب دے کر آنے والے ریسرچ اسکالر کے لیے ایک بہترین اور قیمتی تحفہ پیش کیا ہے۔

ترتیب

ملکہ نسیم کی شعری کائنات

مرتبہ: پروفیسر شاہینہ تبسم
صفحات: 304، قیمت: 450، اشاعت: 2022
ناشر: ڈاکٹر سعید عالم
مبصر: پروفیسر خالد اشرف 4414/7، دریا گنج، نئی دہلی 2

اردو غزل کا سفر آج تین سو برس سے زیادہ عرصے کا ہو چکا ہے۔ ابتدا کے سو سال تو اردو غزل فارسی مضامین کے تراجم کے سہارے قائم رہی یا مقامی ہندی موسموں، تیوہاروں اور پھلوں پھولوں کو اپنے اندر سمیٹتی رہی، برا ہو ان نام نہاد تحریکات اصلاحِ زبان کا جنھوں نے اردو غزل سے مقامی رنگ چھن کر اسے ایک حد تک غریب کر دیا اور بھلا ہو نظیر اکبرآبادی کا، جنھوں نے ہندوستانیت کو غزل میں تو نہیں البتہ نظم میں اپنی حد تک بحال کیا، لیکن افسوس کہ نظیر اپنی مقامیت کی بنا پر کوئی تحریک نہ بن سکے، صرف ایک رجحان رہے۔

پھر ایک دور ایسا بھی آیا کہ غزل کی گردن کو بے تکلف مار دینے کے احکام جاری کر دیے گئے، کیونکہ اس کو نیم وحشی قرار دے دیا گیا تھا، لیکن غزل اپنے رنگ اور موضوعات بدل بدل کر خود کو مستحکم کیے رہی اور آج تک زندہ و توانا چلی آ رہی ہے۔ یہ اور بات ہے کہ بیسویں صدی کے تمام اہم شعرا اقبال، فیض، جوش، راشد، میراجی اور اختر الایمان وغیرہ نظم کی طرف رجوع ہو گئے تھے۔ اس تمام ہنگامہ آرائی کے دوران خواتین کی ایک خوشگوار تعداد بھی غزل کی شاعری کرتی رہی اور موجودہ دور کی ان اردو شاعرات میں ملکہ نسیم نے خاصا احترام و استناد حاصل کیا۔

ملکہ نسیم نے اپنی ادبی زندگی کا سفر الہ آباد کی مردم خیز سرزمین سے راجپوتانہ کی سنگلاخ نگری تک طے کیا ہے۔ ان کے تین شعری مجموعے دوپہر کا سفر (1992)، آج کا

موسم (1999) اور 'سیپ میں سمندر' (2016) شائع ہوکر مقبول ہو چکے ہیں اور وہ سنجیدہ شاعروں کا ایک معزز نام شمار کی جاتی ہیں۔ یہاں چند دانشور قسم کے اکابرین اردو سوال کر سکتے ہیں کہ مشاعروں کے ذریعے نام اور احترام حاصل کرنے والی شاعرہ کیا معیاری شاعری بھی کرسکتی ہے۔ تو راقم کا جواب اثبات میں ہے اور ثبوت کے طور پر میر و مرزا سے لے کر جوش ملیح آبادی، فراق گورکھپوری، مخمور سعیدی، بشیر بدر، شہریار، ش ک نظام اور فرحت احساس تک کی مثالیں پیش کی جاسکتی ہیں، جنھوں نے مشاعروں کے ذریعے ہی احترام و استناد حاصل کیا۔

'ملکہ نسیم کی شعری کائنات' جیسی معتبر کتاب ترتیب دے کران کی صلاحیتوں اور خدمات کا گویا اعتراف بھی کیا ہے اور ملکہ نسیم کی اہمیت میں اضافہ بھر کیا ہے۔ کتاب کی ابتدا میں ملکہ نسیم نے اپنے تعارفی مضمون بعنوان 'دامِ ہر موج میں ہے' میں ایک جگہ وہ کہتی ہیں:

''اکثر دل چاہنے لگتا ہے کہ اپنے اندر ایک ایک قطرے کا منتھن کرکے اس کے اندر سے نکلنے والے زہر کو پی کر نیل کنٹھ ہی بن جاؤں تا کہ درد و کرب کا ناگ اپنے گلے میں ڈال کر دنیا کے سامنے آیا جا سکے۔''

یعنی شیو کی طرح شاعرہ بھی دنیا بھر کا زہر اپنے اندر اتار کر دنیا کی تطہیر کرنا چاہتی ہے یا خود کو قربان کرنا چاہتی ہے، یہ کون جانے؟

زیر تبصرہ کتاب میں مجروح سلطانپوری، زبیر رضوی اور پروفیسر محمد زماں آزردہ سے لے کر ثروت خاں، ملک زادہ جاوید اور شاہد پٹھان تک کے 25 تنقیدی مضامین یکجا کرکے ایک اہم کارنامہ انجام دیا گیا ہے اور مستقبل کے ناقدین کا کام آسان کردیا ہے۔

آخر میں ملکہ نسیم کی منتخب غزلیات اور چند نظمیں شامل کرکے اردو قارئین اور نئے طلبا کے لیے مزید آسانی پیدا کردی ہے۔

زبیر رضوی نے لکھا تھا کہ 'دوپہر کا سفر' ایک ایسے ناآسودہ و نامطمئن مگر نیک دل کردار کے سفر کا استعارہ ہے جو گرد و پیش کی ناپسندیدہ فضا میں بچپن کی معصوم یادوں اور اپنے کچھ آدرشوں کی انگلی تھامے ان رنگوں کی تلاش میں بھٹک رہا ہے، جن سے وہ اپنے لیے خوابوں کی دنیا سجا سکے۔ مثال کے طور پر ملکہ نسیم کے یہ اشعار

اداس آنکھوں سے ہوں زندگی کی برساتیں   تم اپنے لہجے میں ایسا بھی اک ہنر رکھنا
حاصل ہے یہ صدیوں کی مری تشنہ لبی کا   اک بوند ہوا بن کے سمندر سے اڑی ہے

ڈاکٹر علی احمد فاطمی نے اپنے مضمون میں لکھا ہے کہ ملکہ نسیم کو میں ایسی شاعرات میں شمار کرتا ہوں جنھوں نے فیشن کے طور پر شاعری کی اور نہ ہی تانیثیت کا لبادہ زیب تن کیا، نہ آنچل بھگوئے اور نہ پلکیں۔ ان کے پہلے مجموعے کے سرنامے پر ان کا یہ نمائندہ شعر درج ہے۔

خواب ٹھہرے تھے تو آنکھیں بھیگنے سے بچ گئیں
ورنہ چہرے پر تو غم کی بارشوں کا عکس ہے

ڈاکٹر خالد علوی اپنے تنقیدی مضمون میں رقمطراز ہیں کہ ملکہ نسیم کی غزل میں کچھ ایسے سیاسی اور عصری مسائل بھی نظر آتے ہیں جو کچھ عرصہ پہلے تک غزل کی بارگاہ میں ممنوع تھے۔ مثال کے طور پر۔

فصیل شہر پہ لکھا تھا، شہر امن ہے یہ   درونِ شہر ابلتا تھا خون کا دریا
بیٹے تو بک گئے ہیں سبھی اونچے داموں پر   جلنے سے بیٹیوں کو بچائیں تو کس طرح

غرض اسی قسم کے تمام مباحث زیر تبصرہ کتاب 'ملکہ نسیم کی شعری کائنات' میں اٹھائے گئے ہیں اور ہر پہلو سے ملکہ نسیم کے فن کا جائزہ لیا گیا ہے۔ اس کے لیے ڈاکٹر شاہینہ تبسم اور ملکہ نسیم صاحبہ دونوں مبارکباد کی مستحق ہیں۔ کتاب کا گٹ اَپ معیاری اور چنندہ کلام بھی بہترین شاعری کا نمونہ ہے۔

اردو صحافت : تجزیاتی ولسانیاتی ڈسکورس

مرتبین: محمد جہانگیر وارثی، صباح الدین احمد
صفحات: 360، قیمت: 670
ناشر: یونیورسل بک ہاؤس، نزد مسجد شمشاد مارکیٹ، علی گڑھ
مبصر: حامد رضا صدیقی
شعبۂ اردو، اے ایم یو، علی گڑھ

زیر نظر کتاب 'اردو صحافت: تجزیاتی ولسانیاتی ڈسکورس' کے مرتبین پروفیسر محمد جہانگیر وارثی، صباح الدین احمد ہیں۔ اس کتاب میں 29 مقالات شامل ہیں، جو اردو زبان و ادب کے محققین و ناقدین کے رشحاتِ قلم کا نتیجہ ہیں مذکورہ کتاب میں جو مقالات و مضامین شامل ہیں وہ مختلف نوعیت و انفرادیت کے حامل ہیں یعنی ان میں کہیں صحافتی زبان کے اجزائے ترکیبی، اس کی ساخت و ہیئت اور موجودہ عہد میں اردو صحافت کی بدلتی ہوئی نحوی ولسانیاتی صورت حال اور اس کے وافر ذخیرہ الفاظ اور اردو صحافت کی اصطلاحوں پر بڑی گہرائی و گیرائی سے بات کی گئی ہے تو کہیں صحافتی زبان کی عام روش اور اس کی صحافتی اصطلاحوں کے تراجم اس کے مسائل و امکانات صحافت کی زبان کس قدر دیگر زبان سے مختلف ہے، صحافتی زبان وقت کے ساتھ کس طرح اپنی ساخت و ہیئت بدلتی ہے وہ اپنی لفظیات ولسانیات کی تشکیل و تعبیر اور تعمیر کس طرح سے کرتی ہے۔ اس حوالے سے وہ زبان کو کس طرح وسعت دیتی ہے، اس پر بھی بھرپور گفتگو کی گئی ہے۔

ان مضامین میں صحافت کے فنی امتیاز و اختصاص کے حوالے سے مشاہیر نے جو کچھ بھی رقم کیا ہے اس سے نہ صرف صحافت کے فن بلکہ صحافت کے دیگر فنی لوازمات و مضمرات کی تفہیم بھی آسان ہو جاتی ہے۔ احمد جاوید، امام اعظم، سہیل انجم، محمد کاظم، محمد علی جوہر، سید احمد قادری، غضنفر علی، اعجاز محمد شیخ، سعد بن ضیا، محمد شکیل اختر، زبیر احمد، آفتاب احمد آفاقی، شبیر احمد صدیقی، احمد علی جوہر، سلمان عبد الصمد، نعمان طاہر، نے اپنے مضامین میں صحافت کی انفرادیت، صحافت کی تاریخ اور اس کے لسانیاتی، تجزیاتی، موضوعاتی تنوع کا جائزہ نیز اس کے معاشرتی و ثقافتی انسلاکات، صحافت کا لسانیاتی عروج و زوال تہذیبی تصادم اقدار و روایت کے فروغ میں صحافتی دنیا نے کیا کیا خدمات انجام دیں ہیں ان تمام موضوعات کو مقالہ نگاروں نے بخوبی روشن کیا ہے۔ صحافت میں عہد بہ عہد لسانی طور پر کیا کیا تبدیلیاں ہوئی ہیں اور دیگر زبان کو اردو کی صحافتی دنیا نے کس سلیقے سے اپنایا ہے اور اس سے اردو صحافت کی دنیا کو وسعت بخشی ہے، اس طرح صحافت کے تمام زاویوں کو بہت عمدگی سے سمیٹنے کی کوشش کی گئی ہے۔ اس کتاب کے تمام مقالہ نگار یہ ثابت کرنے میں کامیاب ہیں کہ اردو صحافت معاصر عہد میں کس طرح سے اپنی نمائندگی پیش کر رہی ہے اور اردو صحافت نے اسلوب کی سطح پر کتنے نئے زاویے تلاش کیے ہیں نیز اردو صحافت کے افق کو وسعت عطا کی ہے۔

جرنلزم میں اردو صحافت کا امتیاز و اختصاص کیا ہے اس تعلق سے بھی بعض مقالات اس کتاب کی زینت ہیں۔ کتاب میں بعض مقالات ایسے ہیں جن میں صحافت کے ابتدائی عہد سے لے کر موجودہ عہد تک کی اردو صحافت کا بتدریج احاطہ کیا گیا ہے اور ان کی تاریخی ترتیب قائم کرتے ہوئے ان کے جملہ محاسن و معائب کا تذکرہ بھی زیر بحث آیا ہے۔

ان مضامین کے علاوہ کچھ تجزیے بھی اس میں شامل ہیں جیسے سلمان عبد الصمد، نعمان طاہر، محمد توصیف، زبیر احمد، سید طلحہ، محمد شمشیر، احمد علی جوہر، قسیم اختر، حبیب الرحمٰن، پلو وشنو، شبیر احمد صدیقی جیسے اہم نام شامل ہیں جنھوں نے کچھ مخصوص اخبار و رسائل، ان کے زبان و بیان، اسلوب بیان اور ان کے ترسیلی ولسانیاتی سروکار کیا کیا ہیں۔ ان

اخبارات و رسائل میں علاقائی زبان کس حد تک دخل انداز ہے ان تمام اخباروں کے متون کا مطالعہ کرتے ہوئے، ان کے لسانیاتی و موضوعاتی تجزیے بڑے معروضی انداز میں پیش کیے ہیں۔

اردو صحافت کی زبان و بیان اور اس کے تاریخی و لسانی طور پر جو تجزیے پیش کیے گئے ہیں ان تجزیوں سے اردو صحافت کی اہمیت و خصوصیت اور اس کے تمام امکانات و اطراف واضح اور روشن ہو جاتے ہیں۔ کتاب کے مرتب معروف اسکالر و ناقد پروفیسر ایم جے وارثی نے اپنے مبسوط مقدمے میں اردو صحافت کا بہت ہی معروضی و منطقی جائزہ پیش کیا ہے۔ ان کے ضخیم مقدمے سے اردو صحافت کے وہ تمام زاویے روشن ہو گئے ہیں جو ابھی تک پردۂ خفا میں تھے اردو صحافت کی تاریخ اس کے تلازمات اور فنی نبوغ کا بہت باریک بینی سے محاکمہ کیا ہے۔ اس کتاب میں شامل تمام مضامین اتنے اہم ہیں کہ ہر مضمون پر گفتگو طوالت کا باعث ہوگی۔ ابتدا میں شافع قدوائی صاحب نے اپنے پیش لفظ میں اردو صحافت کی تاریخ، روایت اس کے آغاز و ارتقا، موضوعات و تلازمات کے حوالے سے بہت ہی معرکۃ الآرا پیش لفظ تحریر کیا ہے۔ جس میں انھوں نے اردو کے معتبر صحافیوں اور اخبار و رسائل ان کی تاریخی اہمیت و افادیت، انیسویں و بیسویں صدی میں اردو صحافت انسانیت کے مسائل سے کسی طرح نبرد آزما ہوئی، اردو صحافت نے کس طرح سے ترقی کیا ہے، زبان و اسلوب کی سطح پر کیا تبدیلیاں ہوئیں ان تمام نکات پر اجمالاً اشارے کیے ہیں۔ شافع صاحب کا یہ اقتباس اس کتاب کی معنویت کو واضح کرنے کے لیے کافی ہے کہ بحیثیت مجموعی یہ کتاب اردو صحافت کے لسانی امکانات اور تغیرات کا ایک واضح نقش قائم کرتی ہے جس کے لیے پروفیسر محمد جہانگیر وارثی اور ڈاکٹر صباح الدین ہدیہ تبریک کے مستحق ہیں۔

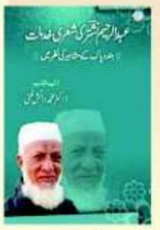

عبد الرحیم نشتر کی شعری خدمات

(ہندو پاک کے مشاہیر کی نظر میں)

مرتب: ڈاکٹر محمد دانش غنی

صفحات: 624، قیمت: 324، سنہ اشاعت: 2022

رابطہ: ڈاکٹر محمد دانش غنی، صدر شعبۂ اردو، گوگٹے جوگلے کر کالج، رتناگری

مبصر: ڈاکٹر ظہیر حسن ظہیر، مغل پورہ، نزد زبیر مسجد، مئوناتھ بھجن۔ 275101 (یوپی)

زیر مطالعہ کتاب کو محمد دانش غنی نے آٹھ عنوانات میں تقسیم کیا ہے۔ کتاب کا پہلا عنوان 'بازگشت' کے نام سے قائم کیا گیا ہے، جس میں فضیل جعفری اور عبد الرحیم نشتر کے درمیان نئی غزل کا مزاج اور جدید غزل کے حوالے سے جو علمی و ادبی معرکہ ہوا تھا اسے پیش کیا ہے۔ دوسرا باب 'ادھورا وسیلہ' کے نام سے ہے، جس میں م۔ ناگ، ڈاکٹر غضنفر اقبال اور رحمانی سلیم احمد کے ذریعے عبد الرحیم نشتر سے لیے گئے انٹرویوز شامل ہیں۔ تیسرا عنوان 'محبت کا سفر ہے' اس میں ملک کے 9 مشاہیر شعرا نے عبد الرحیم نشتر کو منظوم خراج تحسین پیش کیا ہے۔ 'شہادت چاند سے روشن ہے' کتاب کا چوتھا عنوان ہے۔ اس کے تحت 12 اہم قلم کاروں نے عبد الرحیم نشتر کی شخصیت کے مختلف گوشوں کو اجاگر کرنے کی کوشش کی ہے۔ پانچویں عنوان 'آسماں پر چمکتی ہوئی کہکشاں' کے تحت ان کی غزلیہ شاعری اور فکر و فن پر ملک کے 21 مشاہیر صاحب قلم نے سیر حاصل گفتگو کی ہے، جب کہ چھٹویں عنوان 'صناع ازل کا انعام' میں ان کی نظمیہ شاعری پر 13 اور ساتویں عنوان 'خوشبو کا جھونکا' کے تحت عبد الرحیم نشتر کی ادب اطفال کی شاعری کے حوالے سے ملک کے نامور 12 ادبا و ناقدین کے مضامین شامل ہیں۔ آٹھواں عنوان 'سارے موسم اس کے ہاتھ' کے نام سے قائم کیا گیا ہے، جس میں موصوف کی منتخب تخلیقات شامل کتاب کی گئی ہیں۔ علاوہ ازیں عبد الرحیم نشتر کی کتابوں پر تبصرے اور ملک کے مشاہیر کی قیمتی آرا اور ان کے نام لکھے گئے خطوط کو بھی زیر تبصرہ کتاب میں شامل کیا گیا ہے۔

عبد الرحیم نشتر کا تخلیقی سفر تقریباً پانچ دہائی کو محیط ہے۔ اس عرصے میں موصوف نے دو درجن کتابیں تصنیف تالیف کی ہیں۔ موصوف ایک ہمہ جہت تخلیق کار ہیں۔ انھوں نے شاعری کے ساتھ ساتھ تنقید و تحقیق کے حوالے سے بھی قابل ذکر کارنامے انجام دیے ہیں، لیکن اردو ادب میں عبد الرحیم نشتر کی اصل شناخت ایک جدید غزل گو شاعر کی حیثیت سے قائم ہوئی ہے۔ موصوف کی جو تصنیفات و تالیفات منظر عام پر آکر ملک کے مقتدر و مشاہیر ادبا اور ناقدین فن سے داد و تحسین حاصل کر چکی ہیں ان میں 'چاروں اور (غزلوں کا انتخاب) 'ارتکاز' (ہند و پاک کی جدید غزلوں کا انتخاب) 'اعراف، شام گراں، سارے موسم اس کے ہاتھ (غزلوں کے مجموعے) 'پرندے تو مسافر ہیں' (نظموں کا مجموعہ) 'بے چارے فرشتے، کوکن رانی، موتی چور کے لڈو، گل چھرے، بچوں کا سنسار (بچوں کی نظموں کے مجموعے) 'ناگ پور یونیورسٹی میں اردو، ودربھ میں اردو، انکشاف راز (تحقیق) 'شخص اور شاعر، لب و لہجہ' (تنقید) 'یاد زرینہ ثانی، حسب منشا، کوکن میں اردو تعلیم، پونے میں اردو تعلیم (تحقیق و تنقید) 'بھوپال ایک خواب (افسانوی رپورتاژ) 'نورنژاد (ودربھ میں اردو افسانہ: پچاس سالہ دور کی تحقیق و تجزیہ) جیسی قابل قدر کتابیں ان کے جادو بیان قلم کی روانی کا بین ثبوت ہیں، لیکن افسوس کہ اس تخلیق کار کو ادب میں وہ مقام حاصل نہیں ہو سکا جس کا وہ حقدار ہے۔

عبد الرحیم نشتر کا شمار 1960 کے بعد کی نسل کے اہم شعرا میں ہوتا ہے۔ موصوف کے پہلے شعری مجموعہ 'اعراف' کی اشاعت نے لوگوں کو چونکا دیا۔ ان کے لہجے کی انفرادیت اور موضوعات و مضامین کے انوکھے پن نے انھیں بہت جلد شہرت و مقبولیت سے ہمکنار کر دیا۔ ان کے پہلے شعری مجموعے 'اعراف' پر معروف نقاد شمس الرحمٰن فاروقی کی رائے سے ان کی اہمیت کا اندازہ ہوتا ہے:

''ادھر کچھ برسوں سے جدید تر ذہنوں کا جو ایک قافلہ نئی جہتوں کی طرف گرم سفر ہے اس میں عبد الرحیم نشتر کے نام کو نظر انداز کرنا مشکل ہے۔ اس کی شاعری کی عمر دیکھ کر خیال ہوتا ہے کہ اس کا پہلا مجموعہ قبل از وقت چھپ گیا ہے، یا کوئی لمحاتی معجزہ ہو گیا ہے، مگر ان اشعار کو پڑھ کر اس خیال کی تکذیب ہوتی ہے۔''

عبد الرحیم نشتر ایک قلندر صفت انسان ہیں۔ وہ نمود و نمائش کے قائل نہیں ہیں، بلکہ وہ صدق دلی کے ساتھ زبان و ادب کی خدمت کرنے میں منہمک ہیں۔ صلہ و ستائش کی تمنا سے ان کا دامن خالی نظر آتا ہے۔ ان کی جو خدمات ہیں اس کے عوض صرف چند اکیڈمیوں کے انعامات ناکافی ہیں۔ انھوں نے اردو زبان و ادب کی جو خدمات انجام دی ہیں وہ ناقابل فراموش ہیں۔ انھوں نے کبھی زبان حال سے اس کی شکایت نہیں کی۔ ناقدین ادب نے ان تخلیقی صلاحیتوں کا اعتراف کرنے میں کوتاہی برتی۔ اس تعلق سے ماہر پریم چند اور ترقی پسند نقاد پروفیسر قمر رئیس رقم طراز ہیں:

''عبد الرحیم نشتر بلا شبہ اردو کے ان چند تخلیق کاروں میں ہیں، جو بے پناہ صلاحیتوں اور منفرد تخلیقی کارناموں کے باوجود اردو شاعری کے پیش منظر میں وہ جگہ نہیں بنا سکے جو ان کا حق تھا۔ اس میں اردو کے ناقدین کی کوتاہ نظری تو ہے ہی ان کی اپنی بے نیازی اور قلندری کا بھی بڑا دخل ہے...... میرا خیال ہے کہ اس میں عبد الرحیم نشتر سے کہیں زیادہ اردو زبان کی محرومی کا المیہ چھپا ہے۔''

عبد الرحیم نشتر نے فکر و خیال کی زرخیزی اور تخیل کی بلند پروازی سے غزل

کے رنگ و آہنگ کو جو اعتبار بخشا ہے وہ دیر تک ان کو اردو ادب میں زندہ رکھے گا۔ اس ضمن میں معروف ادیب، شاعر و نقاد ڈاکٹر ایم نسیم اعظمی کی رائے بڑی متوازن معلوم ہوتی ہے:

''عبد الرحیم نشتر عہد حاضر کی نئی غزل کے نمائندہ شعرا میں شمار کیے جاتے ہیں۔ انھوں نے اپنی بے پناہ ذہنی اور فکری زرخیزی اور تخیل کی بلند پروازی کی بدولت اردو کے گلستانِ غزل میں جونت نئے گل بوٹے اگائے ہیں اور غزل کی سرسبزی و شادابی میں جو اضافے کی کوشش کی ہے اس سے ادب و شاعری کے قارئین بخوبی واقف ہیں، اور جنھیں کسی بھی حال میں نظر انداز کرنا مشکل ہے۔''

زیر نظر کتاب کی ترتیب و تدوین میں محمد دانش غنی کی سلیقہ مندی کے ساتھ ان کی اردو ادب سے گہری وابستگی کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ اس دستاویزی حیثیت کی کتاب کو منظر عام پر لانے کے لیے انھیں ہم دلی مبارکباد پیش کرتے ہیں، امید ہے کہ ان کی محنت شاقہ رنگ لائے گی اور اس کتاب کی اردو کے ادبی حلقوں خاطر خواہ پذیرائی بھی ہوگی۔

ہفت پہلو سلیم شیرازی

مرتب: عبد الواحد ہاشمی، نفیس الرحمٰن سیوہاروی

صفحات: 400، قیمت: 400 روپے، سنہ اشاعت: 2022

ناشر: راہی کتاب گھر، سی 2، جیوتی کالونی، لونی روڈ، شاہدرہ، دہلی 23

مبصر: سلام خان، ای 213، فورتھ فلور، شاہین باغ، نئی دہلی 25

کسی شخصیت کے بارے میں جاننے کے لیے ضروری نہیں ہے کہ اس سے بالمشافہ ملاقات ہی کی جائے بلکہ اس کی تخلیقات، تحریروں اور سرگرمیوں سے بھی اس کی شخصیت کے مختلف پہلوؤں سے واقفیت حاصل کی جا سکتی ہے۔ اس کے شاگردوں اور عقیدت مندوں کی تعداد سے بھی اس کی مقبولیت کا بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ سلیم شیرازی ایک ایسی ہی شخصیت کا نام ہے جن کے عقیدت منداور چاہنے والے لاتعداد ہیں۔ اس میں وہ لوگ بھی شامل ہیں جنھوں نے آپ سے بالمشافہ ملاقات کا شرف حاصل کیا ہے اور ان کی بھی خاطر خواہ تعداد ہے جو آپ کی تحریروں اور تخلیقات ہی سے غائبانہ طور پر آپ کی شخصیت کے گرویدہ ہیں۔ زیر تبصرہ کتاب 'ہفت پہلو سلیم شیرازی' ایک ایسی کتاب ہے جس میں سلیم شیرازی کے چاہنے والوں اور ان کے عقیدت مندوں نے اپنے تجربات، ذاتی مشاہدے اور ان کی تحریروں اور تخلیقات کی روشنی میں ان کی زندگی کے مختلف پہلوؤں پر روشنی ڈالی ہے۔

مجھے نہیں معلوم کہ سلیم شیرازی کا ایران کے شہر شیراز سے کوئی تعلق ہے یا نہیں لیکن بنیادی طور پر ان کا تعلق تہذیب کے شہر لکھنؤ سے ہے۔ ایک زمانہ تھا جب دہلی کو خیر باد کر کے ادبا اور امرا لکھنؤ کو اپنا ملجا و مسکن بنائے ہوئے تھے اور اودھ کی شام کو دوبالا کر رہے تھے۔ اس روایت کو سلیم شیرازی نے تبدیل کرتے ہوئے دہلی کو اپنی کرم بھومی بنایا اور تا حال یعنی ریٹائرمنٹ کے بعد دہلی ہی اب ان کا مسکن ہے۔ دہلی نے ان کو دل سے قبول بھی کر لیا ہے۔ کیونکہ انھوں نے لکھنوی سخن اور دہلی کی ٹکسالی زبان کے درمیان خود کو بہترین طریقے سے ہم آہنگ رکھا۔ وہ دہلی میں لکھنوی تہذیب کے نمائندہ شمار کیے جاتے ہیں۔ بلکہ دہلی میں اردو کے بزرگ صحافیوں کی جو نسل ابھی باقی ہے اس میں سلیم شیرازی کا نام سرفہرست ہے۔

کتاب کا نام ہے 'ہفت پہلو سلیم شیرازی' اس کو مرتب کیا ہے عبد الواحد ہاشمی اور نفیس الرحمٰن سیوہاروی نے۔ یہ کتاب سلیم شیرازی کی شخصیت پر مشتمل مضامین کا مجموعہ ہے۔ کتاب میں مختلف شعبہ ہائے حیات سے وابستہ شخصیات کی تحریریں شامل ہیں۔ اس میں وہ لوگ بھی ہیں جو سلیم شیرازی کے ساتھ دوران ملازمت رہے اور وہ لوگ بھی شامل ہیں جو غائبانہ طور پر آپ کی تحریروں اور سرگرمیوں سے ہی متعارف ہوئے بالمشافہ ملاقات نہیں کی۔ م افضل، پروفیسر منظر عباس، پروفیسر اختر الواسع، عظیم اختر، فاروق ارگلی، شکیل شمسی، مودود صدیقی جیسی قابل قدر شخصیات کے مضامین شامل ہیں تو وہیں حقانی القاسمی، معین شاداب، جلال الدین اسلم، اشہر ہاشمی، ڈاکٹر مہتاب امروہوی جیسی نامور ادبی شخصیات کی نگارشات بھی ہیں۔ ادے بھان کوشک، محمد شرافت علی، ارشد ندیم، مالک اشتر، ممتاز عالم رضوی، محمد انس فیضی و دیگر جیسے فعال صحافیوں نے بھی سلیم شیرازی کی صحافتی زندگی پر بھرپور روشنی ڈالی ہے۔

کتاب کو تین مختلف ابواب میں تقسیم کیا گیا ہے اور ہر باب کے تحت ایک پیش لفظ شامل ہے۔ پہلا باب 'سلیم شیرازی شخص و عکس' کے عنوان سے درج ہے جس میں سینئر صحافی م افضل کے مضمون کو پیش لفظ کے طور پر شامل کیا گیا ہے۔ پروفیسر منظر عباس، پروفیسر اختر الواسع، شکیل شمسی سمیت 28 شخصیات کے مختلف عنوانات پر مشتمل مضامین شامل ہیں۔ جن میں سلیم شیرازی کی حیات کے مختلف پہلوؤں کا جائزہ لیا گیا ہے۔ دوسرا باب 'سلیم شیرازی: بحیثیت صحافی' ہے۔ جس میں شعیب اقبال کے مضمون کو پیش لفظ کے طور پر شامل کیا گیا ہے۔ اس باب میں معین شاداب، ظفر انور، جلال الدین اسلم، محمد ظفر حسن، مفیض جیلانی، طٰہٰ نسیم اور ادے بھان کوشک کے مختلف عنوان کے تحت سات مضامین شامل ہیں جن میں سلیم شیرازی کی صحافتی سرگرمیوں پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ تیسرے باب کا عنوان ہے 'سلیم شیرازی: بحیثیت سخن ور'، اس باب میں فصیح اکمل کے مضمون کو پیش لفظ کے طور پر شامل کیا گیا ہے، حقانی القاسمی، معین شاداب، شاہد انور، اشہر ہاشمی، ڈاکٹر مہتاب امروہوی، ڈاکٹر ممتا عالم رضوی سمیت مجموعی طور پر پندرہ مضامین شامل ہیں، جن میں مختلف عنوانات کے تحت مضمون نگاروں نے سلیم شیرازی کی تخلیقات اور البیلی تحریروں کا جائزہ لیا ہے۔ چونکہ سلیم شیرازی نہ صرف معروف صحافی ہیں بلکہ ایک کہنہ مشق شاعر بھی ہیں، ان کو یہ انفرادیت حاصل ہے کہ انھوں نے صحافتی میدان اور ترجمہ نگاری میں عبور حاصل کرنے کے ساتھ ساتھ ادبی میدان میں شعر و شاعری میں بھی قابل قدر مقام حاصل کیا ہے۔ ان کی نظمیں اور غزلیں ادبی مجلسوں میں کافی مقبول رہی ہیں اور قدر کی نگاہ سے پڑھی اور سنی جاتی رہی ہیں۔ کتاب کے اخیر میں ان کی نظموں، غزلوں، منقبت، نعت اور سلام کو بھی شامل کیا گیا ہے۔ ان کی شاعری کے تعلق سے پروفیسر اختر الواسع اپنے مضمون میں لکھتے ہیں: شاعر کی حیثیت سے وہ ایک پختہ گو، کہنہ مشق، مترنم لب و لہجے کے باقی شاعروں میں سے ایک ہیں اور خود ہی شاعر نہیں بلکہ استاد شاعروں میں شمار ہوتے ہیں۔ ان کے تلامذہ کا ایک اچھا خاصا حلقہ ہے جن کے فکری، تخلیقی سفر میں ان کا اک غیر معمولی اثر و نفوذ رہا ہے۔

ان کے چند اشعار

گھر کے گلدان میں کچھ پھول سجا لیتے ہیں — ہم بھی کس طور سے موسم کا مزہ لیتے ہیں

ہم کو معلوم نہ تھا شور میں تنہائی کے — اپنی آواز بھی سننے کو ترس جائیں گے

مجموعی طور پر یہ کتاب سلیم شیرازی کی شخصیت اور آپ کی صحافتی اور ادبی خدمات سے واقفیت حاصل کرنے کے لیے بہترین تحفہ ہے۔ مستقبل میں آنے والوں کے لیے نہایت مفید اور معاون ثابت ہوگی۔

مفتی محمد ثناء الہدیٰ قاسمی: شعراء کرام کی نظر میں: ایک مطالعہ

مرتب: عبدالرحیم برہولیاوی

صفحات: 72، قیمت: 60 روپے، سنہ اشاعت: جولائی 2022

ناشر: نوراردو لائبریری حسن پور گنگھٹی بکساما، ویشالی (بہار)

مبصر: انوارالحسن وسطوی، حسن منزل، روڈ نمبر 6، آشیانہ کالونی سنچھی پٹی، پوسٹ: حاجی پور، ضلع ویشالی۔ 844101 (بہار)

زیر تذکرہ کتاب کے مرتب جناب عبدالرحیم برہولیاوی ہیں۔ مفتی صاحب بھی عبدالرحیم برہولیاوی کو عزیز رکھتے ہیں۔ اسی محبت کا ثبوت پیش کرنے یا اس کا قرض چکانے کے لیے عبدالرحیم صاحب نے مفتی صاحب کی شان میں لکھے تقریباً تین درجن شعراء کرام کے منظوم کلام کو یکجا کر کے کتابی شکل دینے کا کارنامہ انجام دیا ہے۔

عبدالرحیم برہولیاوی نے اپنی کتاب کا آغاز اپنی تحریر بعنوان 'اپنی بات' سے کیا ہے، کتاب کا 'پیش لفظ' جواں سال ادیب، ناقد، شاعر اور صحافی ڈاکٹر کامران غنی صبا کا تحریر کردہ ہے جبکہ معروف ادیب، ناقد، شاعر، محقق اور صحافی ڈاکٹر عطا عابدی نے بھی کتاب کے تعلق سے اپنی بات 'دو باتیں' کے عنوان سے لکھی ہے، مذکورہ تینوں تحریروں میں مفتی محمد ثناء الہدیٰ قاسمی کی ذات اور ان کی صفات کے علاوہ زیر تذکرہ کتاب کے تعلق سے بھی بڑی عمدہ اور قیمتی باتیں کہی گئی ہیں۔

''مفتی محمد ثناء الہدیٰ قاسمی: شعراء کرام کی نظر میں 72 صفحات پر مشتمل ہے، جس میں تقریباً تین درجن شعرا کے منظوم کلام کو شامل کتاب کیا گیا ہے، شعراء کرام کی اس فہرست میں کئی بزرگ شعرا بھی ہیں اور جواں سال بھی، کئی معروف شعرا بھی ہیں اور غیر معروف بھی ہیں۔ کتاب میں شامل کچھ نظمیں 2000 میں مفتی صاحب موصوف کو صدر جمہوریہ ہند سے ملے ایوارڈ سے متاثر ہو کر لکھی ہوئی ہیں۔ کچھ نظمیں موصوف کو چوتھی دفعہ حج بیت اللہ کی سعادت نصیب ہونے کے موقع پر کہی ہوئی ہیں، بقیہ نظمیں مفتی صاحب کی علمی، دینی، ملی خدمات کی عکاسی کرتی نظر آتی ہیں اور کچھ نظمیں ان کی دیدہ وری، ان کے اخلاق و عادات اور ان کی انسانی خوبیوں سے متعلق ہیں۔ جن شعراء کرام کے منظوم کلام سے یہ کتاب مزین ہے ان کے نام ہیں: پروفیسر عبدالمنان طرزی، ذکی احمد ذکی، حسن نواب حسن، ڈاکٹر امام اعظم، ولی اللہ ولی، سید مظاہر عالم قمر، امان ذخیروی، محمد انوارالحق داؤد قاسمی، مظاہر حسین عماد عاقب قاسمی، طارق ابن ثاقب، کامران غنی صبا، ڈاکٹر منصور خوشتر، احمد حسین محرم قاسمی، شمیم اکرم رحمانی، اشتیاق حیدر قاسمی، منصور قاسمی، محب الرحمٰن کوثر، زماں بردھوائی، محمد ضیاء العظیم، محمد مکرم حسین ندوی، عظیم الدین عظیم، کمال الدین کمال عظیم آبادی، وقیع منظر، فیض رسول فیض، یاسین ثاقب، آفتاب عالم آفتاب، ڈاکٹر عبدالودود قاسمی، محمد بدر عالم بدر، ثنا رقم مئوی، فیاض احمد مضطر عزیزی، عبدالصمد ویشالوی، مظہر وسطوی اور تحسین روزی۔

چند شعرا کے منظوم کلام سے چند منتخب اشعار بطور نمونہ ملاحظہ ہوں؛ جن میں مفتی صاحب کے تئیں عقیدت و محبت کے اظہار کے ساتھ ان کی علمی، ادبی، مذہبی، سماجی اور فلاحی خدمات کا اعتراف کیا گیا ہے۔

عالم دیں کا ہو ادبی مشغلہ ۔۔۔ شاذ و نادر ہی ایسا ہے دیکھا گیا
جو ہاں مگر ہیں مفتی ثناء الہدیٰ ۔۔۔ ان کا ہے ان سبھوں سے الگ راستہ

(پروفیسر عبدالمنان طرزی)

وہ ہیں عالم باعمل بالیقیں ۔۔۔ جنھیں کہیے اسلاف کا جانشیں

مفکر، مدبر کہ دانشوراں ۔۔۔ سبھی ان کے حق میں ہیں رطب اللساں

(ڈاکٹر کامران غنی صبا)

تحریر لازوال ہے تقریر بے مثال ۔۔۔ ماضی کی داستاں ہے ثناء الہدیٰ کی ذات
شعر و ادب کی بزم ہو یا علم دیں کی راہ ۔۔۔ ہر سمت پُرفشاں ہے ثناء الہدیٰ کی ذات

(امان ذخیروی)

تقریر دلنشیں ہے تو انداز دلکشا ۔۔۔ ہر سننے والا آپ کا شیدائی ہوگیا
ہے گفتگو میں ایسی حلاوت کہ دیکھیے ۔۔۔ شاباش، آفریں تو کہے کوئی مرحبا

(یاسین ثاقب)

مختصر یہ کہ زیر نظر کتاب مفتی محمد ثناء الہدیٰ قاسمی کی شخصیت، صفات، خدمات کا ایک دلکش مرقع ہے۔ ایسی عمدہ، دلچسپ اور فرحت بخش کتاب ترتیب دینے پر عبدالرحیم برہولیاوی یقیناً مبارکباد اور پذیرائی کے مستحق ہیں۔ انھوں نے مفتی محمد ثناء الہدیٰ قاسمی کے تعلق سے تقریباً تین درجن شعرا کے مختلف اوقات میں کیے گئے منظوم کلام کو یکجا کر کے کتابی شکل دینے کا واقعی ایک بڑا کام کیا ہے۔ ان کے اس کام میں تعاون دینے کے لیے مولانا نظر الہدیٰ قاسمی اور مولانا راشد العزیزی بھی مبارکباد کے مستحق ہیں۔

سوانح و شخصیات

خلیل فرحت کارنجوی (فن و شخصیت)

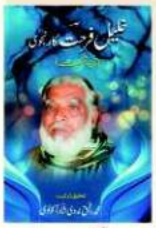

محقق و مرتب: محمد رفیق ندوی شاد آکولوی

صفحات: 300، قیمت: 200 روپے، سنہ اشاعت: 2021

اشاعت: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی

ناشر: الحسنات ایجوکیشن اینڈ ویلفیئر سوسائٹی، آکولہ

مبصر: محمد یوسف رضا، B-276، گلی نمبر 6، سبھاش وہار، نزد کرشنا مندر، نارتھ گھونڈا، دہلی

زیر تبصرہ کتاب 'خلیل فرحت کارنجوی (فن و شخصیت)' کو محمد رفیق ندوی شاد آکولوی نے مرتب کیا ہے۔ ان کا تعلق مہاراشٹرا کے شہر آکولہ سے ہے۔ وہ اس وقت کویت میں مقیم ہیں۔ انھیں ابتدا سے ہی شعر و ادب سے دلچسپی رہی ہے۔ قرب و جوار میں اکثر مشاعروں میں شریک ہوتے رہے ہیں۔ وہیں مشاعروں میں ان کی ملاقات خلیل فرحت کارنجوی سے ہوئی۔ اس طرح ملاقاتوں کا سلسلہ چلتا رہا۔ خلیل فرحت صاحب کی حیات میں ہی انھوں نے اس کتاب کے متعلق سوچ لیا تھا لیکن باوجود کوشش کے یہ کتاب خلیل فرحت کے انتقال کے تقریباً تیرہ برس کے بعد منظر عام پر آئی۔

یہ کتاب پانچ ابواب پر مشتمل ہے۔ باب اول 'میزان خرد' کے عنوان سے ہے۔ اس میں ان کے فن سے متعلق چودہ مضامین ہیں جن میں شمس الرحمٰن فاروقی، پروفیسر شارب ردولوی، پروفیسر حامدی کاشمیری، ندا فاضلی، ڈاکٹر مظفر حنفی اور جگن ناتھ آزاد کے نام اہم ہیں۔ یہ تمام مضامین بہت ہی مختصر ہیں۔ باب دوم 'داستان جنوں' کے عنوان سے ہے۔ اس میں خلیل فرحت کی خود نوشت کا مختصر حصہ پیش کیا گیا ہے۔ اس باب میں تمام تحریریں ان کی شخصیت سے متعلق ہیں۔ باب سوم کا عنوان 'نگار خانۂ فرحت' ہے۔ اس میں خلیل فرحت کی کچھ تصاویر ہیں۔ چوتھے باب کا عنوان 'گھر آنگن' ہے۔ اس میں ان کے دونوں بیٹوں شمیم فرحت اور وسیم فرحت کے تاثرات ہیں۔ وسیم فرحت نے 'نذر والد' کے عنوان سے ایک نظم تحریر کی ہے۔ آخری باب یعنی باب پنجم 'آئینۂ معنی نما' میں مکتوبات مشاہیر بنام خلیل فرحت کارنجوی ہیں۔ جن میں شکیل بدایونی، ساحر لدھیانوی، بیکل اتساہی، طالب کاشمیری کے علاوہ سیاسی شخصیات پرمود مہاجن، اور راجیو گاندھی

وغیرہ کے مکتوبات بھی شامل ہیں۔اس کے بعد یعنی کتاب کے آخر میں انتخاب کلام کے عنوان سے خلیل فرحت کے غزلیات،قطعات،تضمینات، کے ساتھ ساتھ کچھ فردیات کو بھی شامل کیا گیا ہے۔جس سے ان کی شاعری کو سمجھنے میں مدد ملتی ہے۔

خلیل فرحت کارنجوی کو ناقدری زمانہ کی شکایت تھی۔ وہ اپنی شکایت اس طرح کرتے ہیں۔

پہلے تو خوب کیجیے ناقدریِ سخن   پھر ان کو یاد کیجیے آنکھیں بھگوئیے
مدت سے اہل نقد و نظر کا طریق ہے   زندوں کو مارڈالیے مردوں کو روئیے

یہ ایک تلخ حقیقت ہے،جس کی طرف خلیل فرحت نے اشارہ کیا ہے۔خلیل فرحت کے کلام سے متعلق پروفیسر شمس الرحمٰن فاروقی نے کہا تھا کہ ان کے کلام میں ایک فقیرانہ بانکپن ہے۔جس کے سبب ان کے یہاں شگفتگی اور تازگی کا عکس جابجا نظر آتا ہے ان کا رنگ استادوں جیسی پختگی اور انفرادیت کا حامل ہے۔انھوں نے دنیا اور اہل دنیا دونوں کو بخوبی جھیلا اور سمجھا ہے۔اسی سبب ان کے کلام میں طنز کی لطیف تیزی بھی جگہ جگہ نظر آتی ہے۔کچھ اشعار ملاحظہ کیجیے۔

اے داور محشر ہمیں فردوس عطا ہو   دنیا میں جہنم کی سزا کاٹ چکے ہیں
میرے اللہ کرم مجھ پہ تو اتنا کردے   یا مناظر کو بدل،یا مجھے اندھا کردے
یوں تو ہر سمت ہے اک بھیڑ مسیحاؤں کی   کوئی ایسا ہے جو بیمار کو اچھا کردے

سوال کرنا زندہ لوگوں کی علامت ہے جو کہ آج بالکل مفقود ہے۔نہ تو سوال کیے جارہے ہیں اور نہ سوالات کا سامنا کرنے کا حوصلہ کسی میں ہے۔لیکن اس ماحول میں بھی ہمیں یعنی سوال کرنے والوں کو مایوس نہیں ہونا چاہیے بلکہ سوال کرتے رہنا چاہیے۔اس کی فکر کیے بغیر کہ جواب ملے گا۔اسی کو خلیل فرحت نے کس سلیقے سے ایک شعر میں پیش کیا ہے۔شعر دیکھیے۔

فلک کی سمت دعائیں اچھال کر دیکھیں   جواب آئے نہ آئے سوال کر دیکھیں

حقیقت تو یہ ہے کہ اس کتاب میں خلیل فرحت کارنجوی کا جو بھی کلام انتخاب کے طور پر پیش کیا گیا ہے وہ واقعی اپنے آپ میں انتخاب ہے۔امید قوی ہے کہ ادبی حلقوں میں یہ کتاب خوب پڑھی جائے گی۔

ڈرامے

اک طُرفہ تماشا

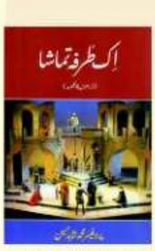

مصنف: پروفیسر محمد شاہد حسین
صفحات: 209، قیمت: 250 روپے، سنہ اشاعت: 2020
ناشر: مرکزی پبلی کیشنز، نئی دہلی
مبصر: ڈاکٹر عبدالرزاق زیادی
مکان نمبر 372 گلی نمبر 14 غفار منزل، نئی دہلی 25

درس وتدریس اور علمی وادبی حلقے میں پروفیسر محمد شاہد حسین کا نام خاصا معروف و مشہور ہے۔ذرائع ابلاغ اور ڈرامے کی تحقیق وتنقید کے حوالے سے جن ناقدین و مصنفین کا ذکر ہوتا ہے ان میں ایک بڑا نام ان کا بھی ہے۔شاہد حسین صاحب جواہر لعل نہرو یونیورسٹی سے ایک عرصے تک وابستہ رہے اور یہیں کم وبیش 30 سال تک اپنی تدریسی خدمات انجام دیں۔صرف ڈرامے پر ان کی نصف درجن سے زیادہ کتابیں منظر عام پر آچکی ہیں۔

'اِک طُرفہ تماشا' پروفیسر محمد شاہد حسین کے ان ڈراموں کا مجموعہ ہے جو گزشتہ کئی برسوں کے درمیان لکھے گئے۔کتاب میں کل چار ڈرامے اِک طُرفہ تماشا، یہ انتظار کی گھڑیاں، آئینہ در آئینہ اور بٹیر کی واپسی شامل ہیں۔ان میں بعض تو وہ ڈرامے ہیں جو مختلف مواقع پر آل انڈیا ریڈیو سے نشر بھی ہو چکے ہیں اور بعض وہ بھی ہیں جو انھوں نے طالب علمی کے زمانے میں ہی لکھے تھے یا پھر جن کا خاکہ و مواد ان کے ذہن میں بہت پہلے سے ہی تھا۔ان ڈراموں میں سے تین سنجیدہ ڈرامے ہیں اور ایک مزاحیہ قسم کا مگر ان تمام میں مختلف کرداروں کی مدد سے انھوں نے ان واقعات وحوادث کو بڑی خوبصورتی اور فن کاری کے ساتھ پیش کردیے ہیں جو ان کے مشاہدات و تجربات کا حصہ تھے۔ان ڈراموں کے علاوہ کتاب میں 'داستان اندرسبھا' کے عنوان سے ایک تحریر بھی شامل ہے جس کا مقصد قارئین کو اس ڈرامے سے واقفیت بہم پہچانا ہے بلکہ بقول خود مصنف کہ ''یہ بنیادی طور پر 'اندرسبھا امانت' کی تلخیص ہے جسے داستانوی انداز میں پیش کی گیا ہے۔کو کہ اندرسبھا اردو و اعلیٰ تعلیم کے تمام نصابات میں شامل ہے پھر بھی اس کے متن کو لوگ فراموش کرتے جارہے ہیں۔ہوسکتا ہے اس طرح تجدید متن ہوجائے۔''

پروفیسر محمد شاہد حسین نے اپنے ان ڈراموں میں جن معاملات ومسائل کو موضوع بنایا ہے وہ نہ صرف حد درجہ اہم ہیں بلکہ ان پر قلم اٹھانا اور ڈرامے کا جامہ پہنانا ایک ڈراما شناس کا ہی حصہ ہوسکتا ہے۔ان ڈراموں کو لکھتے وقت پروفیسر شاہد حسین ڈرامے کے فن کو بھی بڑی چابکدستی سے بروئے کار لائے اور اس میں ایک جدت پیدا کرنے کی کوشش کی ہے بلکہ یہ ڈرامے موجودہ عہد، اس کے اسٹیج اور اس کی ضروریات کو مدنظر رکھتے ہوئے لکھے ہیں۔عام طور پر ڈراما نگاری کی جزئیات مثلاً ناظرین کی نفسیات اور ان کی پسند و ناپسند کو سامنے رکھتے ہوئے ڈرامے تخلیق کرنا ایک بہت ہی مشکل فن تصور کیا جاتا ہے مگر پروفیسر محمد شاہد حسین کا یہ کمال ہے کہ ان ڈراموں میں انھوں نے ان کو برتنے کی بھرپور کوشش کی ہے۔نیز ان ڈراموں میں انھوں نے جس زبان کا استعمال کیا ہے وہ ڈرامے کے لیے حد درجہ موزوں ومناسب زبان ہے۔یقیناً اسے بھی ان کے ڈرامے کے فن سے واقفیت یا پھر اس کے دشت کی سیاحی کا نتیجہ ہی کہا جاسکتا ہے۔

زیر نظر کتاب 'اِک طُرفہ تماشا' نہ صرف اردو ڈرامے کی تاریخ میں ایک اضافے کی حیثیت رکھتی ہے بلکہ اس کے مطالعے سے اس بات کا اندازہ لگانا قدرے مشکل نہیں کہ ابھی اردو ڈرامے کا کیا منظرنامہ ہے اور کس قسم کے ڈرامے لکھے جارہے ہیں۔طباعت کے اعتبار سے یہ کتاب حد درجہ دلکش اور دیدہ زیب ہے۔کتاب میں جہاں پروف اور املے کی غلطیاں نہ کے برابر دیکھنے کو ملتی ہیں وہیں اس میں طباعت کے لیے اعلیٰ درجے کے کاغذ کا بھی استعمال ہوا ہے۔سرورق پر لگی ہوئی تصویر جہاں ڈراما کرتے ہوئے ایک سین سے واقفیت بہم پہنچاتی ہے وہیں یہ قاری کو اس کتاب کے مطالعے کی طرف مائل بھی کرتی ہے۔توقع ہے کہ اردو زبان وادب اور بالخصوص ڈرامے سے دلچسپی رکھنے والے احباب وقارئین نہ صرف پروفیسر محمد شاہد حسین کی اس کاوش کو قدر کی نظر سے دیکھیں گے بلکہ اسے ہاتھوں ہاتھ لے کر ان کی حوصلہ افزائی بھی فرمائیں گے۔

فکشن

بھروپ (افسانوی مجموعہ)

مصنف: سید آصف اختر نقوی
صفحات: 120، قیمت: 200 روپے، سنہ اشاعت: 2022
ناشر: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی
مبصر: احسن ایوبی، C-4/3، سرور اپارٹمنٹ، سرسید نگر، علی گڑھ 202001 (یوپی)

پروفیسر آصف اختر نقوی کا تعلق میوزیالوجی ڈپارٹمنٹ سے ہے۔زندگی کا ایک

بڑا حصہ انھوں نے علی گڑھ کے ادبی ماحول میں گزارا۔اسی کا اثر ہے کہ انھیں شعر و ادب سے خاطر خواہ دلچسپی ہے۔ان کا پہلا افسانوی مجموعہ 'نگر ڈگر' 1998 میں شائع ہوا تھا۔دو دہائیاں گزرنے کے بعد اب 2022 میں ان کا دوسرا مجموعہ 'بہروپ' شائع ہوا۔اس میں سولہ افسانے شامل ہیں۔افسانے لکھنا ان کا شوق نہیں بلکہ اپنے کرب اور اذیت میں دوسروں کو شریک کر کے غم ہلکا کرنے کا ذریعہ ہے انھوں نے پیش لفظ میں لکھا ہے کہ:

''آج کے غیر یقینی، خوف ناک، پریشان کن اور گھٹن کے ماحول میں تباہی کی طرف گامزن تیز رفتار گزرتی زندگی کی گاڑی کی کھڑکی سے دیکھے کچھ مناظر، ان کے تناظر اور سائے اس زبان کے رسم الخط میں پیش کرنا چاہتا ہوں جسے اردو کہتے ہیں۔ملک کے بہت سے لوگ اسے دیوناگری میں لکھ کر ہندی کہتے ہیں۔میں اپنے مشاہدات، احساسات، خدشات، خوف، مایوسی اور بے بسی کے سفر میں آپ سب کو شریک کرنا چاہتا ہوں۔''

مجموعہ پڑھ کر یہ محسوس ہوا کہ نظریات اور رجحانات سے موضوعات جنم نہیں لیتے بلکہ حالات اور مسائل سے رجحان کی تشکیل ہوتی ہے۔عموماً یہ کہا جاتا ہے کہ ترقی پسند تحریک کے زیر اثر سیاسی و سماجی موضوعات پر توجہ دی جانے لگی لیکن اگر یہ کہیں کہ فکری طور پر ترقی پسند ہوئے بغیر اپنے محسوسات کا اظہار ناممکن ہے تو بے جا نہ ہوگا۔اس حقیقت سے انکار اس لیے نہیں کیا جا سکتا کہ ترقی پسند تحریک سے پہلے لکھے گئے ادب کے موضوعات بھی کسی نہ طور سماج کے بطن سے ہی برآمد ہوئے تھے۔اسی طرح ترقی پسند تحریک کے بعد لکھا جانے والا ادب بھی سماج میں سانس لینے والے افراد کی ذات اور ان کے باطن سے ہی متعلق ہے۔لہٰذا یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ جب ادب کا مقصود ہمیشہ اور ہر زمانے میں انسان کی ذات، اس کے مسائل اور سماج ہی رہے ہیں تو رجحانات اور نظریات کی بنیاد پر اسے پرکھے جانے کا جواز کیا ہے۔کلی طور پر تشفی بخش تو نہیں، لیکن ایک جواب یہ ہوسکتا ہے کہ اسلوب اور فضا سازی ہی وہ عناصر ہیں جو مختلف زمانوں کے ادب کو ایک دوسرے سے ممتاز کرتے ہیں۔طبقاتی کشمکش، مقتدر طبقات کے رعب، حکمراں طبقہ اور سسٹم کی مطلق العنانی اور اقلیتوں پر مظالم جیسے موضوعات پر گذشتہ ایک صدی سے لکھا جا رہا ہے۔اس درمیان مختلف رجحانات اور نظریات تشکیل پائے اور اپنی اپنی بساط بھر ادیب اور قاری دونوں کو متاثر کیا اور گزرتے وقت کے ساتھ وہ تاثرات زائل ہوتے چلے گئے لیکن جو چیز باقی رہ گئی وہ ہے ادیب کی سماج اور فرد سے وابستگی۔اب یہ مصنف کے صوابدید پر ہے کہ وہ اپنے مشاہدات اور تجربات کس طرح بیان کرتا ہے اور پڑھنے والوں کو متوجہ کرتا ہے۔

آصف نقوی کے افسانے کسی تحریک، رجحان یا نظریے سے وابستگی پر اصرار کے بجائے سماج اور فرد کے مسائل سے متصادم ہیں۔انھوں نے گذشتہ پچاس ساٹھ برسوں سے بیان ہونے والے مسائل کو معاصر تناظر میں ایک نئے ڈھنگ سے پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ان کے افسانوں کا راوی زیرک اور حساس ہے۔اپنے اردگرد کے مسائل سے صرف نظر کرنا اس کے لیے ناممکن ہے۔اسی لیے بعض دفعہ وہ جذبات کی رو میں اس قدر بہہ جاتا ہے کہ حقائق کے بیان پر ابلاغ کا شائبہ ہونے لگتا ہے لیکن چند افسانے ایسے بھی ہیں جو اس بات کا احساس دلاتے ہیں کہ جب زمانے کی رفتار تیز ہو جائے تو ادیب و فنکار کے لیے ٹھہراو ضروری ہو جاتا ہے۔اس ضمن میں فریاد، اگلے جنم موہے کتا ہی رکھیو اور بہروپ قابل ذکر ہیں۔ان افسانوں میں زمانی ٹھہراو کے بعد ایک نیا تازہ تخلیقی انداز نظر آتا ہے۔فریاد میں بیان کی گئی سچویشن سے اندازہ ہوتا ہے کہ مشتعل حالات کے اثرات زائل ہونے کے بعد جب صرف دل اور دماغ میں اٹھنے والی ٹیس باقی رہ جاتی ہے تو اس کا اظہار زیادہ موثر ہوتا ہے۔اس مجموعے میں شامل افسانوں کا جائے وقوع گرچہ بہت مانوس اور جانا پہچانا ہے لیکن اس شناسائی میں ایک ایسی اجنبیت ہے جو قاری کو اکساتی ہے کہ وہ مکمل عرفان حاصل کرے۔صارفیت اور شہری زندگی کی بے سکونی، سرکاری محکموں میں کرپشن، خودغرضی، لالچ، سیاسی بربریت وغیرہ آصف نقوی کے افسانوں کے غالب موضوع ہیں۔ان موضوعات کو برتنے کے لیے انھوں نے جو طریقہ کار اختیار کیا ہے اس میں جزئیات نگاری اہم ہے۔راوی کی باریک بیں نگاہیں معمولی اور عام لوگوں کو محسوس نہ ہونے والے مسائل کو بڑی مشاقی سے گرفت میں لے لیتی ہیں اور اسی سے آصف نقوی کا انفراد اور اختصاص قائم ہوتا ہے۔

امید ہے کہ ادبی حلقوں میں اس مجموعے کی خاطر خواہ پذیرائی ہوگی۔

اور بھی غم ھیں

مصنف: نذیر جوہر

صفحات: 368، قیمت: 450 روپے، سنہ اشاعت: 2021

مبصر: عظمت النساء، ریسرچ اسکالر، جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی 25

دور حاضر کے مشہور و معروف افسانہ نگاروں کی فہرست میں ایک نام نذیر جوہر کا بھی ہے۔نذیر جوہر کا تعلق جموں و کشمیر سے ہے۔انھوں نے اپنے ادبی سفر کا آغاز ناول نگاری سے کیا۔ان کا پہلا ناول 'یہ نہ تھی ہماری قسمت' اور دوسرا 'مہرباں کیسے کیسے' منظر عام پر آئے۔اس کے بعد انھوں نے کہانیاں اور افسانے لکھنے شروع کیے۔انھوں نے اپنے بھائی کی سوانح عمری 'زندگی یوں تمام ہوتی ہے' کے عنوان سے لکھی جو 2008 میں شائع ہوئی۔علاوہ ازیں ان کی سرگزشت 'باتیں ہیں باتوں کا کیا' منظر عام پر آچکی ہے۔

زیر مطالعہ کتاب 'اور بھی غم ہیں' نذیر جوہر کے افسانوں کا مجموعہ ہے، جو 2021 میں شائع ہوا۔اس کتاب میں سینتالیس افسانے شامل ہیں۔نذیر جوہر کے یہ افسانے حقیقت کے بہت قریب ہیں۔ان میں بدلتے حالات اور ہمارے آس پاس کے مسائل کی بھرپور عکاسی ملتی ہے۔انھوں نے اپنے افسانوں میں زیادہ تر سیاسی، سماجی، معاشی اور اخلاقی مسائل کو جگہ دی ہے۔ان کی کہانیوں میں سنجیدگی، درد و غم اور زمانے کے ظلم و جبر دیکھنے کو ملتے ہیں۔نذیر جوہر خود اس کتاب میں اس حوالے سے لکھتے ہیں کہ:

''ہمارے سماج کے تانوں بانوں میں کچھ ایسے بھی غم ہیں جو فطری بھی ہیں اور غیر فطری بھی۔جو ہمیں گھیر ہی لیتے ہیں اور غم و اندوہ، تکالیف و مصائب سے ہمکنار کرتے ہیں۔یہاں جور و جبر، ظلم و ستم اور مکر و فریب کا بنا ہوا جال ہے کہ کم و بیش ہر کس و ناکس پھنس ہی جاتا ہے۔پھر جو اضطراری کیفیت پیدا ہو جاتی ہے تو سارا تانا بانا بکھر جاتا ہے اور رنج و غم کی وہ فضا قائم ہوتی ہے کہ چہار سو درد و کرب چھلکتا ہے اور آہوں اور سسکیوں کا ماحول و منظر قائم ہوتا ہے۔مگر سماج تو سماج ہے بڑی خندہ پیشانی سے غم و اندوہ کے لمحات کو سہنے کی سعی کرتا ہے، افتاں و خیزاں آگے بڑھنے کی تگ و دو میں لگا رہتا ہے اور مسرت و شادمانی کے نئے سامان پیدا کر دیتا ہے۔ناکامیوں، محرومیوں کو پرے کرتا ہوا آگے نکلنے کی جستجو کرتا ہے اور قہقہے لگانا سیکھ جاتا ہے'' (ص، 23)

مصنف نے اپنے ان افسانوں میں ماؤں، بچیوں، بیٹیوں اور بہوؤں پر زمانے کی زیادتی اور ظلم و ستم کو خاصا اجاگر کیا ہے۔مثلاً 'اور بھی غم ہیں' افسانے میں انھوں نے جہیز جیسے اہم سماجی مسئلے کو موضوع بنایا ہے، نذیر جوہر نے اس افسانے میں بتانے کی کوشش کی ہے کہ کس طرح بے قصور اور معصوم بیٹیوں کی زندگیاں جہیز کے سبب برباد ہوتی ہیں اور کس طرح ان کی عزت نفس کو کچلا جاتا ہے۔مثلاً:

’’بیٹی— میرے پاس اب تمہیں دینے کے لیے کچھ بھی نہیں ہے، سوائے اس کفن کے ایک مجبور بے بس اور لاچار باپ کے یہ الفاظ رخسار پر بم کی طرح گر پڑے۔ ایسا لگا جیسے کسی نے پگھلا ہوا گرم سیسہ اس کے کانوں میں اتار دیا ہو۔ ایک ساتھ جیسے کئی بم پھٹے ہوں۔ زمین ہل گئی ہو اور ساتوں آسمان اس پر ٹوٹ پڑے ہوں‘‘

’ماں ہوں نا... ‘ ’ماں‘ اور ’کوئی ہمیں رلائے کیوں‘ افسانوں میں ایک ماں کی بے بسی، لاچاری، بیٹے سے دور رہنے کی تڑپ اور غریبی کو پیش کیا ہے۔ ’اپنے پرائے‘ افسانہ میں بیٹیوں کی عزت کا سودا کرنا ’میرا کیا قصور‘ میں بیٹی کے پیدا ہونے پر ماں کی قربانی، بزدلی اور ایک بے گناہ نوزائیدہ بچی کی آہ وزاری جبکہ ’ایک تھی زمرد‘ میں بیٹیوں کے پیدا ہونے پر لاڈ پیار میں پلی باپ کی پڑھی لکھی بیٹی اور بہو پر سسرال کے ظلم و زیادتی کی داستان بیان کی گئی ہے۔ اس کے علاوہ ’دادا جی، عظمیٰ، ہم پاگل ہیں کیا، میں گمشدہ ہوں، کچھ تو باقی ہے، چوڑیاں پہن لو‘ بختاوری اور کسی کا دم نکلتا ہے جیسے شاہکار افسانے شامل ہیں جن کو پڑھ کر نذیر جوہر کے وسیع مشاہدات و تجربات اور ان کی فنی صلاحیتوں کا بخوبی اندازہ ہوتا ہے۔

نذیر جوہر نے ان افسانوں میں سادہ و سلیس زبان کا استعمال کیا ہے۔ ان افسانوں کا پلاٹ سپاٹ ہے۔ یہ کتاب پروف اور ٹائپنگ کی خامیوں سے پاک ہے اور طباعت و جلد بندی بھی عمدہ ہے۔ شروع میں نور شاہ کا پیش لفظ اور ’نذیر جوہر کا تخلیقی جوہر‘ کے عنوان سے غلام نبی کمار کا ایک مختصر مضمون بھی شامل ہے۔ امید ہے کہ یہ کتاب ادبی حلقوں میں قدر و منزلت کی نگاہ سے دیکھی جائے گی۔

شاعری

جھیل آکاش پرندہ

شاعر: منیر سیفی

صفحات: 160، قیمت: 280 روپے، سنہ اشاعت: 2022

ناشر: امان اللہ، سمن پورا، ملک لین، پٹنہ 14

مبصر: خالد عبادی، معرفت بک امپوریم، سبزی باغ، پٹنہ

1970 کے بعد نمایاں ہونے والے شاعروں میں منیر سیفی ایک جداگانہ شناخت رکھتے ہیں۔ میرے پیش نظر ان کا تازہ شعری مجموعہ ’جھیل آکاش پرندہ‘ ہے۔ اس سے پہلے ان کے تین شعری مجموعے (1) اجنبی صدا (2) دعا کا شجر...... اور (3) پھول خوشبو ہوا، شائع ہو چکے ہیں۔ نثر میں بھی ان کی دو کتابیں ’دیدۂ عبرت نگاہ‘ (اسفار) اور ’گفتگو کتابوں سے‘ اشاعت پذیر ہو کر مقبول ہو چکی ہیں۔ وہ علم العروض پر بھی ماہرانہ دسترس رکھتے ہیں۔ تاریخی قطعہ گوئی ان کا ایک اضافی امتیاز ہے۔ شعر کہتے وقت وہ آورد کو نہیں آمد کو ترجیح دیتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے یہاں ہندی اور انگریزی کے الفاظ بھی شعری استعمالات کا فطری حصہ ہیں۔

پنکھ پکھیرو سب بے گھر ہو جائیں گے   پیڑوں پر جب ظلم ہوا کا ٹوٹے گا
اُگ آئے کیکٹس اس کے دماغ میں کیسے   جو دوسروں کے لیے خود کو ڈھول کرتا رہا
جسم بھی بے ردم ہوتا جارہا ہے   سانس بے سرتال ہوتی جارہی ہے
شہر میں تو کہیں نہیں ملتی   اپنے گاؤں میں جو اُدارتا ہے
مشینی عہد میں فرصت کسے ہے   کہیں پر تم کہیں پر ہم نہ ہوں گے
دن دیوتا سمان مجھے پوجتا رہا   آوارہ رات دشمن ایمان ہوگئی

وقت و حالات کے مطابق شعری زبان میں تبدیلی عموماً پڑھنے والوں کو متاثر کرتی ہے۔ ساتھ ہی تازگی و آزادگی کا بھی احساس دلاتی ہے۔

کتاب میں ڈاکٹر تاج پیامی کی ایک تقریظ (منیر سیفی کی غزلیہ شاعری) کے عنوان سے کتاب کے آغاز میں موجود ہے۔ جس کی بابت منیر سیفی نے اپنے نوٹ میں وضاحت کردی ہے کہ ’’تاج پیامی نے مضمون بہت پہلے لکھا تھا۔ کتاب کی اشاعت میں تاخیر ہوئی۔‘‘ تو اس مضمون میں تاج پیامی ایک جگہ لکھتے ہیں: ’’میر تقی میر اور ناصر کاظمی کو پڑھنا چاہتے ہیں تو اس عہد میں منیر سیفی کو پڑھیے۔‘‘ میں یقین کے ساتھ نہیں کہہ سکتا کہ پروفیسر صاحب (تاج پیامی) نے میر تقی میر یا ناصر کاظمی کو واقعی پڑھا بھی تھا یا نہیں یا اگر پڑھا تھا تو کتنا سمجھا تھا؟ خیر یہ ایک جملہ معترضہ تھا۔ ہاں اتنی بات ضرور ہے کہ منیر سیفی نے اساتذہ کو ضرور پڑھا ہوگا۔ ورنہ ان کے یہاں اس نوع کے اشعار نظر نہیں آتے۔

کیا زمانہ تھا کہ اک چکّر تھا اپنے پاؤں میں   اب تو چلنا ہے گراں دیوار سے دیوار تک
رنگ پھیکا ہے گلوں کا تیرے رخ کے سامنے   رو بہ رو مدھم ہے تیرے مہر شعلہ بار تک
سمٹ آئی ہے وسعت چند قطروں میں سمندر کی   جو دونوں وقت صحرا میں گلے مل کر سلگتے ہیں
قدموں تلے فلک ہے نہ سر پر زمین ہے   آئینۂ غبار مرا ہم نشین ہے
قفس تنگ میں اب سر بھی اُٹھانا ہے محال   موسم گل میں مری بے پر وبالی دیکھو
اس نے بھی بند کردیا دروازۂ گماں   بجھنے لگا یقیں بھی شب اعتبار کا
مجھ سے سرزد کبھی ہوئیں جو نہیں   میں ہوں کشتہ انہی خطاؤں کا

اس طرح کے اشعار سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ ایک باشعور اور قادرالکلام شاعر ہیں۔

ان کے یہاں ’عصری حسیت‘ سے مملو اشعار بھی بڑی تعداد میں موجود ہیں۔ خوشی ہوتی ہے کہ موضوعات خواہ جس قسم کے بھی ہوں وہ ’مقررہ معیار‘ سے ایک لمحے کے لیے بھی غافل نہیں ہوتے۔

کتاب کے آغاز میں تین حمدیہ قطعات، ایک نعت، ’یا رسول اللہ‘ کے عنوان سے اپنی بے کسی اور زبوں حالی کا بیان اور ’کربلا‘ کے عنوان صاحبان کربلا کو خراج عقیدت پیش کیا گیا ہے۔ غزلوں کے بعد چند نظموں کو جگہ دی گئی ہے۔ جن کی کل تعداد 16 ہے۔ کچھ نظمیں آزاد اور کچھ نثری ہیں۔ آخر کی دو طویل نظموں ’لہو کی داستان‘ اور ’داستان سالہائے گزشتہ‘ (سال 22-2019) کو چھوڑ دیں تو بقیہ نظمیں قدرے بہتر تأثر کی حامل قرار پائیں گی۔ کتاب کا ٹائٹل نہ صرف خوبصورت ہے بلکہ کتاب کے نام ’جھیل آکاش پرندہ‘ سے گہری وابستگی اور مطابقت رکھتا ہے۔

پہلی تخلیق پہلا تاثر

کسی بھی رسالے میں جب آپ کی تخلیق شائع ہوتی ہے تو آپ کو بے انتہا مسرت کے ساتھ ایک نئی تحریک بھی ملتی ہے۔ ماہنامہ ’اردو دنیا‘ میں جب آپ کی تخلیق پہلی بار شائع ہوئی تو آپ کو کیسا محسوس ہوا؟ آپ اپنے خیالات لکھ کر ہمیں بھیجیں اور یہ بھی ضرور لکھیں کہ آپ کی ذہنی اور تحریری تربیت میں ادبی رسائل کتنا اہم کردار ادا کرتے ہیں۔ ذرا سوچیے! اگر یہ رسالے نہ ہوتے تو...؟

ماہنامہ 'اردو دنیا' کے 'خبرنامہ' میں پوری اردو دنیا بالخصوص ہندوستان کی ادبی، علمی، ثقافتی سرگرمیوں کی خبریں شائع کی جاتی ہیں۔ یہ محض خبریں نہیں ہیں بلکہ ان کی حیثیت دستاویزی اور حوالہ جاتی ہے۔ ان خبروں سے ہمارے ادبی وثقافتی تحرک اور تنوع کا بھی اندازہ لگایا جاسکتا ہے اور اردو زبان وادب کی سمت ورفتار کا بھی۔

یہ خبرنامہ ہندوستان بھر سے شائع ہونے والے مختلف اردو اخبارات کے تراشوں سے ترتیب دیا جاتا ہے۔ اس کے باوجود بہت ساری ریاستوں اور اضلاع سے خبریں ہمیں نہیں مل پاتی ہیں، اس لیے ادبی ثقافتی تقریبات کے منتظمین سے گزارش ہے کہ اہم ادبی ثقافتی تقریبات اور علمی ادبی شخصیات کی وفات کے تعلق سے خبریں براہِ راست درج ذیل ای میل urduduniyancpul@yahoo.co.in, editor@ncpul.in پر بھجوانے کی زحمت فرمائیں۔

قومی اردو کونسل کی سرگرمیاں

قومی اردو کونسل میں معروف شاعر قاسم امام کے اعزاز میں استقبالیہ تقریب

نئی دھلی: ممبئی کے مشہور شاعر قاسم امام کی آمد پر قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے صدر دفتر میں ایک تقریب کا انعقاد کیا گیا۔ اس موقعے پر موقر مہمان کا استقبال کرتے ہوئے کونسل کے ڈائرکٹر پروفیسر شیخ عقیل احمد نے ان کا تعارف کروایا اور کہا کہ قاسم امام صاحب طویل عرصے تک اردو زبان وادب کی تدریس سے وابستہ رہے، ساتھ

ہی ممبئی اور مہاراشٹر کی سطح پر فروغ اردو کی سرگرمیوں میں اہم کردار ادا کرتے رہے ہیں۔ انھوں نے کہا کہ قاسم امام کی ایک خاص شناخت ان کی شاعری کے حوالے سے بھی ہے، وہ ایک باکمال شاعر ہیں اور ملک و بیرون ملک ان کی شاعری پسند کی جاتی ہے اور انھیں مشاعروں میں سامعین بصد ذوق وشوق سماعت کرتے ہیں۔ ہم قومی اردو کونسل میں ان کا تہہ دل سے استقبال کرتے ہیں۔ قاسم امام نے اپنے تاثرات کا اظہار کرتے ہوئے قومی اردو کونسل سے اپنی قدیم وابستگی کا اظہار کیا اور ڈائرکٹر پروفیسر شیخ عقیل احمد کا خصوصی شکریہ ادا کیا۔ انھوں نے ممبئی اور مہاراشٹر کی اردو سرگرمیوں پر بھی مختصر روشنی ڈالی اور کہا کہ ممبئی ماضی میں بھی بہت سی اردو تحریکوں کا مرکز رہا ہے اور درجنوں اردو ادیب، شاعر، افسانہ نگار اور تخلیق کار و ناقدین کا تعلق اس شہر سے رہا یا انھوں نے ملک کے مختلف خطوں سے وہاں پہنچ کر ممبئی کو اپنی سرگرمیوں کا مرکز بنایا، آج بھی ممبئی میں اردو زبان وادب کی آبیاری کا سلسلہ جاری ہے، میں بھی اردو کا مدرس رہا ہوں اور شعر و شاعری کے سلسلے سے ملک کے مختلف شہروں کا سفر ہوتا رہتا ہے، مگر قومی اردو کونسل میں آکر مجھے قلبی مسرت ہوئی ہے، یہ ادارہ پورے ملک میں اردو زبان کے فروغ کے لیے پوری سنجیدگی سے کام کر رہا ہے، جس کے لیے کونسل کا تمام عملہ اور پروفیسر شیخ عقیل احمد صاحب مبارکباد کے مستحق ہیں۔ اس موقعے پر ایک شعری محفل بھی منعقد ہوئی، جس میں جناب قاسم امام نے اپنے منتخب اشعار سنائے، سامعین نے انھیں شوق وذوق سے سنا اور بھرپور پذیرائی کی۔ ان کے علاوہ ڈاکٹر عبدالرشید اعظمی، منیر انجم اور آبگینہ عارف نے بھی اپنی منتخب غزلوں اور نظموں سے سامعین کو محظوظ کیا۔ معروف ادیب حقانی القاسمی کے اظہار تشکر پر محفل برخاست ہوئی۔ اس موقعے پر کونسل کا اسٹاف موجود رہا۔

پریس ریلیز، رابطۂ عامہ سیل، قومی اردو کونسل، 19 دسمبر 2022

اردو اسپیکنگ یونین، ماریشس کے جنرل سکریٹری محمد علی توفیق کو استقبالیہ

نئی دهلی : قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے صدر دفتر میں ماریشس کی اردو اسپیکنگ یونین کے جنرل سکریٹری محمد علی توفیق کو استقبالیہ پیش کیا گیا۔کونسل کے ڈائرکٹر پروفیسر شیخ عقیل احمد نے معزز مہمان کا استقبال کرتے ہوئے کہا کہ ماریشس میں بہت بڑی آبادی اردو بولنے والوں کی ہے جو نہ صرف اس زبان کو مضبوطی سے تھامے ہوئے ہے، بلکہ وہ اس زبان میں تعلیم بھی حاصل کر رہی ہے۔ وہاں کی تہذیب وثقافت میں ہندوستانیت رچی ہوئی ہے۔محمد علی صاحب وہاں فروغ اردو کے لیے قائم ادارے اردو اسپیکنگ یونین کے جنرل سکریٹری ہیں اور سماجی سرگرمیوں میں بھی حصہ لیتے رہتے ہیں۔

مہمان موصوف نے اپنے تاثرات میں کونسل اور پروفیسر شیخ عقیل احمد کا شکریہ ادا کرتے ہوئے یونین کی سرگرمیوں کے بارے میں بتایا اور کہا کہ یہ گزشتہ بیس سال سے قائم ہے، جس کے تحت مختلف علمی وثقافتی سرگرمیاں انجام دی جاتی ہیں، ماضی میں قومی کونسل کے زیر اہتمام متعدد ورکشاپ ہوئے ہیں جن میں ہم نے حصہ لیا ہے۔ہم لوگ وہاں کے اسکولوں اور مدرسوں کے نصاب میں اردو کی شمولیت پر کام کر رہے ہیں۔ یونین کے ذریعے مختلف ثقافتی سرگرمیوں جیسے ڈراما اور مشاعرہ وغیرہ کا بھی اہتمام کیا جاتا ہے۔انھوں نے کہا کہ ماریشس میں فروغ اردو کے لیے مزید کام کرنے کی ضرورت ہے اور ہمیں توقع ہے کہ کونسل اس سلسلے میں اپنے تجربات اور وسائل کے ذریعے ہمارا تعاون کرے گی۔ شیخ عقیل نے انھیں یقین دلایا کہ کونسل اپنے اختیارات کے دائرے میں رہتے ہوئے ماریشس میں فروغ اردو کے لیے ہر ممکن اقدام کرے گی۔

اس موقعے پر پروفیسر انور پاشا نے بھی اظہار خیال کیا اور ماریشس میں اردو زبان کی ترویج وترقی کے امکانات کی نشان دہی کی۔ اس استقبالیہ تقریب میں کونسل کا تمام عملہ شریک رہا۔

پریس ریلیز، رابطۂ عامہ سیل، قومی اردو کونسل، 16 جنوری 2023

شموئل احمد کی وفات اردو فکشن کا بڑا نقصان: پروفیسر شیخ عقیل احمد

نئی دهلی: ممتاز فکشن نگار شموئل احمد کی وفات کو اردو فکشن اور مجموعی طور پر اردو زبان و ادب کا بڑا نقصان قرار دیتے ہوئے قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے ڈائرکٹر پروفیسر شیخ عقیل احمد نے اپنے تعزیتی بیان میں کہا ہے کہ شموئل احمد جیسے بے باک اور دلچسپ افسانہ نگار کی رحلت سے مجھے ذاتی طور پر شدید رنج ہوا ہے، کیوں کہ ہمارے ان سے ذاتی تعلقات تھے۔ وہ ایک عمدہ تخلیق کار ہونے کے علاوہ بہت محبت کرنے والے انسان بھی تھے۔ شیخ عقیل نے کہا کہ شموئل احمد اپنے تخلیقی اسلوب کے انفراد، تیکھے اور دو ٹوک اندازِ بیان اور دلچسپ موضوعات کی وجہ سے ہم عصروں میں الگ پہچان رکھتے تھے۔انھوں نے خصوصاً جنسی نفسیات کو اپنی کہانیوں میں بڑی خوبی سے سمویا اور ساتھ ہی عصری مسائل کو بھی اپنی تخلیقات میں اجاگر کرتے رہے۔ انھوں نے کہا کہ جس زمانے میں شموئل احمد نے افسانہ نگاری کا آغاز کیا، وہ جدیدیت کے غلغلے کا عہد تھا اور بہت سے نئے فن کار اس کے زیر اثر علامتی وتجریدی افسانے لکھ رہے تھے، لیکن شموئل احمد نے کسی بھی رجحان کو قبول کرنے کے بجائے اپنی الگ راہ نکالی اور دیکھتے ہی دیکھتے ادبی دنیا پر چھا گئے۔ شیخ عقیل نے کہا کہ شموئل احمد نے بعض علامتی کہانیاں بھی لکھی ہیں، مگر ان کی اصل خصوصیت ان افسانوں میں مضمر ہے، جن میں انھوں نے براہِ راست کسی سماجی، ثقافتی یا سیاسی موضوع پر اپنی تخلیقی جولانیوں کا مظاہرہ کیا ہے۔ انھوں نے کہا کہ وہ علمِ نجوم کے بھی ماہر تھے، جس کا فائدہ انھوں نے اپنی افسانہ نگاری میں بھی اٹھایا اور ان کی متعدد کہانیوں میں اس کے مختلف رنگ نظر آتے ہیں۔

پریس ریلیز، رابطۂ عامہ سیل، قومی اردو کونسل، 27 دسمبر 2022

اردو اور تعلیم سے متعلق قومی اور علاقائی خبریں

قومی

بین الاقوامی غالب تقریبات کا انعقاد

نئی دھلی: غالب انسٹی ٹیوٹ کے زیر اہتمام سالانہ بین الاقوامی غالب تقریبات کا افتتاح 16 دسمبر کو نہایت

ہی تزک و احتشام کے ساتھ ایوان غالب میں عمل میں آیا۔ ان تقریبات کے تحت سہ روزہ بین الاقوامی سمینار بعنوان 'ہوتا ہے شب روز تماشا مرے آگے'، شام غزل، عالمی مشاعرہ اور داستان سرائی کا اہتمام کیا گیا۔ سمینار کا افتتاح کرتے ہوئے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے وائس چانسلر پروفیسر طارق منصور نے کہا کہ اردو صرف بولنے سے نہیں آتی ہے بلکہ آپ کو اردو لکھنی اور پڑھنی بھی آنی چاہئے۔ ہمیں اپنے زبان کی تعلیم دینے کے لیے کسی انتظامیہ اور حکومت پر منحصر نہیں رہنا چاہیے۔ اس اجلاس کی صدارت انگریزی کے معروف دانشور پروفیسر ہریش ترویدی نے کی۔ انھوں نے کہا کہ ہم غالب کو اسکول کے زمانے سے پڑھتے چلے آئے ہیں۔ غالب اردو اور ہندی سمیت متعدد زبانوں کے شاعر ہیں۔ انھوں نے غالب کا موازنہ اہم مغربی شعرا سے کیا۔

سابق چیف الیکشن کمشنر ایس وائی قریشی نے اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ غالب ایک شاعر تھے یا فلسفی۔ ان کا بغور مطالعہ کیا جائے تو ظاہر ہوتا ہے کہ وہ بنیادی طور پر فلسفی تھے۔ سمینار کا کلیدی خطبہ غالب انسٹی ٹیوٹ کے سکریٹری پروفیسر صدیق الرحمٰن قدوائی نے پیش کیا۔ اس موقعے پر انھوں نے کہا کہ غالب کی شاعری کا جب ذکر آتا ہے تو یہی سوال اٹھتا ہے کہ وہ وجود میں آنے اور وقت گزرنے کے بعد زندہ کیوں ہے اور اس کی زندگی میں اضافہ کیوں ہوتا جاتا ہے۔ ان کے بہت سارے اشعار جنھیں خود انھوں نے یا ان کے معتقدین نے کبھی دیوانِ غالب سے نکال دیا تھا وہ اچانک کسی مخطوطے یا مسودے کے ساتھ نئے سرے سے وارد ہوتے ہیں تو وہ اچانک چونکا دیتے ہیں۔

اس موقعے پر ادبی دنیا میں نمایاں خدمات انجام دینے کے لیے 6 شخصیات کی خدمت میں غالب انعامات پیش کیے گئے جن میں: پروفیسر قدوس جاوید 'برائے اردو تحقیق وتنقید'، پروفیسر سید احسن الظفر 'برائے فارسی تحقیق و تنقید'، پروفیسر ابن کنول 'برائے اردو نثر'، ڈاکٹر بشیر بدر کو 'برائے اردو شاعری'، جناب محمود فاروقی 'برائے اردو ڈرامہ'، پروفیسر سید ظل الرحمٰن 'برائے مجموعی خدمات' کے نام شامل ہیں۔ اس موقع پر غالب انسٹی ٹیوٹ کی نئی مطبوعات، دیوان غالب پنجابی، معاصر اردو ادب میں نئے تخلیقی رویے مرتبہ پروفیسر صدیق الرحمٰن قدوائی، غالب اور عالمی انسانی قدریں مرتبہ ڈاکٹر ادریس احمد، غالب کا خود منتخب کردہ فارسی کلام اور اس کا طالب علمانہ مطالعہ، مصنفہ جناب بیدار بخت، غالب: دنیائے معانی کا مطالعہ مصنفہ پروفیسر انیس اشفاق، گم شدہ معنی کی تلاش، مصنفہ پروفیسر سرور الہدیٰ، غالب نامہ کے دو شمارے، ڈائری کلنڈر کی رسم رونمائی بھی عمل میں آئی۔

افتتاحی اجلاس کے اختتام پر اظہار تشکر ادا کرتے ہوئے غالب انسٹی ٹیوٹ کے ڈائرکٹر ڈاکٹر ادریس احمد نے کہا کہ غالب انسٹی ٹیوٹ کی بین الاقوامی غالب تقریبات محض رسمی نہیں ہوتیں بلکہ ہم نے پورے سال کیا کیا اس کی ایک رپورٹ بھی ہوتی ہے، یہ رپورٹ کتابوں کی رونمائی کی شکل میں پیش کی جاتی ہے۔ افتتاحی اجلاس کے بعد شام غزل کا اہتمام کیا گیا، جس میں معروف غزل سنگر محترمہ رشمی اگروال نے غزل پیش کی۔

غالب تقریبات کے دوسرے دن 17 دسمبر کو بین الاقوامی غالب سمینار بعنوان 'ہوتا ہے شب و روز تماشا مرے آگے' کے تکنیکی اجلاس صبح دس بجے سے شام پانچ بجے تک ہوئے۔ سمینار کے پہلے اجلاس کی صدارت دہلی یونیورسٹی کے استاذ پروفیسر محمد کاظم نے کی جب کہ نظامت کے فرائض ڈاکٹر جاوید عالم نے انجام دیے۔ پروفیسر سید احسن الظفر، ڈاکٹر فاضل احسن ہاشمی اور ڈاکٹر نوشاد منظر نے مقالات پیش کیے۔ جب کہ بنگلہ دیش سے تشریف لائے ڈاکٹر پولاک دیوناگ نے بنگلہ دیش میں اردو اور غالب کے تعلق سے اظہار خیال کیا۔ دوسرے سیشن میں کل چار مقالات پیش کیے گئے۔ اس اجلاس کی صدارت جواہر لال نہرو یونیورسٹی کے استاذ پروفیسر انور پاشا اور دہلی یونیورسٹی کے سابق ڈین اور سابق صدر شعبہ اردو پروفیسر ارتضیٰ کریم نے کی۔ جب کہ نظامت کے فرائض محترمہ سعدیہ صدیقی نے انجام دیے۔ اس اجلاس میں پروفیسر محمد زماں آزردہ، ڈاکٹر شمس بدایونی، ڈاکٹر خالد علوی اور پروفیسر سرور الہدیٰ نے مقالات پیش کیے۔ تیسرا اجلاس آن لائن منعقد ہوا۔ جس کی صدارت جناب نوید مسعود نے کی جب کہ ڈاکٹر شعیب رضا خان وارثی نے نظامت کے فرائض انجام دیے۔ پروفیسر تحسین فراقی، پروفیسر نجیبہ عارف، ڈاکٹر نوید عباس اور ڈاکٹر جاوید رحمانی نے مقالات پیش کیے۔ اس دن کے آخری اجلاس کی صدارت کے فرائض پروفیسر زماں آزردہ نے انجام دیے جب کہ نظامت صہیب اظہار نے کی۔ پروفیسر عتیق اللہ، پروفیسر قاضی جمال حسین اور پروفیسر نسیم احمد نے اپنے پر مغز مقالات پیش کیے۔ مقالات کے اجلاس کے بعد عالمی مشاعرے کا انعقاد عمل میں آیا۔ مشاعرے کی صدارت ڈاکٹر ایس فاروق نے کی جب کہ نظامت کے فرائض ڈاکٹر ماجد دیوبندی نے انجام دیے۔ اس موقع پر بطور مہمان خصوصی جناب جاوید کاکرو (لندن) نے شرکت کی۔ مدعو شعرائے کرام میں اظہر عنایتی، حسن کاظمی، شکیل اعظمی، حنا تیموری، سہیل لکھنوی، میکش امروہوی، سریندر شجر، سلیم شیرازی، جاوید مشیری، ماجد دیوبندی، ملک زادہ جاوید، سلیم امروہوی،

معین شاداب، صہیب احمد فاروقی نے اپنا کلام پیش کیا۔

غالب تقریبات کے تیسرے اور آخری دن 18 دسمبر کو صبح دس بجے سے شام پانچ بجے تک بین الاقوامی غالب سمینار بعنوان 'ہوتا ہے شب و روز تماشا مرے آگے' کا سلسلہ جاری رہا۔ سمینار کے پانچویں اجلاس کی صدارت جامعہ ملیہ اسلامیہ کے استاذ پروفیسر ندیم احمد نے کی۔ جب کہ نظامت کے فرائض رئیس احمد فراہی نے انجام دیے۔ سیشن میں پروفیسر عبدالحق، پروفیسر قمرالہدیٰ فریدی اور پروفیسر ضیاء الرحمٰن صدیقی نے مقالات پیش کیے۔ چھٹے اجلاس کی صدارت پروفیسر شریف حسین قاسمی نے کی جب کہ ڈاکٹر علام الدین نے نظامت کا فریضہ ادا کیا۔ اس اجلاس میں بطور مقالہ نگار پروفیسر کوثر مظہری، پروفیسر نجمہ رحمانی، پروفیسر اخلاق آہن، ڈاکٹر ضیاء اللہ انور اور فاطمہ سادات میر جیبی (ایران) نے مقالات پیش کیے۔ ساتویں اجلاس کی صدارت پروفیسر وہاج الدین علوی اور پروفیسر قاضی عبیدالرحمٰن ہاشمی نے فرمائی۔ جب کہ نظامت ڈاکٹر خوشتر زریں ملک نے کی۔ پروفیسر ہربنس مکھیا، پروفیسر انیس اشفاق، پروفیسر شافع قدوائی اور پروفیسر احمد محفوظ نے مقالے پیش کیے۔ اس اجلاس کے بعد اختتامیہ اجلاس کی صدارت پروفیسر صدیق الرحمٰن قدوائی نے کی جب کہ پروفیسر عتیق اللہ، پروفیسر ہربنس مکھیا، پروفیسر انیس اشفاق اور پروفیسر قاضی جمال حسین نے اظہار خیال کیا۔ اس اجلاس کی نظامت کی ڈاکٹر ندیم احمد نے کی۔

آخری پروگرام 'ہم سب ڈرامہ گروپ'، غالب انسٹی ٹیوٹ' کے زیر اہتمام 'داستانِ غالب' کا انعقاد عمل میں آیا۔ جسے تحریر کیا تھا پروفیسر دانش اقبال نے جب کہ پیشکش فوزیہ داستان گو اور فیروز خان (معروف داستان گو)، کی تھی۔

پریس ریلیز: غالب انسٹی ٹیوٹ، نئی دہلی 16 تا 18 دسمبر 2022

دھلی

اردو ادب میں ثقافتی ہم آہنگی کی عکاسی

نئی دھلی: ثقافتی ہم آہنگی ہماری سماجی اور تہذیب زندگی کا طرۂ امتیاز رہا ہے۔ ثقافتی ہم آہنگی کو قائم اور دائم رکھنے میں اردو زبان نے کلیدی کردار ادا کیا ہے۔ یہ ہماری مشترکہ وراثت ہونے کے ساتھ ساتھ عالمی طور پر ایک تسلیم شدہ زبان بھی ہے۔ اردو قومی یکجہتی کے باب میں جزو لاینفک کی حیثیت رکھتی ہے۔ ان خیالات کا اظہار ڈاکٹر مہر فاطمہ حسین صدر ایس ویژن اور ایسوسی ایٹ پروفیسر سروجنی نائیڈو سینٹر فار وومین اسٹڈیز، جامعہ ملیہ اسلامیہ نے ایس ویژن کے زیر اہتمام 'اردو ادب میں ثقافتی ہم آہنگی کی عکاسی' کے عنوان سے منعقد قومی سمینار سے خطاب کرتے ہوئے کیا۔ انھوں نے اپنی تقریر میں ثقافتی ہم آہنگی کے فروغ میں اردو زبان کی اہمیت کو واضح کرتے ہوئے اس کی معنویت پر بھرپور روشنی ڈالی۔ اس موقعے پر پدم شری پروفیسر اختر الواسع نے اپنے صدارتی خطبے میں کہا کہ زبان کا کوئی مذہب نہیں ہوتا بلکہ ہر مذہب کی کوئی نہ کوئی زبان ضرور ہے۔ اردو کے مشہور ناقد و محقق پروفیسر شافع قدوائی، ڈپارٹمنٹ آف ماس کمیونی کیشن، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ نے کلیدی خطبہ پیش کرتے ہوئے قومیت اور حب الوطنی کے فرق کو مدلل انداز میں واضح کیا۔ انھوں نے مزید کہا کہ ہم آہنگی مذہبی اور تہذیبی تنوع کے ساتھ مل جل کر رہنے کو کہتے ہیں اور اس ضمن میں اردو کی لازوال خدمات سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔ اپنی بات کو مزید واضح کرنے کے لیے انھوں نے سید محمد اشرف کے ناول 'آخری سواریاں' کا حوالہ دیا اور اسے ہم آہنگی کی کلاسیکل مثال قرار دیا۔ اپنے اعزازی خطبے میں پروفیسر ظفر محفوظ نعمانی، پروفیسر آف لا، شعبہ قانون، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، نے سیاسیات کے عمومی تصورات اور آئین کی روح میں موجود فرق کو واضح کرتے ہوئے کہا کہ سیاسیات کی کتابوں میں موجود ملٹنگ پاٹ کے تصور سے ہمارے آئین میں موجود اخوت کے تصور کی ہم آہنگی نہیں ہو پاتی۔ اردو کا سیاق و سباق ہی تکثیری معاشرے کی زندہ جاوید مثال ہے۔ افتتاحی اجلاس کے دوسرے مہمان اعزازی مشہور ادیب پروفیسر صفدر امام قادری نے اپنی گفتگو میں ثقافتی ہم آہنگی اور اردو کے مزاج کے حوالے سے تاریخی پس منظر کو بیان کیا۔ اس سے قبل تکنیکی سیشن کی صدارت ڈاکٹر پرویز نذیر نے کی۔ اس سیشن کے مقالہ نگاروں میں پروفیسر فرحت نسرین، ڈاکٹر یوسف رانا کمال، سنگیتا دوبے، ڈاکٹر الیاس حسین، سید غفران احمد، اور ڈاکٹر واحد نظیر شامل تھے۔

روزنامہ 'صحافت' دہلی، 25 دسمبر 2022

غالب لیکچر

نئی دھلی: غالب اکیڈمی کے زیر اہتمام مرزا غالب کے 225 ویں یوم پیدائش کے موقعے پر ایک پروقار تقریب کا انعقاد کیا گیا۔ اس موقعے پر پروفیسر احمد محفوظ نے اپنے خطاب میں کہا کہ غالب اور میر کے زمانے میں بڑے باکمال شاعر موجود تھے لیکن اردو کی شعری روایت میں غالب اور میر سب سے بڑے شاعر ہیں۔ غالب خوش نصیب تھے کہ ان کی زندگی میں پانچ باران کا دیوان شائع ہوا۔ ان کے انتقال کے 28 سال بعد الطاف حسین حالی کی 'یادگار غالب' شائع ہوگئی۔ غالب پر فلمیں اور سیریل بنے جس کی وجہ سے انھیں عوامی مقبولیت حاصل ہوگئی۔ غالب مروجہ روایت سے مختلف ہے۔ وہ فرسودہ روایت کو چھوڑ کر نئے راستے بناتا ہے۔ پروفیسر شریف حسین قاسمی نے کہا کہ غالب فارسی شعرا کے احسان مند ہیں اس کا اعتراف کرتے تھے، غالب کی شاعری کے ذریعے فارسی تراکیب، تہذیب اردو میں مستعمل ہوئیں، اضافت کے ذریعے اردو کا کھردرا پن دور ہوا۔ وہاج الدین علوی نے کہا کہ غالب کی شاعری میں فارسی کا استعمال بہت زیادہ ہوا، بعض غزلوں میں تو ردیف کے علاوہ سارے الفاظ فارسی کے ہیں۔ کلدیپ سلیل نے کہا کہ غالب اور اردو سے میرا تعلق محبت کا رہا ہے، میری پیدائش سیالکوٹ میں ہوئی، فیض میرے والد کے ہم جماعت تھے، غالب اور اردو سے محبت کی بنا پر اردو کے مشاہیر شعرا کا ترجمہ کیا۔ انھوں نے کئی اشعار کے ترجمے پیش کیے۔ ڈاکٹر جی آر کنول نے اپنی صدارتی تقریر میں کہا کہ شعر کا ترجمہ نہیں ہوسکتا اس کا مفہوم بیان کیا جاسکتا ہے۔ اس موقعے پر خطاطی کے طلبہ کو اسناد تقسیم کی گئیں۔ اس موقعے پر گیتا نجلی نے غالب کی غزل پیش کی اور متین امروہوی نے اپنا کلام پیش کیا۔ آخر میں محفل کلام غالب میں رشمی اگروال نے غالب کی غزلیں پیش کیں۔ محفل کلام غالب کی نظامت کشفی شمائل نے کی۔ اس موقعے پر بڑی تعداد میں دہلی یونیورسٹی، جامعہ ملیہ اسلامیہ اور غالب اکیڈمی کے اردو سرٹیفکیٹ کے طلبہ و اساتذہ موجود تھے۔ جلسے میں بڑی تعداد میں غالب کے پرستار بھی موجود تھے، جن میں ظہیر برنی، جاوید نسیم، شکیل حسن شمسی، نارنگ ساقی،

عبید خورشید، سمیر، وششٹ شو بھنا، محی الدین، سرفراز فراز، احترام صدیقی، پلک دیو بناتھ، ندھی، شاداب تبسم، جوس مورسس، مولانا انور قاسمی، اظہر زئی کے اسمائے گرامی شامل ہیں۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 29 دسمبر 2022

اختر الایمان کی شاعری

نئی دھلی: مجدد آئی او ایس سینٹر برائے آرٹس اینڈ لٹریچر کی جانب سے آج آئی او ایس کے کانفرنس ہال میں معروف شاعر اور ڈائیلاگ رائٹر اختر الایمان کی شاعری پر

پروفیسر قاضی عبید الرحمٰن ہاشمی نے اپنا مقالہ پیش کیا۔ انھوں نے بتایا کہ اختر الایمان ایک منفرد شاعر ہیں جنھوں نے اردو شاعری کے نئے معیار قائم کیے اور جن کی نظمیں اردو ادب کے خزانے کا انمول حصہ ہیں۔ انھوں نے اردو شاعری میں غزل کو مضبوط روایت سے ہٹ کر نظم کو اپنے شعری اظہار کا وسیلہ بنایا۔ اختر الایمان 12 نومبر 1915 کو مغربی اتر پردیش کے بجنور ضلع میں ایک چھوٹے سے قصبے پتھر گڑھ میں ایک غریب گھرانے میں پیدا ہوئے۔ آپ کے والد کا نام حافظ فتح محمد تھا اور وہ پیشے کے اعتبار سے امام تھے اور مسجد میں بچوں کو پڑھاتے بھی تھے۔ اختر الایمان کی ابتدائی تعلیم بجنور اور دہلی میں ہوئی۔ اینگلو عربک کالج دہلی سے بی اے کیا اور علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے ایم اے تک کی تعلیم حاصل کی لیکن کورس مکمل کیے بغیر کاروبار اور معاش سے وابستہ ہو گئے۔ آل انڈیا ریڈیو میں بطور اسٹاف آرٹسٹ کام کیا۔ پھر 1945 میں ممبئی جا کر فلمستان اسٹوڈیو میں بطور ڈائیلاگ رائٹر اپنی آگے کی زندگی شروع کی اور پچاس سے زائد فلموں کے لیے ڈائیلاگ لکھا۔ منظر نامے اور کہانیاں لکھی۔ انھیں متعدد بار فلم فیئر اور دوسرے ایوارڈ سے نوازا گیا۔ اختر الایمان کا انتقال 9 مارچ 1996 کو ممبئی میں ہوا۔ جناب انجم نعیم نے کہا کہ اختر الایمان اپنے عہد کے عظیم شاعر تھے لیکن اردو برادری نے ان کے ساتھ اچھا سلوک نہیں کیا اور نہ ہی ان کو وہ مقام و مرتبہ دیا گیا جس کے وہ حقدار تھے۔ پروگرام کی صدارت معروف دانشور ڈاکٹر خواجہ افتخار شاہد نے کی۔ اس موقعے پر صحافی احمد

جاوید، سینئر صحافی سہیل انجم، صفی اختر، وسیم فہمی سمیت متعدد لوگ موجود تھے۔

روزنامہ 'ہندوستان ایکسپریس' دہلی، 25 دسمبر 2022

ڈاکٹر فردوس جہاں، ڈاکٹر فیاض عالم اور عبدالباری قاسمی وغیرہ تھے۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 18 دسمبر 2023

اقبال کی نظم 'خضر راہ' پر مذاکرہ

نئی دھلی: اوکھلا میں واقع تسمیہ آڈیٹوریم میں اقبال کی معروف نظم خضر راہ کی ایک صدی پر مذاکرہ کا انعقاد کیا گیا، جس کا افتتاح قومی کونسل کے ڈائرکٹر پروفیسر شیخ عقیل احمد نے کیا۔ انھوں نے کلام اقبال پر اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ کوئی اردو والا اقبال کو پڑھے بغیر تعلیم یافتہ نہیں ہوسکتا۔ اقبال کی فکر ہمہ جہت موضوعات کی حامل ہے۔ ڈاکٹر سید فاروق نے اپنے صدارتی کلمات میں کہا کہ موجودہ عہد کے جس اردو شاعر نے اقبال کے کلام کا مطالعہ نہیں کیا وہ شاعر نہیں ہے۔ پروفیسر عبدالحق نے مذاکرہ کی نظامت کرتے ہوئے تمام مقالہ نگاروں کی حوصلہ افزائی کی۔ پروفیسر توقیر احمد خان نے اپنے تحقیقی مقالہ میں بہت سے گمنام حقائق پر گفتگو کی، جب کہ ڈاکٹر نفیس حسن نے 'خضر راہ کی بانگ درا' کے عنوان سے مقالہ پیش کیا۔ حقانی القاسمی نے کہا کہ میں نے اقبال کا مطالعہ کم کیا ہے مگر جتنا پڑھا ہے وہ میری زندگی کے نصاب میں شامل ہے۔ کلام اقبال میں تحرک اور تفکر ہے مگر افسوس کہ اہل سیاست نے ان کے تحرک کو تشدد سے جوڑ دیا ہے۔ زبانیں مرتی ہیں مگر جذبے زندہ رہتے ہیں۔ علامہ اقبال نے زبان سے زیادہ جذبہ پر زور دیا ہے۔ کوثر مظہری نے کہا کہ ہم سب اقبال کے طالب علم ہیں ان کے کلام کا متن نوع بشر کے لیے مشعل راہ ہے۔ پروفیسر اختر حسین کاظمی نے اقبال کے کلام کی اہمیت پر گفتگو کرتے ہوئے کہا کہ اقبال بڑا عبقری عہد آفریں شاعر ہے۔ علاوہ ازیں دوسرے مقالہ نگاروں میں ڈاکٹر صداقت اللہ علیگ، عبدالنصیب، پروفیسر معظم الدین، ڈاکٹر علی احمد ادریسی، ڈاکٹر شاہد خان، ڈاکٹر شفیق عالم، ڈاکٹر مرتضٰی اور ڈاکٹر سرفراز جاوید، انیس احمد اور محمد سرفراز وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ شرکا میں رئیس اعظم خاں، عبدالغفار،

عربی زبان کی امتیازی خصوصیات

نئی دھلی: شعبۂ عربی جامعہ ملیہ اسلامیہ کے زیر اہتمام عربی زبان کے عالمی دن کے موقعے پر طلبہ کے درمیان مختلف ثقافتی مسابقات کا انعقاد کیا گیا جبکہ سابق صدر شعبۂ عربی جامعہ ملیہ اسلامیہ پروفیسر شفیق احمد خان ندوی اور عراقی سفارت خانہ، دہلی کے کلچرل اتاشی ڈاکٹر عمار عبدالحمید خضر نے مہمان خصوصی کی حیثیت سے شرکت کی اور عربی زبان کی خصوصیات کے موضوع پر اپنا خطبہ پیش کیا، اس پروگرام کی صدارت شعبۂ عربی، جامعہ ملیہ اسلامیہ کے صدر پروفیسر عبدالماجد قاضی نے کی۔ اس کے بعد عربی قصیدہ خوانی کے مسابقہ کا انعقاد کیا گیا جس میں محمود عالم نے اول جب کہ ابرار حسن اور محمد ناصر انور نے بالترتیب دوسری اور تیسری پوزیشن حاصل کی جب کہ عربی بیت بازی کے مسابقہ میں فضل الرحمٰن کی ٹیم نے پہلا اور عطاء الرحمٰن کی ٹیم نے دوسرا انعام حاصل کیا۔ اس کے بعد شعبہ عربی کے ریسرچ اسکالر توصیف الرحمٰن نے اپنا عربی قصیدہ پیش کیا۔ پروفیسر نسیم اختر ندوی نے پروفیسر شفیق احمد خان ندوی اور ڈاکٹر عمار عبدالحمید خضر کا تعارف پیش کیا۔ پروفیسر شفیق احمد خان ندوی نے عربی زبان کے عالمی دن کی مناسبت سے عربی زبان کی امتیازی خصوصیات کے موضوع پر اپنا خطبہ پیش کیا جس میں انھوں نے عربی زبان پر گفتگو کرتے ہوئے دوسری عالمی زبانوں سے اس کا موازنہ بھی کیا نیز عربی زبان کی مختلف خصوصیات پر تفصیل سے روشنی ڈالی۔ آپ کے بعد اس پروگرام کے دوسرے مہمان خصوصی ڈاکٹر عمار عبدالحمید خضر نے عربی زبان کی لفظیات اور صوتیات پر گفتگو کرتے ہوئے کہا کہ عربی زبان قرآن کی زبان ہے، آپ نے عربی زبان کے عالمی دن کی مناسبت سے اس پروگرام کے انعقاد پر شعبۂ عربی، جامعہ ملیہ اسلامیہ کو مبارکباد پیش کرتے ہوئے اپنی خوشی کا اظہار کیا۔

صدر جلسہ نے ہندوستان میں عربی زبان وادب کی ترویج میں شعبۂ عربی، جامعہ ملیہ اسلامیہ کے سابق اور موجودہ اساتذہ کی خدمات کا تذکرہ کیا اور تمام شرکا کا شکریہ ادا کیا۔ پروفیسر نسیم اختر ندوی، پروفیسر فوزان احمد اور ڈاکٹر اورنگ زیب اعظمی نے مسابقات میں حکم کے فرائض انجام دیے۔

روزنامہ 'اخبار مشرق' دہلی، 23 دسمبر 2023

غالب کی دلی

نئی دھلی: اردو اکادمی، دہلی کے زیر اہتمام توسیعی خطبہ بعنوان 'غالب کی دلی' اردو اکادمی، دہلی کے قمر رئیس سلور جبلی ہال میں منعقد ہوا۔ تعارفی کلمات پیش کرتے ہوئے اردو اکادمی، دہلی کے سکریٹری محمد احسن عابد نے کہا کہ میری نظر میں اردو تہذیب نے غالب سے بڑا دانشور پیدا نہیں کیا ہے۔ اس عنوان سے دہلی کی تاریخ کا جائزہ لینا دلچسپ اور معلومات سے بھرا ہوا ہوگا۔ اردو و فارسی کے نامور اسکالر اور دہلوی تہذیب کی نمائندہ شخصیت پروفیسر شریف حسین قاسمی نے توسیعی خطبہ کے دوران کہا کہ سرسید اور حالی نے جس دور کی دہلی کا ذکر کیا ہے، اس کو ایک معاصر اور ایک معتبر مورخ پروفیسر خلیق احمد نظامی نے زیادہ وضاحت سے بیان کیا ہے۔ ان کے بیان میں جہاں حقائق کا ذکر ہے، وہیں تاریخی بصارت بھی کارفرما ہے۔ غالب تقریباً 49 برس دہلی میں مستقل قیام پذیر رہے۔ غالب نے دہلی کو اپنا وطن کہا ہے، لیکن انھوں نے اپنا کوئی مکان نہیں بنایا تھا، وہ ہمیشہ کرائے کے مکان میں رہے، اوائل میں شعبان بیگ کی حویلی میں رہا کرتے تھے۔ گلی قاسم جان یا پھاٹک حبش خاں کے قرب و جوار کے سوا کہیں اور نہ رہے۔ توسیعی خطبے کی صدارت پروفیسر ایس عنایت علی زیدی، ریٹائرڈ، شعبۂ تاریخ و ثقافت، جامعہ ملیہ اسلامیہ نے کی۔ انھوں نے صدارتی خطاب میں کہا کہ دہلی ایشیا کی تہذیب و ثقافت کو نمایاں کرتی ہے۔ دہلی کے اندر ہر قسم کا کلچر ملتا ہے۔ انھوں نے مزید کہا کہ دہلی کے مختلف مقامات کے ناموں پر کام ہونا چاہیے، اس قسم کی ریسرچ کافی دلچسپ ثابت ہوگی۔ پروفیسر سنیتا زیدی نے کہا کہ دہلی کو مختلف عہد میں تباہ و برباد کیا گیا، اس کے باوجود یہاں مختلف قسم کی تہذیب و ثقافت ملتی ہے، اس قدر ہوئی تباہی نے دہلی کو مزید استحکام بخشا ہے۔ دہلی سات دفعہ بسی اور اجڑی ہے اور آج ہمارے سامنے دہلی کی ایک شکل یہ بھی ہے۔ دہلی کی تہذیب اور ثقافت ہمیشہ رچی رہی ہے۔ بطور مہمان خصوصی صدر شعبۂ اردو، دہلی یونیورسٹی پروفیسر نجمہ رحمانی نے اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ دہلی کی ثقافتی تاریخ جس طریقے سے شمس الرحمٰن فاروقی نے 'کئی چاند تھے سرآسماں' میں پیش کی ہے، اس کی مثال نہیں ملتی ہے۔ اپنے ماضی کی دہلی کو نئی نسل کو جاننا چاہیے۔ مہمان اعزازی اردو اکادمی، دہلی کے وائس چیئرمین حاجی تاج محمد نے اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ غالب کی دہلی پر بہت ہی خوبصورت گفتگو ہوئی۔ انھوں نے تمام شرکا کا شکریہ بھی ادا کیا۔ پروگرام کی نظامت شعبۂ اردو جامعہ ملیہ اسلامیہ، دہلی کے استاذ ڈاکٹر خالد مبشر نے کی۔ شرکا میں خورشید حیات، اقبال مسعود، متین امروہوی، ڈاکٹر عقیل احمد، شمیم احمد، شعیب رضا فاطمی، نگار عظیم، اقبال فردوسی، اسرار قریشی، جاوید رحمانی، ضیاء اللہ اور نفیس منصوری وغیرہ نے شرکت کی۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 21 دسمبر 2022

علامہ طباطبائی کی شخصیت اور علمی آثار

نئی دھلی: علامہ سید محمد حسین طباطبائی علم وعرفان اور حکمت و دانش کا مجموعہ تھے اور وہ صرف قرآن کریم کے مفسر ہی نہیں بلکہ اسلامی دنیا کے مشہور ومعروف فلسفی اور صوفی بھی تھے'' ان خیالات کا اظہار، پروفیسر ایمریٹس پدم شری اختر الواسع نے شعبۂ اسلامک اسٹڈیز، جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی اور ہیومنیٹیز ایڈوانس اسٹڈیز انسٹی ٹیوٹ، نئی دہلی کے اشتراک سے منعقد ہونے والے بین الاقوامی سمپوزیم میں کیا۔ پروفیسر اقتدار محمد خان، صدر شعبہ اسلامک اسٹڈیز نے خطبہ استقبالیہ پیش کرتے ہوئے کہا کہ علامہ طباطبائی کی شخصیت اس اعتبار سے منفرد اور مختلف ہے کہ وہ بیک وقت مفسر بھی تھے، فلسفی بھی اور صوفیانہ طرز زندگی کے نمائندے بھی تھے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ ان کی علمی نگارشات اور روحانی و اخلاقی وراثت کو عام کیا جائے۔ مجھے امید ہے کہ ریسرچ اسکالرس اور طلبہ و طالبات علامہ سے نہ صرف واقف ہوسکیں گے بلکہ ان کی علمی خدمات اور کارناموں سے استفادہ بھی کریں گے۔ آیت اللہ رضا رمضانی، جنرل سکریٹری، اہل بیت ورلڈ اسمبلی، ایران نے اپنے کلیدی خطبہ میں علامہ طباطبائی کے کارناموں کو بیان کرتے ہوئے فرمایا کہ انھوں نے دراصل شریعت، حقیقت اور طریقت کو ایک جگہ جمع کردیا ہے جو ان کا عظیم الشان کارنامہ ہے۔ مہمان اعزازی پروفیسر محمد اسحٰق، سابق صدر شعبہ اسلامک اسٹڈیز نے فرمایا کہ علامہ طباطبائی کی تفسیر 'تفسیر المیز ان' بنیادی اہمیت کی حامل ہے کیونکہ اس میں انھوں نے جدید سوالات اور چیلنجز کے تسلی بخش جوابات دینے کی کوشش کی ہے، طلبہ وطالبات کو اس سے بھرپور استفادہ کرنا چاہیے۔ پروفیسر لطیف کاظمی، سابق صدر شعبہ فلسفہ، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی نے فرمایا کہ علامہ طباطبائی ایک مرد حق آگاہ تھے۔ انھوں نے ہمیں اخلاقی و روحانی اقدار کی تعلیم دی اور اپنی پوری توانائی انسانی اقدار کی حفاظت میں صرف کردی۔ آیت اللہ مہدی مہدوی پور، خصوصی نمائندے، اسلامی جمہوریہ، ایران نے اپنے صدارتی خطاب میں فرمایا کہ علامہ طباطبائی کا تعلق کسی خاص خطے سے نہیں بلکہ پورے عالم اسلام سے ہے۔ ان کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ انھوں نے اپنی گراں قدر تصانیف کے علاوہ کئی ایسے شاگرد تیار کیے ہیں جو متعدد علوم وفنون جیسے تفسیر، فلسفہ، تصوف وغیرہ میں نمایاں خدمات انجام دے رہے ہیں۔ نظامت کے فرائض ڈاکٹر مہدی باقر خان نے انجام دیے اور ڈاکٹر محمد ارشد، کوآرڈینیٹر، سمپوزیم کے کلمات تشکر پر کانفرنس کا اختتام ہوا۔ سمپوزیم میں علامہ طباطبائی پر ایک ڈاکومنٹری پیش کرنے کے علاوہ ہیومنیٹیز ایڈوانس اسٹڈیز انسٹی ٹیوٹ کی پانچ مطبوعات کا اجرا بھی عمل میں آیا۔ سمپوزیم میں شعبۂ اسلامک اسٹڈیز کے جملہ اساتذہ کے علاوہ دیگر شعبوں کے صدور، اساتذہ کرام، ریسرچ اسکالرس اور ایم اے، بی اے کے طلبہ وطالبات کی ایک بڑی تعداد موجود تھی۔

روزنامہ 'ہمارا سماج' دہلی، 6 دسمبر 2022

ساحر لدھیانوی: حیات اور خدمات

نئی دھلی: ساہتیہ اکادمی کے زیر اہتمام اکادمی آڈیٹوریم رویندر بھون، نئی دہلی میں 'ساحر لدھیانوی: حیات اور خدمات' کے موضوع پر یک روزہ سمپوزیم کا انعقاد کیا گیا جس کی صدارت اردو کے ممتاز شاعر، ادیب و نقاد جناب شین کاف نظام (کنوینر، اردو مشاورتی بورڈ) نے کی۔ انھوں نے اپنے صدارتی خطبے میں کہا کہ ساحر وہ شاعر ہیں جو جنگ کی مخالفت کرتے ہیں۔ وہ مایوسی کے نہیں بلکہ اداسی کے شاعر ہیں۔ وہ لڑتے ہیں ہار نہیں مانتے۔ سمپوزیم کا افتتاح کرتے ہوئے اردو کے ممتاز شاعر ومترجم پروفیسر بھوپندر عزیز پریہار نے کہا کہ شعر ساحر کی گھٹی میں پڑا تھا۔ وہ ابتدا سے ہی ترقی پسند خیال کے تھے۔ اپنے باغیانہ تیور کی وجہ سے کالج میں بھی وہ کافی مقبول ہوگئے تھے۔ انھوں نے پہلا شعر کب کہا، انھیں یاد نہیں۔ ڈائرکٹر صادقہ نواب سحر نے ساحر کے ترقی پسند عناصر میں تصوف کی تلاش کرتے ہوئے ساحر کے فلمی گانوں کے حوالوں

ساہتیہ اکادمی کے زیر اہتمام 'ساحر لدھیانوی: حیات اور خدمات' کے موضوع پر سمپوزیم

سے یہ ثابت کیا کہ انھوں نے فلم میں سچویشن کا فائدہ اٹھاتے ہوئے ہمیشہ قدیم اقدار اور بھکتی کے معاملات سے استفادہ کیا۔ انھوں نے تصوف اور بھکتی دونوں کا جو اظہار فلموں کے حوالے سے کیا ہے وہ ایک دم کلاسیکل ہے لیکن مشکل خیال کو آسان زبان میں اور وہ بھی فلم کے منظرنامے کے مطابق پیش کرنے کا ہنر کسی اور فلمی شاعر کو حاصل نہیں ہوا۔ اس اجلاس کی ابتدا میں ساہتیہ اکادمی کے سکریٹری ڈاکٹر کے سری نواس راؤ نے شرکا اور مہمانوں کا خیرمقدم کیا اور اس سمپوزیم کے اغراض و مقاصد پر روشنی ڈالی، افتتاحی اجلاس کے بعد پہلے اجلاس کی صدارت کرتے ہوئے ممتاز نقاد وصحافی شمیم طارق نے کہا کہ ساحر اپنا محاسبہ بھی خود کرتا ہے۔ وہ ایک بہتر انسانی معاشرے کا خواب دیکھتے تھے۔ وہ اپنے فن میں ماہر تھے اور انھیں کافی مقبولیت حاصل ہوئی۔ اس اجلاس میں کوثر مظہری نے اپنا مقالہ بعنوان 'ساحر لدھیانوی کی نظم چکلے کی آزاد قرأت' پیش کی اور کہا کہ ساحر نے 'چکلے' کی جو تصویر کشی کی ہے دراصل وہ ایک تانیثی تصور ہی کی ایک جہت ہے۔ دوسرا مقالہ خالد اشرف نے 'ساحر اور بین الاقوامیت' کے عنوان سے پڑھا۔ انھوں نے کہا کہ ساحر کی شاعری میں بین الاقوامی انسانی نظریہ اور ان کے سوشلسٹ تصورات صاف جھلکتے ہیں۔ سمپوزیم کے آخری اجلاس کی صدارت پروفیسر شہزاد انجم نے کی جب کہ شرد دت، حقانی القاسمی اور ڈاکٹر عالیہ نے اپنے مقالے پیش کیے۔ اس پروگرام میں دہلی و اطراف کی مقتدر شخصیات نے شرکت کی جن میں خالد علوی، چندر بھان خیال، عازم کوہلی، فریاد آزر، احمد علوی، جانکی پرشاد شرما، فرحت عثمانی، نارنگ ساقی، ابوظہیر ربانی، اسدرضا کے علاوہ طلبہ وطالبات شامل تھے۔

روزنامہ 'اخبار مشرق' دہلی، 13 دسمبر 2022

کیف بھوپالی کی حیات وخدمات

نئی دھلی: معروف شاعر کیف بھوپالی کی یاد میں جعفر آباد کے حاجی بشیر پردھان کی رہائش گاہ پر ایک پروگرام کا انعقاد کیا گیا جس میں ان کی حیات و خدمات اور اردو شعر و ادب کے حوالے سے تفصیلی گفتگو کی گئی۔ پروگرام کا اہتمام ڈاکٹر ذاکر حسین فاؤنڈیشن نے کیا جس کی قیادت فاؤنڈیشن کے چیئرمین ذاکر حسین پپو اور نظامت یوتھ جزیشن امپاورمنٹ کے صدر صدام پردھان نے کی۔ ذاکر حسین پپو نے کہا کہ عام طور پر لوگ کیف بھوپالی کو رومانی شاعر کے ساتھ فلم کا گیت کار سمجھتے ہیں، لیکن کیف بھوپالی نے عوامی شاعری اور فلمی نغمہ نگاری کے ساتھ قرآن کریم کا جس طرح منظوم ترجمہ کیا ہے وہ پڑھنے سے تعلق رکھتا ہے۔ مفہوم القرآن میں کیف نے ایسی زبان استعمال کی ہے کہ جو بھی اسے ایک بار پڑھتا ہے پڑھتا ہی رہ جاتا ہے۔ مولانا طالب ندوی نے کہا کہ پہلے ہم انھیں صرف ایک شاعر ہی جانتے تھے، مگر جب میرے مطالعہ میں ان کا منظوم ترجمہ مفہوم القرآن آیا تو ہم نے انھیں ایک مذہبی شخصیت کے طور پر بھی جانا اور یقیناً منظوم ترجمہ کرنا یہ انھیں کا خاص حصہ ہے۔ اہم شرکا میں حاجی نصیر احمد گڈو، فیضان ملک، عدنان بشیر، فہد نصیر، شاہ فیصل، احمد بشیر، حاجی اسلام الدین اور حاجی رفیق وغیرہ کے نام قابل ذکر ہیں۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 13 دسمبر 2022

ہندوعرب تعلقات: قدیم وجدید راہوں کی تفہیم

نئی دھلی: انڈیا عرب کلچرل سنٹر، جامعہ ملیہ اسلامیہ

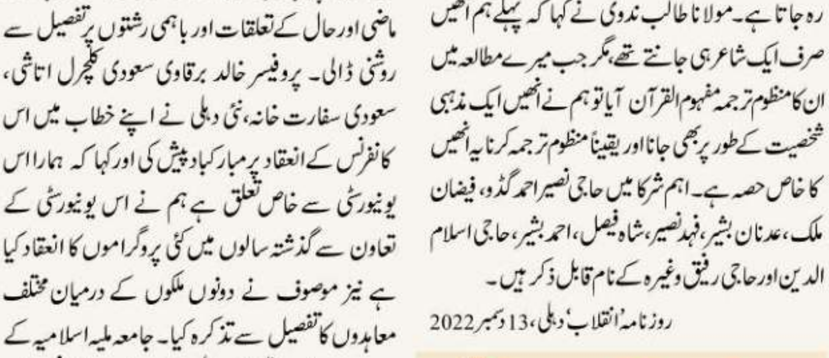

کے زیر اہتمام 'ہندوعرب تعلقات: قدیم وجدید راہوں کی تفہیم' کے موضوع پر دوروزہ کانفرنس کے افتتاحی اجلاس کا انعقاد جامعہ ملیہ اسلامیہ کے ایف ٹی کے، سی آئی ٹی کانفرنس ہال میں پروفیسر نجمہ اختر وائس چانسلر جامعہ ملیہ اسلامیہ کی صدارت میں منعقد کیا گیا، جس میں ڈاکٹر اوصاف سعید سکریٹری وزارت خارجہ ہند نے بطور مہمان خصوصی جب کہ پروفیسر خالد یوسف برقاوی کلچرل اتاشی سعودی سفارت خانہ نئی دہلی اور پروفیسر ناظم حسین جعفری رجسٹرار جامعہ ملیہ اسلامیہ نے مہمان اعزازی کی حیثیت سے شرکت کی۔ اس کے بعد کانفرنس کے کنوینر پروفیسر ناصر رمضان نے صدر جلسہ، مہمان خصوصی اور دونوں مہمان اعزازی کا تعارف پیش کیا۔ پروفیسر محمد ایوب ندوی ڈائرکٹر انڈیا عرب کلچرل سینٹر، جامعہ ملیہ اسلامیہ نے استقبالیہ خطبہ پیش کرتے ہوئے جامعہ کی تاریخ نیز عرب و ہند تعلقات پر روشنی ڈالی اور تمام مہمانوں کا شکریہ ادا کیا۔ صدر جلسہ پروفیسر نجمہ اختر وائس چانسلر، جامعہ ملیہ اسلامیہ نے اس کانفرنس کے انعقاد پر انڈیا عرب کلچرل سینٹر، جامعہ ملیہ اسلامیہ کو مبارکباد پیش کی اور جامعہ میں پروفیسر خالد یوسف برقاوی، ڈاکٹر اوصاف سعید اور اس کانفرنس کے تمام شرکا کا استقبال کیا۔ ڈاکٹر اوصاف سعید سکریٹری وزارت خارجہ ہند نے اپنے خطاب میں جامعہ ملیہ اسلامیہ کو قومی اور بین الاقوامی رینکنگ میں نمایاں کارکردگی پر مبارکباد پیش کرتے ہوئے ہند وعرب کے ماضی اور حال کے تعلقات اور باہمی رشتوں پر تفصیل سے روشنی ڈالی۔ پروفیسر خالد برقاوی سعودی کلچرل اتاشی، سعودی سفارت خانہ، نئی دہلی نے اپنے خطاب میں اس کانفرنس کے انعقاد پر مبارکباد پیش کی اور کہا کہ ہمارا اس یونیورسٹی سے خاص تعلق ہے ہم نے اس یونیورسٹی کے تعاون سے گذشتہ سالوں میں کئی پروگراموں کا انعقاد کیا ہے نیز موصوف نے دونوں ملکوں کے درمیان مختلف معاہدوں کا تفصیل سے تذکرہ کیا۔ جامعہ ملیہ اسلامیہ کے رجسٹرار پروفیسر ناظم حسین الجعفری نے اس کانفرنس میں تمام مہمانوں کا استقبال کیا نیز مختلف ادوار میں ہندوستان اور عرب کے درمیان مختلف میدانوں میں تعلقات اور رشتوں پر گفتگو کی۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی 15 دسمبر 2022

خطاطی ورکشاپ

نئی دھلی: ایران کلچر ہاؤس میں انجمن خطاطان ہند (رجسٹرڈ) کی ایک میٹنگ کا انعقاد کیا گیا جس میں استاد رسول مرادی نے بحیثیت مہمان خصوصی شرکت کی۔ اس موقعے پر ایران کلچر ہاؤس کے کلچرل کاؤنسلر ڈاکٹر علی ربانی نے شرکت کی۔ انجمن کے جنرل سکریٹری قاری محمد یاسین نے تمام خطاطان ہند کا استقبال کیا اور ایران سے تشریف لائے مشہور خطاط استاد رسول مرادی کا تعارف بھی کرایا۔ ڈاکٹر علی ربانی نے کہا کہ میں تمام خطاطان ہند کا استقبال کرتا ہوں چند ماہ قبل ہی انجمن خطاطان ہند کا قیام عمل میں آیا ہے جس کا ہندوستان کے خطاطان نے استقبال کیا۔ خطاطی کے تعلق سے ہندوستان میں ابھی تک کوئی خطاطی کی تنظیم نہیں تھی اس لیے ہم نے ہندوستانی خطاط حضرات کے مشوروں کے ذریعے اس انجمن کو قائم کیا ہے۔ انھوں نے کہا کہ آج بھی اس فن کی آبیاری کی جانی چاہیے جس کی سخت ضرورت ہے۔ اس ورکشاپ میں دہلی و بیرون دہلی کے خطاط اور طلبہ نے بہت دلچسپی سے خطاطی پر استاد سے سوالات کیے اور اس ورکشاپ میں شریک رہے۔ اس موقعے پر استاد رسول مرادی نے خط نستعلیق کی تاریخ بتاتے ہوئے کہا کہ تقریباً 600 سال پہلے میر علی تبریزی نے نستعلیق کے قواعد ترتیب دیے۔ اس کے بعد سلطان علی مشہدی اور میر عماد ہروی نے اس فن کو آگے بڑھایا۔ خط نستعلیق کے سب سے بڑے استاد میر عماد کو مانا جاتا ہے۔ شاہ جہاں کے دور میں بہت سے ایرانی خطاط ہندوستان آئے اور اس ہنر کے فروغ کے لیے کام انجام دیا۔ انھوں نے مزید کہا کہ لال قلعہ، تاج محل اور دیگر تاریخی عمارتوں پر موجود کتبوں کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ اس دور میں فن خطاطی کا کافی عروج تھا، ہندوستانی خطاطوں کی محنتوں کا ذکر کرتے ہوئے انھوں نے محمد رضا کشمیری خطاط کا ذکر کیا۔ انھوں نے کہا کہ ان کے آثار اور قلمی نسخے سالار جنگ میوزیم حیدرآباد میں آج بھی موجود ہیں۔ ہندوستان اور ایران کے قومی ثقافتی تعلقات کے فروغ میں فن خطاطی کے ہنر نے اہم کردار ادا کیا ہے جس کے نمونے آج بھی مختلف کتب خانوں اور میوزیم میں موجود ہیں۔ اس موقعے پر شرکت کنندگان میں انجمن کے صدر انیس صدیقی، جھارکھنڈ کے نائب صدر خطاطی محمد احرار و نوشاد احمد، بریلی شریف سے تشریف لائے شاذ احمد، دہلی سے عطاء اللہ، وسیم احمد، مشتاق احمد، عبدالرحمٰن غالب اکیڈمی، قاری اکرام اللہ، مولانا ابرار احمد، نصرالدین، عبدالرحمٰن قلم کار، ذکیرالدین، نثار احمد نقشبندی، شفیق احمد، علامہ عبدالمنان، فیروز ہاشمی دیگر طلبہ و طالبات نے کثیر تعداد میں شرکت کی۔ اس موقعے پر تمام خطاط حضرات نے نور میکر و فلم کا بھی دورہ کیا اور وہاں کے خطاطی کے طغرے و نسخہ ہای خطی کو دیکھا اور سراہا۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 30 دسمبر 2022

اتر پردیش

نظیر اکبرآبادی اور قومی یکجہتی

لکھنؤ: خواجہ معین الدین چشتی لینگویج یونیورسٹی کے شعبۂ اردو کی جانب سے نظیر اکبرآبادی اور قومی یکجہتی کے

موضوع پر قومی سمینار کا انعقاد کیا گیا۔ اس سمینار میں نظیر اکبرآبادی کی شاعری کے مختلف پہلوؤں پر اظہار خیال کیا گیا اور خصوصی طور سے قومی یکجہتی کے حوالے سے ان کی شاعری کی عصری معنویت پر روشنی ڈالی گئی۔ سمینار میں صدارتی کلمات پیش کرتے ہوئے دہلی یونیورسٹی کے پروفیسر ابن کنول نے کہا کہ نظیر کو عوامی شاعر کا لقب اس بنا پر ملا کہ انھوں نے اپنی تخلیقات میں ان تجربات اور مشاہدات کو دلچسپ اور متاثر کن انداز میں پیش کیا جن کا براہ راست تعلق عوام سے تھا۔ پروفیسر ابن کنول نے نظیر کی مشہور نظموں کے حوالے سے کہا کہ ان نظموں میں جو زبان استعمال کی گئی ہے وہ زبان عام آدمی کی زبان ہے اور کمال یہ ہے کہ ایسی سادہ اور آسان زبان میں بھی زندگی اور متعلقات زندگی کے بعض ان معاملات کو بیان کیا گیا ہے جو پیچیدہ نوعیت کے ہیں۔ جواہر لعل نہرو یونیورسٹی نئی دہلی کے پروفیسر خواجہ اکرام الدین نے اپنے خطاب میں خصوصی طور سے اس بات پر زور دیا کہ دنیا کے تمام ملکوں کے درمیان ہندوستان کو یہ شرف حاصل ہے کہ یہاں مختلف قوم، مذہب، رنگ، نسل اور زبان کے افراد اتحاد اور یکجہتی کی فضا میں زندگی بسر کرتے ہیں۔ انھوں نے اردو شاعری کے سیکولر رویے کا حوالہ دیتے ہوئے کہا کہ سیکولر افکار ہی یکجہتی کی راہ ہموار کرتے ہیں اور اس معاملے میں اردو کا ادبی سرمایہ جتنا وقیع ہے اس کی مثال ہندوستان کی دوسری زبانوں میں بہت کم ملے گی۔ سینئر صحافی معصوم مرادآبادی نے سمینار کے موضوع کی اہمیت اور افادیت پر اظہار خیال کرتے ہوئے کہا کہ ایسے موضوعات پر علمی اور ادبی مذاکرات کا انعقاد وقت کی اہم ضرورت ہے اور شعبۂ اردو نے اس موضوع پر سمینار منعقد کرکے اپنی بیداری اور فعالیت کا ثبوت دیا ہے۔ جامعہ ملیہ اسلامیہ یونیورسٹی نئی دہلی میں شعبۂ اردو کے صدر پروفیسر احمد محفوظ نے کلیدی خطبے میں نظیر کی شاعری اور اردو کی کلاسیکی شعری روایت میں اس شاعری کی انفرادیت پر قدرے تفصیل سے گفتگو کی۔ انھوں نے کہا کہ نظیر کو مقبولیت کے معاملے میں اردو کے ممتاز شاعروں پر فضیلت حاصل ہے اور اس کی وجہ یہ ہے کہ انھوں نے اپنی تخلیقات میں جو زبان استعمال کی وہ عام آدمی کی زبان ہے جسے سمجھنے کے لیے لغت کا سہارا درکار نہیں ہے۔ لینگویج یونیورسٹی کے وائس چانسلر پروفیسر این بی سنگھ نے اپنی تمام تر مصروفیات کے باوجود سمینار میں شرکت کی اور مہمانان کا شکریہ ادا کیا اور کہا کہ ملک کی ممتاز یونیورسٹیوں سے ان مہمانوں کی تشریف آوری نے سمینار کی اہمیت کو دو چند کر دیا ہے۔

پروفیسر فخر عالم صدر شعبۂ اردو کے استقبالیہ کے ساتھ سمینار کا آغاز ہوا جس میں انھوں نے نظیر کی شاعرانہ انفرادیت پر مختصر اور جامع اظہار خیال کیا۔ شعبۂ اردو کے استاذ ڈاکٹر وصی احمد اعظم انصاری نے سمینار کے مرکزی موضوع پر مقالہ پیش کیا اور نظیر کی شاعری کی اہمیت اور افادیت پر روشنی ڈالی۔ پروفیسر ثوبان سعید نے خوبصورت انداز میں نظامت کے فرائض انجام دیے اور ڈاکٹر اکمل شاداب نے سمینار کے شرکا اور تمام مہمانوں کا شکریہ ادا کیا۔ اس سمینار میں آرٹس فیکلٹی کے ڈین پروفیسر مسعود عالم، ایجوکیشن ڈپارٹمنٹ کی ڈاکٹر بشریٰ، ڈاکٹر تلنی مشرا اور شعبۂ اردو کے اساتذہ ڈاکٹر جمال رضوی، ڈاکٹر ظفر النقی، ڈاکٹر منور حسین اور ڈاکٹر سدھارتھ سدیپ کے علاوہ سنی وقف بورڈ کے سی ای او پروفیسر شفیق اشرفی اور مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی کے ڈاکٹر ابو شہیم اور ڈاکٹر سجاد اختر نے شرکت کی۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 26 دسمبر 2022

جون ہونا کوئی مذاق نہیں

امروھہ: جون ایلیا کے 91 ویں یوم پیدائش پر نایاب

عباسی پی جی کالج کے شعبہ اردو کی جانب سے 'جون ہونا کوئی مذاق نہیں...' موضوع پر ایک روزہ سمینار اور محفل مشاعرہ کا انعقاد کیا گیا جس میں پنجابی یونیورسٹی پٹیالہ کے ریٹائرڈ پروفیسر ناشر نقوی نے مہمان خصوصی کے طور پر خطاب کیا۔ اس موقعے پر ناشر نقوی نے کہا کہ جون ایلیا پوری ادبی دنیا میں سب سے زیادہ پڑھے جانے والے شاعر ہیں۔ انھوں نے جون کی شاعری کے مختلف پہلوؤں پر روشنی ڈالی اور انھیں اس صدی کا ممتاز شاعر قرار دیا جس کی شہرت دنیا کی تقریباً ایک درجن زبانوں میں یکساں ہے۔ چیف پراکٹر و پروگرام کو آرڈینیٹر ڈاکٹر مہتاب امروہوی نے کہا کہ جون ایلیا نے اپنی شاعری میں تمام رشتوں کی حقیقت بیان کرکے دنیا کو آئینہ دکھایا ہے۔ 14 دسمبر 1931 کو امروہہ کے محلّہ لکڑا میں کمال امروہوی کے خاندان میں پیدا ہونے والے جون ایلیا 1957 میں پاکستان ہجرت کر گئے تھے لیکن وہ مرتے دم تک امروہہ کو نہیں بھول سکے۔ پروگرام میں بی اے کی طالبہ انیکا یادو نے جون ایلیا کی زندگی پر روشنی ڈالتے ہوئے انھیں امروہہ کی پہچان اور فخر قرار دیا، جب کہ ڈاکٹر سنگیتا رانی گپتا، ڈاکٹر طارق عظیم، ڈاکٹر مبارک علی، ڈاکٹر خضر حیات دردانہ اکرم فاروقی وغیرہ نے اپنے تحقیقی مضامین میں جون کو اردو کا باکمال شاعر قرار دیتے ہوئے کہا کہ ان کی شاعری پر بہت تحقیق کی ضرورت ہے۔ کالج سکریٹری پروگرام کے صدر ایم اسلم فاروقی نے تمام مہمانوں اور محققین کا شکریہ ادا کیا جنھوں نے اس تقریب کو کامیاب بنایا۔ انھوں نے کہا کہ کالج انتظامیہ جون ایلیا کی بیشتر تخلیقات، تنقیدی مضامین اور ڈراموں کو یکجا کرنے کی کوشش کرے گی تاکہ تحقیق کرنے والے طلبہ و طالبات کو مدد مل سکے۔ اس موقعے پر انور صمدانی، تنویر حسن نقوی، اشہر توصیف، دلشاد امروہوی، ڈاکٹر لاڈلے رہبر، فراز عرشی، شان حیدر بیباک، مشہور فوٹو جرنلسٹ خرم امروہوی نے بھی اپنے خیالات اور مقالات پیش کیے۔ آخر میں قائم مقام پرنسپل ڈاکٹر ریشما زیدی نے جون ایلیا کی زندگی پر روشنی ڈالتے ہوئے سب کا شکریہ ادا کیا۔ پروگرام کی نظامت ڈاکٹر مہتاب امروہوی نے کی۔

روزنامہ 'صحافت' دہلی، 15 دسمبر 2022

ڈراما 'ایک انار سو بیمار'

سہارنپور: چلکانہ روڈ پر واقع براؤن ووڈ پبلک اسکول میں سوسائٹی اداکار گروپ کا مزاحیہ ڈراما 'ایک انار سو بیمار' پیش کیا گیا۔ ڈیڑھ گھنٹے کے اس پرمزاح ڈرامے نے طلبہ کو ہنسا ہنسا کر لوٹ پوٹ کردیا۔ معروف ڈراما نگار و ہدایت کار جاوید خان سروہا کے تحریر کردہ ڈرامے میں شہر کے نوجوان اداکاروں نے اپنی اداکاری کے جوہر دکھائے، جن کو ناظرین کی خوب داد ملی۔ خاص بات یہ ہے کہ یہ تمام نوجوان اداکار پہلی بار اسٹیج پر اداکاری کررہے تھے۔ ڈرامے کے مرکزی کرداروں میں رمشا خان، حارث ملک، مانویر سنگھ اور یمن شرما نے اپنی اداکاری سے ناظرین کو تالیاں بجانے پر مجبور کردیا۔ معاون کردار ادا کرتے ہوئے کشش گپتا، سشیل کمار، ساجد، اسد خان، ابوذر، اور جاوید قریشی نے اپنی اداکاری سے قہقہوں کی بارش کرادی۔ جاوید خان سروہا نے ڈرامے میں سچ بولنے کی ضرورت پر خاص طور پر توجہ دیتے ہوئے کہا کہ انسان کو ایک جھوٹ چھپانے کے لیے سو جھوٹ بولنے پڑتے ہیں۔ انھوں نے کہا کہ دورِ حاضر میں جھوٹ بولنا ہماری روزمرہ کی زندگی کا حصہ بن گیا ہے، جس سے بچنے کی اشد ضرورت ہے۔ پروگرام کے اختتام پر براؤن ووڈ اسکول کی ڈائرکٹر صبوحی افتخار نے اداکار گروپ کے صدر جاوید خان سروہا کا شکریہ ادا کیا۔ ڈرامہ ٹیم کو سند اور میڈل دے کر ان کی حوصلہ افزائی کی۔ پروگرام کو کامیاب بنانے میں سید حمزہ، شاہ زیب، محمد عالم، محمد ہادی کے ساتھ مذکورہ اسکول کے اسٹاف کا تعاون رہا۔ اسکول کے سیکڑوں بچوں نے مزاحیہ ڈرامے کا خوب لطف اٹھایا۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 8 دسمبر 2022

ادبی نصوص کی قرأت: پس منظر اور منہج

علی گڑھ: علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے شعبہ عربی میں آن لائن لیکچر کا انعقاد کیا گیا جس میں جارڈن یونیورسٹی آف سائنس و ٹکنالوجی کے پروفیسر محمد علی ابنیان نے 'ادبی نصوص کی قرأت پس منظر اور منہج' پر خطبہ پیش کیا۔ انھوں نے اپنے خطبہ میں قرأت کے فنی نکات، طریقہ کار، متن کے انتخاب اور تجزیہ جیسے موضوعات پر مفصل روشنی ڈالی۔ تیونس یونیورسٹی کی پروفیسر صفا البطی نے 'متون کی قرأت عصری تناظر میں' کے عنوان سے خطبہ پیش کیا جس میں انھوں نے متون کی قرأت کی تاریخ پر روشنی ڈالتے ہوئے ان مکاتب فکر پر اظہار خیال کیا جو ارسطو و افلاطون کے زمانہ سے لے کر تا امروز مختلف زاویہ ہائے نظر کی نمائندگی کرتے ہیں۔ صدر شعبۂ عربی پروفیسر محمد ثناء اللہ ندوی نے اپنے استقبالیہ کلمات میں شعبہ کی تاریخ پر روشنی ڈالتے ہوئے کہا کہ سرسید احمد خاں نے مختلف موضوعات کی درس و تدریس کے لیے جرمن فضلا اور برطانوی اساتذہ کی خدمات حاصل کیں، جن میں سرفہرست پروفیسر آرنلڈ، پروفیسر ٹریٹن اور پروفیسر اوٹو اشپیز ہیں۔ بعد میں پروفیسر عبدالعزیز میمنی، پروفیسر عبدالعلیم، پروفیسر مختار الدین احمد نے اس شعبہ کو عالم عرب سے روشناس کرایا۔ پروفیسر آرزو نے مجلّہ المجمع العلمی الہندی جاری کرکے عرب فضلا و ہندوستانی محققین کے درمیان ایک علمی رابطہ پیدا کیا۔ صدر شعبہ نے متن کی قرأت اور تاریخ کے حوالہ سے مشرق و مغرب کے نقطہ ہائے نظر کی طرف اشارہ کیا۔ اس پروگرام میں ایک سو سے زائد ہندوستان کے شعبہائے عربی کے اساتذہ و طلبا نے شرکت کی اور عرب اساتذہ سے استفادہ کیا۔

روزنامہ 'ہندوستان ایکسپریس' دہلی، 8 دسمبر 2022

ہند-فارسی تاریخ نویسی

علی گڑھ: علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے سینٹر آف ایڈوانسڈ اسٹڈی، شعبۂ تاریخ نے 'ہند-فارسی تاریخ نویسی' پر ایک ہفت روزہ ورکشاپ کا انعقاد کیا جس میں ماہرین نے گیارہ مختلف سیشن میں 25 خطبات دیے اور عہد وسطیٰ کے ہندوستان کی تاریخ نویسی کے فارسی مآخذ پر سیر حاصل گفتگو کی۔ پروفیسر گل فشاں خان (چیئر پرسن اور کوآرڈی نیٹر، سنٹر آف ایڈوانسڈ اسٹڈی، شعبۂ تاریخ) نے کہا کہ "ہندوستان میں لکھی جانے والی فارسی تاریخی تحریریں برصغیر ہند کی سب سے مالا مال علمی روایات کی نمائندگی کرتی ہیں اور تحقیق کے طلبا کے لیے یہ ضروری ہے کہ وہ ہند-فارسی تاریخ نویسی کی ابتدا اور اس کی پیش رفت سے واقفیت حاصل کریں تاکہ وہ ان اہم تبدیلیوں کو سمجھ سکیں جو ہندوستانی

ماحول میں تاریخ نویسی کے عمل سے وقوع پذیر ہوئیں۔'' انھوں نے آرکائیو مآخذ، مخطوطات اور تاریخ کے شائع شدہ متون، شاعری، سوانح حیات، جغرافیہ، انسائیکلوپیڈیا، تفسیر اور سنسکرت کی تصانیف کے اہم تراجم کے بارے میں بھی گفتگو کی۔ ورکشاپ میں ماہرین نے طلبا کو مخطوطات کو سمجھنے کے طریقوں سے لے کر مختلف نسخوں کا موازنہ اور متن سے متعلق امور کی تفہیم جیسے موضوعات سے متعارف کرایا۔

روزنامہ 'ہندوستان ایکسپریس' دہلی، 20 دسمبر 2022

اسرارالحق مجاز: شخصیت اور شخصیت

لکھنؤ: سماجی و ادبی تنظیم، ادب کلچر اینڈ ویلفیئر سوسائٹی اتر پردیش کے زیر اہتمام ترانہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے

خالق اور انقلابی شاعر اسرارالحق مجاز کی 67 ویں برسی پر صبا کامپلیکس خرم نگر لکھنؤ میں کیا گیا جس کی صدارت اے ایم یو اولڈ بوائز ایسوسی ایشن لکھنؤ کے سابق صدر طارق صدیقی نے کی۔ اس موقعے پر مہمان خصوصی سید شعیب نے کہا کہ مجاز کو سچا خراج عقیدت یہ ہوگا کہ ان کے عظیم کارناموں سے نسل نو کو روشناس کرایا جائے، انھوں نے کہا کہ اسرارالحق مجاز کی شاعری میں معاشرے اور سماج کے ساتھ صنف نازک کے پیش آمدہ مسائل کا درد نمایاں محسوس کیا جاسکتا ہے، وہ نہ صرف ایک بہترین شاعر تھے بلکہ مسلم یونیورسٹی کے ممتاز طالب تھے جنھوں نے عالمی سطح پر مسلم یونیورسٹی کے فیض کو عام کیا۔ مہمانان اعزازی سہیل احمد علیگ سابق صدر اے ایم یو اولڈ بوائز ایسوسی ایشن ریاض سعودی عربیہ نے کہا کہ مجاز نے ترانہ علی گڑھ لکھ کر نہ صرف یونیورسٹی سے والہانہ عقیدت و محبت کا اظہار کیا بلکہ اس ترانہ کے ذریعے پوری علیگ برادری کے اندر جوش اور جذبہ پیدا کیا اور آج ہمیں فخر ہے کہ ہم مسلم یونیورسٹی کے فیض یافتہ ہیں۔ سہیل احمد نے کہا کہ آج کا ادب کلچر اینڈ ویلفیئر سوسائٹی کا یہ پروگرام درحقیقت اسرارالحق مجاز کو بہترین خراج عقیدت ہے جس کے انعقاد کے لیے سعید ہاشمی اور شہلا حق علیگ قابل مبارکباد ہیں۔ اپنے صدارتی کلمات میں طارق صدیقی نے کہا کہ ادب سماج اور شاعری کے میدان میں اسرارالحق مجاز کی گرانقدر خدمات ناقابل فراموش ہیں۔ روزنامہ 'صحافت' دہلی، 9 دسمبر 2022

غالبیات سے متعلق کتب کی نمائش

رامپور: بین الاقوامی شہرت یافتہ رامپور رضا لائبریری کے دربار ہال میں معروف شاعر مرزا اسداللہ خاں غالب کی یوم پیدائش کے موقعے پر غالبیات سے متعلق کتابوں کی 15 روزہ نمائش کا اہتمام کیا گیا۔ اس نمائش کا افتتاح ڈاکٹر الف ناظم معاون پروفیسر شعبہ اردو گورنمنٹ گرلز ڈگری کالج رامپور کے ذریعے کیا گیا۔ افتتاحی تقریب سے خطاب کرتے ہوئے ڈاکٹر الف ناظم نے کہا کہ غالب ایک آفاقی شاعر تھے۔ انھوں نے انسانیت کے ہر درد کو اپنی شاعری میں سمیٹا ہے۔ ان کی اہمیت ہر دور میں مسلم رہے گی۔ انھوں نے کہا کہ غالب کا رامپور سے گہرا رشتہ رہا ہے، وہ رامپور کے نوابوں کے وظیفہ خوار تھے اور نواب یوسف علی خاں ناظم کے شعری استاد بھی تھے۔ ان کی اصلاحات پر مشتمل دیوان ناظم رضا لائبریری کی زینت ہے۔ ڈاکٹر الف ناظم نے کہا کہ مجھے بڑی خوشی ہورہی ہے کہ لائبریری نے غالب سے متعلق اہم ذخیرہ کو ادبی دنیا میں متعارف کرانے کی سمت میں بڑی پہل کی ہے۔ اس موقعے پر سید طارق اظہر نے کہا کہ غالب نے اپنی شاعری میں زندگی کے ہر موضوع پر تسلی بخش کلام چھوڑا ہے اور سماج کا ہر طبقہ ان کے کلام سے محظوظ ہوتا ہے۔

روزنامہ 'ہندوستان ایکسپریس' دہلی، 29 دسمبر 2022

اردو ڈپلومہ کرنے والے طلبہ و طالبات میں سرٹیفکٹ تقسیم

مراد آباد: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے زیر اہتمام چلائے جانے والے یک سالہ ڈپلومہ اردو زبان سیشن 22-2021 پاس کرنے والے طلبہ و طالبات کو جی سی ٹی ایجوکیشنل سوسائٹی کے کسرول واقع اردو اسٹڈی سینٹر میں سرٹیفکٹس تقسیم کیے گئے۔ مہمان خصوصی انگلینڈ میں مقیم سماجی کارکن عابد صدیقی نے کہا کہ اردو بھائی چارے اور محبت کی زبان ہے، انھوں نے اردو پڑھنے اور سیکھنے پر زور دیا۔ مہمان ذی وقار سید آصف حسن نے کہا کہ اردو ایک شاندار زبان ہے، یہ ہمیں بزرگوں کا احترام سکھاتی ہے۔ سینٹر کی طالبات رہنما اور لائبہ، اے ایم یو کا ترانہ بھی پیش کیا۔ اول پوزیشن حاصل کرنے پر غانیہ پرویز اور ہادیہ کو مومنٹو دیا گیا۔ ان کے علاوہ معاشرے میں سماجی کام کرنے والوں کو بھی اعزاز سے نوازا گیا۔ تقریب کی صدارت معروف شاعر احمد مرادآبادی نے کی اور نظامت کے فرائض سینٹر کے انچارج شاہ ویز اقبال ایڈوکیٹ نے انجام دیے۔ اس موقعے پر گلشن جہاں، محمد تنظیم شاستری، شارف حسین، نشاں، معراج خالد، سید زبیر علی، سید قاری سہیل، دانش اکرم وغیرہ کے علاوہ طلبہ و طالبات کی کثیر تعداد موجود تھی۔ روزنامہ 'صحافت' دہلی، 12 دسمبر 2022

بہار

پروفیسر حسین الحق: تدریس، تصوف اور ادب

گیا: مولانا انوارالحق اردو لائبریری، ضلع گیا بہار کے زیر اہتمام معروف فکشن نگار اور دائرہ شاہ حضرت وصی الحق کے سابق سجادہ نشین پروفیسر حسین الحق کے یوم وفات کی مناسبت سے ایک ویبینار بعنوان 'پروفیسر حسین الحق: تدریس، تصوف اور ادب' کا انعقاد عمل میں آیا جس میں

متعدد اہم شخصیات نے شرکت کی۔ پروگرام کی صدارت مرزا غالب کالج، گیا کے سابق صدر شعبۂ انگریزی پروفیسر عین تابش نے کی جب کہ کلیدی خطبہ معروف فکشن نگار اور سابق چیف انکم ٹیکس کمشنر سید محمد اشرف، علی گڑھ نے پیش کیا۔ پروگرام کا باضابطہ آغاز حسین الحق کے بڑے صاحب زادے اور دائرہ شاہ حضرت وصی کے سجادہ نشین شاہ علی حق نے تعارفی کلمات پیش کر کے کیا جب کہ شافع انوارالحق نے پروفیسر حسین الحق کی شخصیت پر مختصراً روشنی ڈالی۔ سید محمد اشرف نے حسین الحق پر سیر حاصل گفتگو کرتے ہوئے کہا کہ حسین الحق کو بحیثیت مصنف، استاد، تنقید نگار، بحیثیت صوفی اور بحیثیت انسان ساری دنیا جانتی ہے۔ میرا اور ان کا ذاتی تعلق تھا۔ وہ صرف نام کے صوفی نہیں تھے، ان کے باطن کی جو فکر تھی اس کے اعتبار سے بھی صوفی تھے۔ 70 کے بعد لکھنے والوں میں کتنے چمکے اور ڈوب گئے، لیکن حسین الحق ان فنکاروں میں تھے جو شروع سے ہی اپنے قارئین کے لیے معروف بھی اور محبوب بھی تھے۔ انھوں نے مزید کہا کہ ان کی کہانیاں کلیات کی شکل میں منظر عام پر آنی چاہیے، یہ ان کے چھوٹوں کی ذمے داری ہے۔ اس موقعے پر اہم مقرر کنگ سعود یونیورسٹی، ریاض میں انگریزی کے استاذ پروفیسر سید سرور حسین نے ناول 'اماوس میں خواب' کے حوالے سے

پرمغز گفتگو کرتے ہوئے کہا کہ انھوں نے مجھے اماوس میں خواب کا انگریزی ترجمہ کرنے کا حکم دیا تھا جو اشاعت پذیر ہو چکا ہے۔ اماوس میں خواب میں اتنی کیفیات شامل ہیں کہ اس کے مطالعہ کے لیے قاری کا ذی علم ہونا بھی اشد ضروری ہے۔ آر بی گورنمنٹ بی جی کالج، اکبر پور، امبیڈکرنگر یوپی کے استاذ پروفیسر شاہد پرویز نے حسین الحق کی تصنیف 'تفہیم تصوف' کے تناظر میں گفتگو کرتے ہوئے کہا کہ اس کتاب میں تصوف کے فکری اور نظری زاویے سے بحث کی گئی ہے۔ پروفیسر عین تابش نے اپنے صدارتی خطاب میں کہا کہ مقررین کی گفتگو نے مجموعی طور پر پروفیسر حسین الحق کی شخصیت کے کمالات کو بحیثیت فکشن نگار، بحیثیت صوفی، بحیثیت نثرنگار اور بحیثیت انسان نمایاں کیا ہے۔ انھوں نے تمام شرکا کا شکریہ ادا کیا۔ پروگرام کی نظامت ڈاکٹر سید عینین علی حق دہلی نے کی۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 26 دسمبر 2022

مہاراشٹر

یک روزہ افسانچہ ورک شاپ

ناگپور: افسانچہ کسی کہانی کا اختصار نہیں ہے، یہ لطیفہ ہے، نہ کوئی انشائی جملہ اور نہ کسی واقعے کو مختصر بیان کر دینا ہے۔ افسانچے اقوالِ زرین بھی نہیں ہیں۔ افسانچہ نگاری

ایک الگ فن ہے۔ زندگی کے واقعات، لوگوں کے رویے، قدرت کی ستم ظریفی یا حالات کی عجیب و غریب کروٹیں ہمیں زندگی کا جو عجیب غریب روپ دکھاتی ہیں، افسانچہ انھیں فنکارانہ طور پر پیش کرتا ہے۔ معروف انشائیہ نگار محمد اسد اللہ نے افسانچہ ورک شاپ میں ان خیالات کا اظہار کیا۔

انجمن گرلز ڈگری کالج ناگپور کے شعبۂ اردو و فارسی کی جانب سے مورخہ یکم دسمبر 22 بروز جمعرات کو، کالج آڈی ٹوریم، واقع صدر ناگپور میں 'افسانچہ نگاری روایت و فن' کے موضوع پر یک روزہ افسانچہ ورک شاپ کا انعقاد عمل میں آیا جس کی صدارت کے فرائض اکیڈمک ایڈوائزر انجمن حامیِ اسلام، ناگپور، جناب حفظ الرحمٰن نے انجام دیے۔ اس کے بعد کالج اور یونیورسٹی کے ترانے بھی پیش کیے گئے۔ پرنسپل ڈاکٹر انجمن آرا نے مہمانوں کا استقبال کرتے ہوئے کہا کہ اس ورک شاپ کا مقصد شہر کے مختلف کالجوں میں تعلیم حاصل کرنے والی طالبات کو اصنافِ ادب سے روشناس کروانا ہے۔

اسی کالج کے سابق پرنسپل اور معروف افسانہ نگار ڈاکٹر اظہر حیات نے افسانہ نگاری کے فن پر روشنی ڈالتے ہوئے کہا کہ ادب میں اظہار کے مختلف پیانے مختلف زمانے میں مقبول رہے ہیں۔ داستان، ناول، افسانہ اور افسانچہ ہمیں زندگی کے مختلف رنگوں سے آشنا کرتے ہیں۔

ماہنامہ الفاظِ ہند کے مدیر، ریحان کوثر نے بتایا کہ انھوں نے سولفظوں کی کہانی کو اردو میں فروغ دینے کے لیے کوشش کی اور انھیں اس میں خاطر خواہ کامیابی ملی۔ ان کے رسالے الفاظِ ہند نے سولفظوں کی کہانی اور کرونا سے متعلق افسانچوں پر خصوصی نمبر شائع کیے اور آئندہ بھی اس صنف کے فروغ کے لیے ان کے رسالے کے دروازے کھلے رہیں گے۔ اس ورک شاپ کے دوسرے سیشن میں ناگپور اور کامٹی کے جن افسانہ نگاروں نے افسانچے پیش کیے ان میں ڈاکٹر اظہر حیات، جناب انیس احمد، ڈاکٹر محمد اسد اللہ، ریحان کوثر، ڈاکٹر اظہر ابرار، ڈاکٹر روحینہ کوثر، وغیرہ قابلِ ذکر ہیں۔ ورک شاپ کے آخری سیشن میں ڈگری کالج کی طالبات نے افسانچہ نگاری کے مقابلے میں شریک ہو کر افسانچے تحریر کیے۔ تقریب کی نظامت کے فرائض اس تقریب کی کنوینر اور آکاش وانی ناگپور کی معروف اناؤنسر ڈاکٹر ناہید خاں سوری نے انجام دیے اور رسم شکریہ ڈاکٹر شاہدہ پروین نے ادا کی۔ اس موقعے پر شہر ناگپور کے مختلف ڈگری کالجوں کی طالبات کے علاوہ شہر کی نامور ادبی شخصیات بھی موجود تھیں۔

پریس ریلیز: ڈاکٹر ناہید سوری، ناگپور، 8 دسمبر 2022

قاضی وجدی الحسینی کی شخصیت اور خدمات پر قومی اردو کونسل نئی دہلی کے ڈائرکٹر پروفیسر شیخ عقیل خطاب کرتے ہوئے

مدھیہ پردیش

قاضی وجدی الحسینی کی شخصیت اور خدمات

بھوپال: مولا برکت اللہ بھوپالی ایجوکیشن اینڈ سوشل سروس سوسائٹی بھوپال کے زیرِ اہتمام مجاہدِ آزادی، معروف دانشور، صاحبِ طرز شاعر و ادیب علامہ سید عابد علی وجدی الحسینی (مرحوم) سابق شہر قاضی بھوپال کی شخصیت اور ہمہ گیر علمی، دینی، قومی و ادبی خدمات پر دو روزہ قومی سمینار 10 اور 11 دسمبر 2022 کو برکت اللہ پبلک اسکول، گاندھی نگر بھوپال میں زیرِ صدارت جناب سید مشتاق علی ندوی قاضی شہر بھوپال منعقد ہوا۔ جس میں بطور مہمانِ خصوصی پروفیسر شیخ عقیل احمد ڈائریکٹر این سی پی یو ایل نئی دہلی اور پدم شری حکیم سید ظل الرحمٰن (علی گڑھ) نے اور بطور مہمانِ اعزازی مفتی ابوالکلام قاسمی، پروفیسر خالد محمود، فادر آنند، سردار گروچرن سنگھ، گیانی دلیپ سنگھ، شری شیلیندر شیلی، سید ساجد علی ایڈوکیٹ، شری راجندر کوٹھاری، پنڈت مہیندر شرما، پروفیسر محمد حسان خاں نے شریک ہو کر علامہ وجدی الحسینی کی شخصیت اور ہمہ گیر خدمات پر اظہارِ خیال کیا۔

اس موقعے پر مولانا برکت اللہ سوسائٹی کے روحِ رواں اور سرپرست حاجی محمد ہارون نے استقبالیہ تقریر میں سمینار کے اغراض و مقاصد پر روشنی ڈالتے ہوئے قاضی وجدی الحسینی مرحوم کے نام سے ہر سال ایوارڈ دیے جانے کا اعلان کیا اور کہا کہ قاضی وجدی الحسینی صاحب کے مطبوعہ مسودات تو بہت سارے ہیں جیسے 'ہندوستان اسلام کے سائے میں'، 'قطب مالوہ'، 'تاریخ ریاست بھوپال'، 'تاریخ قضاۃ ومفتیان بھوپال'، 'مولانا برکت اللہ بھوپالی'، 'بھوپال تحریکات آزادی کے آئینے میں'، 'خطبات: جمعہ وعیدین' وغیرہ۔ لیکن ان کے غیر مطبوعہ مسودات کی تعداد بھی بہت زیادہ ہے، اُنھوں نے غیر مطبوعہ مسودات کی اشاعت کا اعلان کیا۔

سمینار کے صدر حضرت مولانا سید مشتاق علی ندوی قاضی شہر بھوپال نے قاضی وجدی الحسینی مرحوم کی شخصیت وخدمات پر اظہارِ خیال کرتے ہوئے کہا کہ جو لوگ اداروں سے وابستہ ہوتے ہیں وہ اداروں کے نام سے فائدہ اُٹھاتے ہیں لیکن وجدی الحسینی صاحب نے اداروں کو اپنی ذات سے مستفید فرمایا اور خود کوئی فائدہ نہیں اُٹھایا۔

قومی کونسل برائے فروغِ اردو زبان نئی دہلی کے ڈائریکٹر پروفیسر شیخ عقیل احمد نے قاضی وجدی الحسینی مرحوم کی دینی، علمی و ادبی خدمات کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ قاضی صاحب وسیع المطالعہ ہونے کے سبب تقابلی مطالعے اور تجزیے کے ذریعے اپنے افکار و خیالات کا تحریری اور تقریری اظہار کرتے تھے۔ پروفیسر شیخ عقیل احمد نے قاضی صاحب مرحوم کی غیر مطبوعہ تحریروں اور تخلیقات کی اشاعت کے لیے اعلان کیا کہ این سی پی یو ایل انھیں شائع کرے گی۔ حکیم سید ظل الرحمٰن نے کہا کہ قاضی وجدی الحسینی مرحوم کی دو خصوصیات ایسی تھیں جو بہت کم علما میں دیکھنے کو ملتی ہیں، ایک ان کا عجز و انکسار اور دوسری ان کی خوش طبعی اور خوش مزاجی۔ وہ باغ و بہار شخصیت کے مالک تھے۔ سمینار کے افتتاحی اجلاس میں مذکورہ بالا مہمانان کے علاوہ مفتی محمد سعید اختر، ایس ایم حسین، پروفیسر طارق ظفر نے اظہارِ خیال کر کے قاضی وجدی الحسینی مرحوم کو خراجِ عقیدت پیش کیا۔ پروفیسر محمد نعمان خاں نے اپنے کلیدی خطبے میں قاضی وجدی الحسینی مرحوم کی ہمہ صفات شخصیت، خاندانی حالات، تعلیم و تربیت، مزاج و ماحول اور علمی، ادبی، شعری، دینی، قومی، ملّی اور انسانی خدمات پر سیر حاصل مواد پیش کیا۔

اس دو روزہ سمینار میں افتتاحی اور اختتامی اجلاس کے علاوہ دو ادبی اجلاس اور ایک نعتیہ مشاعرہ بھی منعقد ہوا، جس میں عمیر الصدیق ندوی (مدیر 'معارف' اعظم گڑھ)، عارف عزیز، بدر واسطی، ڈاکٹر سیفی سرونجی، ڈاکٹر رضیہ حامد، مولوی نعمت اللہ ندوی، ڈاکٹر اعظم، محترمہ رضیہ تنویر، مفتی عبدالرحیم قاسمی، ڈاکٹر عارف جنید ندوی، خالد محمد خاں، مہر الحسن، حافظ محمد خاں نے اپنے مقالات پیش کیے۔

سمینار کے پہلے اجلاس کی صدارت کے فرائض جناب اقبال مسعود اور دوسرے اجلاس کی صدارت پروفیسر خالد محمود نے انجام دیے۔ افتتاحی اجلاس کی نظامت محمد کلیم ہارون نے اور دیگر اجلاسوں کی صدارت بدر واسطی اور عارف جنید ندوی نے کی۔ اس دو روزہ سمینار میں جناب عارف عزیز، جناب نعمت اللہ ندوی، محترمہ نفیسہ سلطانہ انا اور خالد محمد خاں کی کتابوں کی رسمِ رونمائی انجام دی گئی۔

نعتیہ مشاعرے کی صدارت جناب ظفر صہبائی نے کی اور مہمانِ خصوصی کی حیثیت سے پروفیسر خالد محمود اور

شعبۂ اردو اسلام پور کالج میں 22 دسمبر کو منعقدہ توسیعی خطبہ 'اردو میں کیریئر کے امکانات' پر اظہار خیال کرتے ہوئے

ڈاکٹر اعظم نے شرکت کی، جن شعرا نے اپنے نعتیہ کلام سے سامعین کو محظوظ کیا ان میں جناب خالد محمود، اقبال مسعود، بدر واسطی، ڈاکٹر اعظم، پروفیسر اقتدار افسر، پروین کیف، شعیب علی خاں، پروین صبا، نفیسہ سلطانہ انا، شاہد شرقی خالدی کے اسمائے گرامی شامل ہیں۔ نظامت شعیب علی خاں نے کی اور پروفیسر محمد نعمان خاں، محمد کلیم ہارون، مہر الحسن، محمد عمران ہارون نے مختلف اجلاسوں میں مہمانان اور سامعین کا شکریہ ادا کیا۔

اس سمینار میں دہلی، مہاراشٹر، مدھیہ پردیش، اعظم گڑھ، علی گڑھ اور سرونج کے شعرا و ادبا اور باذوق سامعین نے بڑی تعداد میں شرکت کر کے سمینار کو یادگار بنا دیا۔

پریس ریلیز: برکت اللہ سوسائٹی، بھوپال، مدھیہ پردیش، 18 دسمبر 2022

مغربی بنگال

اردو میں کیریئر کے امکانات

اسلام پور: شعبۂ اردو اسلام پور کالج میں 22 دسمبر 2022 کو ایک توسیعی خطبے کا اہتمام کیا گیا جس میں جامعہ ملیہ اسلامیہ نئی دہلی کے استاد ڈاکٹر خالد مبشر نے اردو میں کیریئر کے امکانات پر اظہار خیال کیا۔ انھوں نے اپنے خطاب میں کہا کہ کیریئر کے لیے اسی میدان کو چننا چاہیے جس میں آپ کی دلچسپی ہو۔ کوئی بھی موضوع اچھا یا برا نہیں ہوتا۔ آپ کی وابستگی اور لگن اس کو اچھا یا برا بناتی ہے۔ انھوں نے اردو زبان کی اہمیت پر روشنی ڈالتے ہوئے کہا کہ اردو زبان کی سب سے بڑی طاقت اس کا صوتیاتی نظام ہے۔ دنیا کی اکثر زبانوں کی آوازوں کو اس نے اپنے اندر سمیٹ کر رکھا ہے۔ اردو والا کوئی بھی زبان آسانی سے سیکھ سکتا ہے۔ انھوں نے مزید کہا کہ اردو ہی وہ واحد زبان ہے جو ہندوستان اور اس کے پڑوسی ملکوں میں رابطے کی زبان بننے کی صلاحیت رکھتی ہے۔ اردو رسم الخط کی اہمیت پر روشنی ڈالتے ہوئے انھوں نے کہا کہ اردو رسم الخط کی وجہ سے اردو والے بہت سی عالمی زبانوں سے جڑ جاتے ہیں۔ اردو میں کیریئر کے حوالے سے انھوں نے کہا کہ اردو والے صرف درس و تدریس ہی نہیں بلکہ کسی بھی شعبے میں اپنا کیریئر بنا سکتے ہیں۔ اس موقعے پر علاقہ کے مشہور شاعر جہانگیر نایاب نے اپنا کلام پیش کیا۔ پروگرام کے افتتاحی خطاب میں شعبہ کے استاد ڈاکٹر عزیر احمد نے کہا کہ عام طور پر لوگ انجینئرنگ اور میڈیکل میں ہی اپنا کیریئر بنانا چاہتے ہیں لیکن کیریئر صرف انھی میدان میں نہیں ہے۔ زبان کو بھی کیریئر کے طور پر منتخب کیا جا سکتا ہے۔

روزنامہ 'سیاسی تقدیر'، دہلی، 23 دسمبر 2022

اعزاز و اکرام

ساہتیہ اکادمی ایوارڈ

نئی دہلی: ساہتیہ اکادمی کی جانب سے ساہتیہ اکادمی ایوارڈ 2022 کا اعلان رابندر بھون میں منعقدہ پریس کانفرنس کے دوران اکادمی کے سکریٹری ڈاکٹر کے سری نواس راؤ نے کیا، اس دوران ساہتیہ اکادمی ترجمہ ایوارڈ 2022 کا اعلان 17 زبانوں کے لیے کیا گیا۔ اس موقعے پر ڈاکٹر کے سرینواس راؤ نے پریس کانفرنس سے خطاب کرتے ہوئے کہا کہ ساہتیہ اکادمی ایوارڈ 2022 کا اعلان 23 ہندوستانی زبانوں کے لیے کیا گیا ہے، جن میں 7 شعری مجموعے، 6 ناول، 2 کہانی کے مجموعے، 2 ادبی تنقید، 3 ڈرامے، ایک

انیس اشفاق

رینو بہل

سوانحی مضمون، ایک مختصر ادبی تاریخ کی کتاب اور ایک مضامین کا مجموعہ شامل ہے۔ انھوں نے بتایا کہ مذکورہ ایوارڈز کی سفارش 23 ہندوستانی زبانوں کی جیوری کمیٹی نے کی تھی اور ساہتیہ اکادمی کے صدر ڈاکٹر چندر شیکھر کمبر کی صدارت میں منعقد اکادمی کے ایگزیکٹو بورڈ کی میٹنگ میں ان کی منظوری دی گئی۔ ڈاکٹر کے سرینواس راؤ نے بتایا کہ زبان اردو کے لیے انیس اشفاق کو ناول 'خواب سراب' کے لیے ایوارڈ سے نوازا گیا ہے، اس کے علاوہ ہندی کے لیے بدری نارائن، انگلش کے لیے انورادھا رائے، کشمیری کے لیے فاروق فیاض، آسامی کے لیے منوج کمار گوسوامی، بوڈو کے لیے رشمی چودھری، ڈوگری کے لیے وینا گپتا، پنجابی کے لیے سکھ جیت، گجراتی کے لیے غلام محمد شیخ، میتھلی کے لیے اجیت آزاد، راجستھانی کے لیے

کے لیے کمل رانگا کے نام شامل ہیں۔ ڈاکٹر کے سرینواس نے بتایا کہ یہ انعامات 11 مارچ 2023 کو نئی دہلی کے کمانی آڈیٹوریم میں تقسیم کیے جائیں گے۔ یہ ایوارڈ بطور انعام ایک لاکھ روپے، تمغہ، توصیفی سند پر مشتمل ہے۔ انھوں نے بتایا کہ ساہتیہ اکادمی ایوارڈ 2022 کے علاوہ آج 17 زبانوں میں ترجمہ ایوارڈ کا اعلان کیا گیا، جس میں اردو کے لیے رینو بہل، کشمیری کے لیے شبنم تغامی، پنجابی کے لیے بھوپیندر کور پریتی، انگلش کے لیے این کلیان رمن کا نام شامل ہے۔ بنگالی، ہندی، کونکنی، میتھلی، منی پوری، اوڈیا اور سنتھالی زبانوں کے ترجمے کے ایوارڈز کا اعلان بعد میں کیا جائے گا۔ آج ہی ڈاکٹر ادے ناتھ جھا کو مشرقی خطے کے کلاسیکی اور قرون وسطیٰ کے ادب میں ان کی گراں قدر خدمات کے لیے سال 2022 کے لیے ساہتیہ اکادمی بھاشا سمان ایوارڈ کے لیے منظوری بھی دی گئی ہے۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 23 دسمبر 2022

ساہتیہ اکادمی ایوارڈ برائے نوجوان قلمکار 2022

نئی دھلی: ساہتیہ اکادمی کی جانب سے 'ساہتیہ اکادمی ایوارڈ برائے نوجوان قلمکار 2022' کی ایوارڈ تقسیم تقریب تروینی کلا سنگم، تان سین مارگ، نئی دہلی میں منعقد ہوئی، جس میں 24 ہندوستانی زبانوں کے ممتاز نوجوان قلمکاروں کو ایوارڈ دیا گیا۔ یہ ساہتیہ اکادمی کے نائب صدر مادھو کوشک اور مہمان خصوصی ممتاز ادیب ممتا کالیا نے پیش کیے۔ انعام یافتگان کو بطور انعام ایک تمغہ، توصیفی سند اور مبلغ 50 ہزار روپے کی رقم سے نوازا گیا ہے۔ اس موقعے پر اکادمی کے سکریٹری ڈاکٹر کے سرینواس راؤ نے مہمان کا خیر مقدم کرتے ہوئے کہا کہ نوجوان معاشرے کو متحرک رکھنے میں اہم کردار ادا کرتے ہیں جو تبدیلی کی علامت ہیں، اس لیے مستقبل کے تناور درختوں کی طرح ان کی حوصلہ افزائی اور حفاظت کرنا ہمارا فرض ہے۔ ساہتیہ اکادمی کے نائب صدر مادھو کوشک نے اپنے صدارتی خطاب میں کہا کہ آج کے ایوارڈ یافتہ نوجوان مصنفین ایک نئے ہندوستانی ماحول کو تشکیل دے رہے ہیں، جس میں زبان کی مجبوری اب کوئی اہم عنصر نہیں ہے۔ نئی نسل کے پاس اظہار کے بہت سے نئے ذرائع ہیں اور وہ اب بہت سے ذرائع کا استعمال کر کے اپنی تخلیقات پیش کر رہے ہیں۔ ممتا کالیا نے مہمان خصوصی کی حیثیت سے اپنے خطاب میں کہا کہ آج کا نوجوان واقعی نوجوان ہے اور اس کی آئیڈیاز سے لے کر تمام معلومات تک رسائی ہے۔ اس کی تحریر امید سے بھری ہوئی ہے۔ ساہتیہ اکادمی ایوارڈ برائے نوجوان قلمکار 2022 میں اردو کے لیے مقصود آفاق کو ان کے شعری مجموعہ 'گریہ' کے لیے نوازا گیا ہے جب کہ پردومن کمار گوگوئی (آسامی)، سمن پتاری (بنگالی)، المبار موساہاری (بوڈو)، آشو شرما (ڈوگری)، مہرو تس (انگریزی)، بھرت کھینی (گجراتی)، بھگونت انمول (ہندی)، دادی پیر جیمن (کنڑ)، شائستہ خان (کشمیری)، مائرن جیسن باریٹو (کونکنی)، نوکرشن ایہک (میتھلی)، انگھا جے کولاتھ (ملیالم)، سونیا کھندر کپم (منی پوری)، روشن رائے 'چوٹ' (نیپالی)، دلیپ بیہرا (اڑیہ)، سندھو گگن (پنجابی)، آشیش پروہت (راجستھانی)، شروتی کنکر (سنسکرت)، سالگے ہانسدا (سنتھالی)، حنا آسوانی (سندھی)، پی۔ کالی موتھو (تمل)، پلی پٹوناگ راجو (تیلگو)، پون نالٹ (مراٹھی) کو بھی ایوارڈ سے نوازا گیا ہے۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 28 دسمبر 2022

ایک شام اقبال درانی کے نام

نئی دھلی: شعر و شاعری اور نثری ادب انسانوں کے جذبات و احساسات کی ترجمانی کا بہترین ذریعہ ہیں اور مشہور شاعر، ہدایت کار اور کہانی کار اقبال درانی نے اپنے قلم کے ذریعے اس طرح کے جذبات و احساسات کا اظہار کیا ہے۔ یہ بات مولانا اعجاز عرفی قاسمی نے عالمی فاؤنڈیشن کے زیر اہتمام منعقدہ 'ایک شام اقبال درانی کے نام' کی صدارت کرتے ہوئے کہی۔ انھوں نے کہا کہ اقبال درانی نے فلموں کو ہی رونق نہیں بخشی ہے بلکہ اردو ادب کے خزانے کو بھی مالا مال کیا ہے۔ انھوں نے کہا کہ شاعر سماج کا عکاس ہوتا ہے اور وہ سماج کی برائیوں اور اچھائیوں کو خوبصورت پیرائے میں پرو کر قارئین کے سامنے پیش کرتا ہے اور اس طرح وہ سماج میں موجود خرابیوں پر کاری ضرب لگاتا ہے۔ نظامت کرتے ہوئے شاعر حامد علی اختر نے کہا کہ اقبال درانی نے جہاں مشہور فلم اسٹار اجے دیوگن کو پھول اور کانٹے سے لانچ کیا وہیں شاہ رخ پر بھی فلم بنائی اور مشہور شاعر راحت اندوری سے نغمہ لکھوا کر فلمی دنیا میں قدم رکھوایا۔ مشہور ادیب اور نقاد حقانی القاسمی نے اقبال درانی کے ادبی پہلو پر روشنی ڈالتے ہوئے کہا کہ ان کی خصوصیت یہ ہے کہ انھوں نے فلم کے ساتھ ادب کے ساتھ بھی انصاف کیا ہے اور ان کی شاعری میں معاشرے کی پوری جھلک نظر آتی ہے۔ انھوں نے کہا کہ وہ بیک وقت شاعر، فلمی کہانی کار، مکالمہ نگار اور ہدایت کار بھی ہیں۔ عالمی فاؤنڈیشن کے صدر عبدالباری نے مہمانوں کا استقبال کرتے ہوئے شرکا کا صمیم قلب سے شکریہ ادا کیا۔ پروگرام کے ساتھ شعری مجلس بھی منعقد کی گئی جس میں وحید عازم، ڈاکٹر قاسم امام، اسلم حسن، شعیب رضا وارثی، ڈاکٹر ایم آر قاسمی، اے جے عکس، فیض احمد فیض، معین قریشی، شارق اعجاز عباسی اور ریتا ادا نے کلام پیش کیا۔

روزنامہ 'صحافت' دہلی، 21 دسمبر 2022

رشید قاسمی

جلگاؤں: علاقہ خاندیش کے معروف افسانہ نگار و صحافی جناب رشید قاسمی کے اعزاز میں مراٹھی پترکار بھون میں

ایک عظیم الشان تقریب کا انعقاد مجروح اکیڈمی کے زیر اہتمام کیا گیا جس کی صدارت اقرا ایجوکیشن سوسائٹی کے صدر عبدالکریم سالار نے کی۔ اس موقع پر رشید قاسمی کو مجروح ایوارڈ سے نوازا گیا جو ایک یادگار، شال اور گلدستہ پر مشتمل تھا۔ مجروح اکیڈمی کے صدر ڈاکٹر شفیق ناظم نے افتتاحی کلمات ادا کرتے ہوئے کہا کہ ایوارڈ جن لوگوں کے ہاتھوں میں پہنچ کر معتبر ہوجاتا ہے ایسی ہی شخصیات میں قاسمی صاحب کا شمار ہوتا ہے۔

صحافی و افسانہ نگار مشتاق کریمی نے کہا کہ رشید قاسمی صاحب نے مقدار کو نہیں بلکہ ہمیشہ معیار کو ترجیح دی۔ ڈاکٹر ایاز شاہ نے کہا کہ ہم رشید قاسمی سے فیضیاب ہوتے رہے ہیں۔ آپ نے نئے قلمکاروں کی حوصلہ افزائی اور رہنمائی کو زندگی کا مشن بنایا ہے۔ منیار برادری کے صدر فاروق شیخ کے ہاتھوں صاحب اعزاز کو مجروح ایوارڈ سے سرفراز کیا گیا۔ مفتی محمد ہارون ندوی، اعجاز ملک اور انیس کیفی نے بھی صاحب اعزاز کی خصوصیات کا بھرپور تذکرہ کیا. مجروح ایوارڈ یافتہ قلمکار نے کہا کہ میں نے ایسا کوئی بڑا کارنامہ سرانجام نہیں دیا ہے ہاں مگر زبان و ادب کی مقدور بھر خدمت ضرور کی ہے۔ اس دن کو انھوں نے اپنی زندگی کا یادگار دن قرار دیا۔ ڈاکٹر عبدالکریم سالار نے کہا کہ بھیڑ میں اپنی الگ راہ بنانا ہر کس و ناکس کے بس کی بات نہیں ہے۔ قاضی ضمیر اشرف، رشید پنجاری، ڈاکٹر اسلم شیخ اور ڈاکٹر شفیق ناظم نے مہمانان کا استقبال کیا۔ مائل پالدھوی نے اپنی شعر آمیز نظامت سے سے داد بٹوری۔ ضلع بھر کے قلمکاروں نے اس تقریب میں شرکت کی۔

پریس ریلیز: ریحان کریمی، جلگاؤں، 13 دسمبر 2022

کشمیری زبان کے پانچ سرکردہ قلمکاروں کو اعزازات

علی گڑھ: علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں 'اکیسویں صدی میں کشمیری نثری ادب' موضوع کے تحت کشمیری سیکشن شعبۂ ماڈرن انڈین لنگویجز کے اہتمام سے دو روزہ قومی سمینار کے دوران کشمیری ادب وثقافت کی گراں قدر خدمات انجام دینے والے پانچ سرکردہ ادیبوں اور قلمکاروں کو اعزازات سے نوازا گیا۔ یہ اعزازات انھیں انجمن فکروثقافت علی گڑھ کی جانب سے عطا کیے گئے۔ اعزاز حاصل کرنے والوں میں پروفیسر گلشن مجید، شمشاد کرالی واری، عبدالخالق شمس، گلشن بدرنی، اور خالق پرویز شامل ہیں۔ تقریب میں انجمنِ فکرو فن علی گڑھ کے صدر پروفیسر ضیاء الرحمان صدیقی، نائب صدر ڈاکٹر وسیم مشتاق وانی اور انجمن کے جنرل سکریٹری پروفیسر مشتاق احمد موجود تھے جنھوں نے اعزازات حاصل کرنے والی شخصیات کے ادبی اور ثقافتی کارناموں پر تفصیلی بات کی۔ پروفیسر گلشن مجید کو یہ اعزاز علمی، ادبی اور فکشن تخلیقات میں ایک نئی روح پھونکنے کے اعتراف میں دیا گیا۔ معروف براڈ کاسٹر شمشاد کرالہ واری کو ان کی ترجمہ نگاری، تحقیق اور عوام میں کشمیری زبان مقبول بنانے کے اعتراف میں دیا گیا۔ بسیار نویس ادیب اور شاعر عبدالخالق شمس کو تواریخ اور تحقیق کے شعبے میں نمایاں اضافہ کرنے کے اعتراف میں دیا گیا۔ معروف ادیب، شاعر اور تھیٹرسٹ گلشن بدرنی کو یہ اعزاز ادبی اور ثقافتی سرگرمیوں کو عروج دینے کے اعتراف میں دیا گیا۔ جب کہ خالد پرویز کو اردو نثر میں گراں قدر خدمت انجام دینے پر یہ اعزاز دیا گیا۔ یاد رہے کہ یہ اعزازات علی گڑھ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں 'اکیسویں صدی میں کشمیری نثری ادب' موضوع کے تحت منعقدہ قومی سمینار کے دوران تقسیم کیے گئے جس کا اہتمام کشمیری سیکشن شعبۂ ماڈرن انڈین لنگویجز نے کیا تھا۔

پریس ریلیز: ڈاکٹر محمد ادریس، 8 دسمبر 2022

مولانا محمد علی جوہر سالانہ ایوارڈ تقسیم

نئی دھلی: مولانا محمد علی جوہر ہمہ گیر شخصیت کے مالک تھے، وہ نہ صرف ایک صحافی تھے بلکہ ایک عظیم مجاہد آزادی تھے۔ مولانا کا سب سے اہم کارنامہ یہ بھی ہے کہ وہ جامعہ ملیہ اسلامیہ کے بانیوں میں سے تھے جس کا شمار دنیا کی بہترین یونیورسٹی میں ہوتا ہے۔ ان خیالات کا اظہار تسمیہ آڈیٹوریم جامعہ نگر اوکھلا میں مولانا محمد علی جوہر اکیڈمی رجسٹرڈ کی جانب سے جنگ آزادی کے عظیم قائد مولانا محمد علی جوہر کے یوم پیدائش کے موقعے پر 34 ویں مولانا محمد علی جوہر سالانہ ایوارڈ فنکشن میں مقررین نے کیا۔ اس موقعے پر جوہر اکیڈمی کے صدر پروفیسر خواجہ محمد شاہد نے خیر مقدمی کلمات ادا کرتے ہوئے کہا کہ ایم سلیم مرحوم نے مولانا محمد علی جوہر اکیڈمی کی صورت میں جو پودا لگایا تھا وہ پھل پھول رہا ہے۔ انھوں نے مولانا محمد علی جوہر کو خراج عقیدت پیش کرتے ہوئے کہا کہ مولانا ہمہ جہت شخصیت کے مالک تھے۔ ایک عظیم مجاہد آزادی جس نے ملک کی آزادی کے لیے جان کی بازی لگا دی۔ اس موقعے پر تقریر کرتے ہوئے مولانا محمد علی جوہر اکیڈمی کے سرپرست اور اس پروگرام کے صدر ڈاکٹر سید فاروق نے اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ مولانا محمد علی جوہر کے اندر جو جوہر پیدا ہوا وہ ان کی والدہ کی دین ہے جن کی پرورش نے مولانا کو جوہر بنا دیا۔ اس موقعے پر مہمان خصوصی صبور صدیقی، اور ایوارڈ یافتگان نے بھی اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ آخر میں مولانا محمد علی جوہر اکیڈمی کے جنرل سکریٹری احمد ندیم نے حاضرین کا شکریہ ادا کیا۔ جن اہم شخصیات کو ایوارڈ سے نوازا گیا ان میں پروفیسر افتخار عالم خان، سابق صدر شعبہ میسیولوجی علی گڑھ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ، پروفیسر اروند انصاری شعبہ سوشولوجی جامعہ ملیہ اسلامیہ، سلمان جعفری (مینیجنگ ڈائرکٹر نیو ملینیم لمیٹڈ)، بزنس اینڈ ایمپلائمنٹ بیورو (ہمدرد فاؤنڈیشن) شامل ہیں۔ اس کے علاوہ نواں ایم سلیم ایوارڈ سینئر صحافی اسد مرزا کو پیش کیا گیا۔

روزنامہ 'میرا وطن' دہلی، 11 دسمبر 2022

اودھ رتن ایوارڈ کی تقریب

لکھنؤ: سنگم فاؤنڈیشن کی جانب سے مختلف میدانوں میں نمایاں خدمات انجام دینے والی ملک کی سرکردہ شخصیات

کو کیفی اعظمی اکیڈمی، نشاط گنج میں منعقد ایک پروقار تقریب میں اودھ رتن ایوارڈ سے سرفراز کیا گیا۔ تقریب کے آرگنائزر پروفیسر سید شفیق احمد اشرفی نے سنگم فاؤنڈیشن کا تعارف کراتے ہوئے کہا کہ اودھ رتن ایوارڈ 2014 سے دیا جارہا ہے، ایوارڈ کے لیے ناموں کا انتخاب جیوری کے ذریعہ بہت غور وفکر کے بعد کیا جاتا ہے۔ جو لوگ جس میدان میں کارہائے نمایاں انجام دیتے ہیں ان کا انتخاب اس کے تحت کیا جاتا ہے۔ ناظم تقریب پروفیسر ثوبان سعید نے سنگم فاؤنڈیشن کی رپورٹ پیش کی اور کہا کہ کرونا کی وبا کے باعث یہ سلسلہ کچھ دنوں کے لئے منقطع ہوگیا تھا، اب نئے سرے سے یہ سلسلہ شروع کیا گیا ہے، اس بار ایک ساتھ 2019 اور 2020 کے ایوارڈ دیئے جارہے ہیں۔

'مولانا سید نعیم اشرف اودھ رتن ایوارڈ برائے سماجی خدمات' جناب اطہر نبی (2019)، 'سید امتیاز احمد اشرفی اودھ رتن ایوارڈ برائے صحافت' جناب معصوم مرادآبادی (2019)، 'سید منظور احمد اشرفی اودھ رتن ایوارڈ برائے فکشن' جناب محسن خان (2020)، 'ملک زادہ منظور احمد اودھ رتن ایوارڈ برائے مجموعی خدمات' پروفیسر ابن کنول (2019)، اور پروفیسر سراج اجملی (2020)، 'احتشام حسین اودھ رتن ایوارڈ برائے اردو تنقید'، پروفیسر احمد محفوظ (2019)، اور پروفیسر طارق سعید (2020)، 'ملک محمد جائسی اودھ رتن ایوارڈ برائے ہندی/اودھی' پروفیسر فخر عالم (2019) اور ڈاکٹر رشید اشرف خاں (2020) نوجوان قلم کار اودھ رتن ایوارڈ ڈاکٹر محمد اکمل (2019) اور ڈاکٹر ہارون رشید (2020) کو دیے گئے۔

تقریب کی صدارت پروفیسر شارب ردولوی نے فرمائی، انھوں نے اپنے خطاب میں کہا کہ اس طرح کے ایوارڈ دراصل ایک اعتراف ہوتے ہیں، اور یہ کام کیا جانا چاہیے تاکہ نسل نو اس کی روشنی میں مستقبل کے امکانات کو روشن کرسکے۔ مہمان خصوصی پروفیسر خواجہ اکرام الدین نے ایوارڈ یافتگان کو مبارکباد پیش کرتے ہوئے سنگم کے ذمے داروں کی تعریف کی اور کہا کہ اس قسم کے انعامات سے ادیب اور دانشور طبقے کی حوصلہ افزائی ہوتی ہے۔ مہمان ذی وقار مولانا خالد رشید فرنگی محلی نے اپنے خطاب کے دوران کہا کہ سنگم نے بہت بروقت ایوارڈ کی تقسیم کا سلسلہ شروع کیا تھا جب صحیح معنوں میں اس کی ضرورت کا احساس دوچند ہوگیا تھا۔ اس تقریب میں وزیر مملکت

برائے اقلیتی امور واوقاف جناب دانش آزاد انصاری نے شرکت فرمائی اور کہا کہ ہمیں زبان وادب کی خدمت کے لیے مل جل کر آگے بڑھنا ہے۔ یہ زبان ہی کی طاقت ہے جو معاشرے کے بکھراؤ کو روکنے میں اپنا کردار ادا کرسکتی ہے۔ انھوں نے ایوارڈ یافتگان کو مبارک باد پیش کرتے ہوئے ملک وقوم کی ترقی کے لیے مزید محنت اور فعالیت پر زور دیا۔ مہمان ذی وقار جناب سید صلاح الدین (دبئی) نے یہ تجویز رکھی کہ مستقبل میں جن ناموں سے ایوارڈ دیے جارہے ہیں، ان پر سمینار منعقد کراتے ہوئے نسل نو کو ان سے واقف کرانے کی ضرورت ہے، جبھی صحیح معنوں میں اس قسم کی تقریبات کا مقصد پورا ہوسکے گا۔

پریس ریلیز: پروفیسر ابن کنول، دہلی، 30 دسمبر 2022

ثروت خان

جودھپور: ہندوستان کے بین الاقوامی شہرت یافتہ ناول نگار اور افسانہ نگار ڈاکٹر ثروت خان کو راجستھان کے اے ڈی راہی ایوارڈ 2022 سے نوازا جائے گا۔ ادبی

ادارہ تہذیب جودھپور کی تین رکنی جیوری نے اپنا فیصلہ دیتے ہوئے مشہور شاعر اے ڈی راہی کے یوم پیدائش کے موقعے پر اے ڈی راہی 2022 ایوارڈ مشہور ومعروف ناول نگار اور افسانہ نگار ڈاکٹر ثروت خان کے ناول 'کڑوے کریلے' کو دینے کا اعلان کیا۔ اب تک ثروت خان کی کئی کتابیں شائع ہوچکی ہیں جنھیں ادبی حلقوں میں بہت شہرت حاصل ہوئی ہے۔ ان کی پانچ کتابیں مختلف یونیورسٹیوں کے نصاب میں شامل ہیں۔ سنہ 2004 میں افسانوی مجموعہ ذروں کی حرارت شائع ہوا۔ 2005 میں ان کا مشہور و معروف ناول اندھیرا پگ، منظر عام پر آیا اور بہت مقبول ہوا۔ وہ عصری مسائل پر لکھتی ہیں۔ انھوں نے راجستھان کی تہذیب وثقافت کو خاص طور سے اپنے فکشن کا حصہ بنا کر اردو ادب میں متعارف کروایا ہے۔ ثروت خان کو مختلف اداروں کی جانب سے 10 ایوارڈز سے نوازا جاچکا ہے۔

روزنامہ 'قومی بھارت' دہلی، 3 جنوری 2023

رسم اجرا

خطباتِ مجاہد ملت، نقوش مجاہد ملت، مجاہد ملت: سیرت وکارنامے

نئی دھلی: صد سالہ تقریبات کے تحت جمعیۃ علماء ہند کے زیر اہتمام مدنی ہال صدر دفتر جمعیۃ علماء ہند میں جمعیۃ کے سابق صدر حضرت مولانا فخر الدین احمد مرادآبادی اور حضرت مولانا حفظ الرحمٰن سیوہاروی سابق ناظم عمومی جمعیۃ علماء ہند کی خدمات وقربانیوں پر دو روزہ سمینار کی تیسری نشست میں تین اہم کتابوں کا اجرا عمل میں آیا۔ ان میں ایک کتاب 'خطبات مجاہد ملت' اور 'نقوش مجاہد ملت' (دو جلد) مرتب مفتی محمد عفان منصور پوری، اسی طرح فاروق ارگلی کی کتاب مجاہد ملت حضرت مولانا حفظ الرحمٰن سیوہاروی سیرت وکارنامے کی رسم اجرا عمل میں آئی۔ یہ ساری کتابیں صدر جمعیۃ علماء ہند مولانا محمود اسعد مدنی کی نگرانی میں جمعیۃ نے شائع کی ہیں۔ ان کتابوں کی رسم اجرا مولانا مفتی ابوالقاسم نعمانی، مہتمم دارالعلوم دیوبند، مولانا سید ارشد مدنی صدر جمعیۃ علماء ہند، مولانا محمود اسعد مدنی صدر جمعیۃ علماء ہند، مولانا محمد سلمان بجنوری نائب صدر جمعیۃ علماء ہند، ڈاکٹر سعود عالم قاسمی علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، پروفیسر شریف حسین قاسمی، مولانا مفتی سید محمد سلمان منصور پوری، مولانا بدرالدین اجمل قاسمی صدر جمعیۃ علماء آسام، ناظم عمومی جمعیۃ علماء ہند مولانا حکیم الدین قاسمی، فاروق ارگلی، مفتی محمد عفان منصور پوری وغیرہ کے ہاتھوں عمل میں آئی۔

روزنامہ 'ہمارا سماج' دہلی، 23 دسمبر 2022

دربھنگہ ٹائمز

نئی دھلی: خالد جاوید اردو ہی نہیں بلکہ دیگر بڑی زبانوں میں بھی قدر کی نگاہ سے دیکھے جاتے ہیں۔ یہ ان

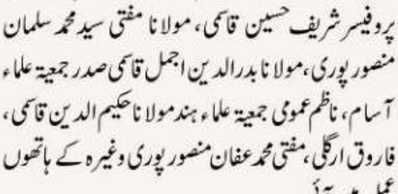

کے متن کی قوت ہی ہے کہ ان کی تخلیق فرانسیسی، انگریزی اور ہندی وغیرہ میں بھی اپنی عظمت قائم کرچکی ہے۔ ان خیالات کا اظہار 'گوشۂ خالد جاوید پر مشتمل سہ ماہی دربھنگہ ٹائمز (اکتوبر تا دسمبر 2022) کا اجرا کرتے ہوئے معروف نقاد پروفیسر کوثر مظہری نے کیا۔ پروفیسر ندیم احمد نے کہا کہ مجھے فخر ہے کہ میں خالد جاوید کا رفیقِ کار ہوں اور مجھے اس بات کی بھی خوشی ہے کہ میرے وطن دربھنگہ نے خالد جاوید کی پذیرائی کی۔

مشہور ادیب وشاعر خورشید حیات نے کہا کہ خالد جاوید نے اردو فکشن کو نئی جہتوں سے آشنا کیا۔ خصوصاً ان کا بیانیہ اردو فکشن کی تاریخ میں بیش قیمت اضافہ ہے۔ مشہور افسانہ نگار عشرت ظہیر نے کہا کہ خالد جاوید جیسے پیچیدہ تخلیقی ذہن کو منصور خوشتر نے ان کے شایانِ شان خراج پیش کیا ہے۔ مشہور ادیب وشاعر ڈاکٹر خالد مبشر نے منصور خوشتر اور خالد جاوید کو مبارک باد پیش کرتے ہوئے کہا کہ خالد جاوید کا جو تخلیقی چہرہ دنیا کے سامنے ہے، اسی کا ایک نہایت توانا اظہار ان کے کلاس روم میں اس وقت ہوتا ہے، جب دورانِ لیکچر کلاس روم کی پوری فضا وجودیت کے فلسفے میں سرشار ہوجاتی ہے۔ اس موقع پر اقبال حسین، آصفہ زینب، نعیم فاطمہ، طارق الزماں، فیضان الحق، ذیشان مصطفی، عبدالرحمٰن، منزہ قیوم، عامر مظفر بٹ اور اطہر محبوب سمیت بڑی تعداد میں ریسرچ اسکالرز اور طلبہ وطالبات بھی موجود تھے۔

پریس ریلیز: منصور خوشتر، بیورو چیف، قومی تنظیم دربھنگہ، 18 دسمبر 2022

اردو اور اس کے آنگن کی دلچسپ کہانیاں

نئی دھلی: جامعہ ملیہ اسلامیہ کے شعبۂ تاریخ میں اسسٹنٹ پروفیسر ڈاکٹر رحما جاوید راشد کے ہاتھوں دہلی میں منعقدہ پروگرام میں دہلی کی تاریخ اور اردو کے سفر پر کتاب کا اجرا عمل میں آیا۔ ڈاکٹر رحما جاوید نے اس دوران کتاب کی اہمیت پر روشنی ڈالتے ہوئے کہا کہ یہ کتاب طالب علم نوکری پیشہ، گھریلو خاتون یا بزرگ شہری سبھی کو ذہن میں رکھ کر تحریر کی گئی ہے۔ 'اردو اور اس کے آنگن کی دلچسپ کہانیاں' کتاب کو دلی کے صحافی رضا الٰہی نے ماضی کی کچھ دلچسپ کہانیوں کے ساتھ ساتھ اردو کے سفر کے ساتھ عمدہ انداز میں پیش کیا ہے۔ اس میں قارئین کو تاریخ کے علاوہ، اردو نثر ونظم، کہانیوں اور واقعات کے ساتھ ساتھ افسانے اور لسانیات کا بھی ذائقہ ملے گا۔ صحافی، مصنف اور شاعر رضا نے کہا کہ آج لوگ موبائل، سوشل میڈیا اور ٹیلی ویژن پر زیادہ وقت صرف کرتے ہیں اور پڑھائی پر بہت کم وقت دیتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اس کتاب میں معلومات کو ایک دلچسپ انداز میں پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 23 دسمبر 2022

جمیل اختر شفیق کے شعری مجموعہ 'رقص سفر' کی رسم رونمائی کا منظر

قدرت ناظم کے شعری مجموعہ 'قوس قزح' کے اجرا کا منظر

رقص سفر

سیتامڑھی: شہر میں واقع شری رادھا کرشن گوینکا کالج سیتامڑھی کے شعبہ اردو سیمینار ہال میں ضلع کے مشہور شاعر وادیب جمیل اختر شفیق کے شعری مجموعہ 'رقص سفر' کی رسم رونمائی کی تقریب عمل میں آئی جس کی صدارت پروفیسر رام نریش پنڈت رمن پرنسپل ایس آر کے کالج سیتامڑھی اور نظامت ڈاکٹر محمد ثناء اللہ صدر شعبہ اردو ایس آر کے کالج سیتامڑھی نے کی۔ اس موقع پر مشہور ناقد وشاعر ڈاکٹر نسیم احمد نسیم نے کہا کہ جمیل اختر شفیق ایک مقبول شاعر کی حیثیت سے اردو دنیا میں جانے جاتے ہیں وہ کسی لفظ کو اپنی شاعری میں اس طرح پیش کرتے ہیں کہ شاعری سے دلچسپی رکھنے والا کوئی بھی شخص ان کی شاعری کو پڑھ سکتا ہے اور ان کے اشعار کو کافی دنوں تک یاد رکھ سکتا ہے۔ ڈاکٹر ثناء اللہ نے کہا کہ جمیل اختر شفیق کا شعری مجموعہ 'رقص سفر' معاشرتی حوالے اور سماجی دستاویز کی اہمیت کا حامل ہے، ان کی شاعری نئی روایتوں کی غماز اور نئی نسل کے جذبات و احساسات کی ترجمان ہے۔ ایم الیف حسن قاسمی نے کہا کہ جمیل اختر شفیق کی شاعری نہایت ہی سنجیدگی اور متانت کی شاعری ہے، جو بھی ان کے کلام کو پڑھتا ہے وہ ان کا گرویدہ ہو جاتا ہے۔ شاعر و افسانہ نگار آصف کریم نے کہا کہ جمیل اختر شفیق نئی نسل کے نمائندہ شاعر ہیں، وہ اپنی شاعری کے توسط سے سماج کو جو پیغام دے رہے ہیں وہ لائق ستائش ہے، جمیل اختر شفیق کی شاعری آج کے برق رفتار دور کی خوبصورت عکاسی کرتی ہے۔ راشد فہمی نے کہا کہ جمیل اختر شفیق ایک فرض شناس معلم ہونے کے ساتھ خوش گلو شاعر، ادیب، شعلہ بار مقرر، بے باک ناظم جیسی خوبیوں سے بھی لیس ہیں۔

پریس ریلیز: 26 دسمبر 2022

قوس قزح

ناندورہ: علامہ اقبال لائبریری ناندورہ میں 18 دسمبر 2022 کو وودربھ کے معروف شاعر قدرت ناظم کے دوسرے شعری مجموعہ قوس قزح کی رسم اجرا عمل میں آئی۔ اس موقع پر ایک عظیم الشان مشاعرے کا انعقاد کیا گیا۔ پروگرام کی صدارت نور پاتوروی صاحب نے فرمائی۔ مصطفیٰ جمیل (بالاپور) اور افسانہ نگار محمد علیم اسماعیل نے بطور مہمان خصوصی شرکت کی۔ شعری مجموعہ قوس قزح کی رسم اجرا مشہور شاعر مصطفیٰ جمیل کے ہاتھوں ہوئی۔ رسم اجرا کے بعد مشاعرے کا باقاعدہ آغاز ہوا۔ قدرت ناظم، مصطفیٰ جمیل، نور پاتوروی، فاروق رضا، عزیز ملکاپوری، شارق نایاب، ڈاکٹر مجیب الرحمٰن، ارشاد ناظم، یاسین زاہد، خبیب تابش، نوید اطہر، عاقب ضمیر، نفیس احمد نفیس، متین طالب، انور قریشی، اور راحیل انجم نے اپنا کلام پیش کر کے سامعین کو محظوظ کیا۔ نظامت کے فرائض مشہور شاعر شارق نایاب نے بحسن وخوبی انجام دیے۔ پروگرام اثر فاؤنڈیشن ناندورہ کے زیر اہتمام منعقد کیا گیا۔ جس کے کنوینر نوجوان شاعر اظہر عاطف تھے۔

پریس ریلیز: محمد علیم اسماعیل، مہاراشٹر 20 دسمبر 2022

پھول، خوشبو اور میں

نئی دہلی: حلقہ تشنگان ادب کی 550 ویں شعری وادبی نشست (آئی ٹی او) نئی دہلی پر واقع انورت بھون میں منعقد ہوئی، جس کی صدارت علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں اپنی خدمات سے سبکدوش ہوئے استاذ شاعر ڈاکٹر الیاس نوید گنوری نے کی اور نظامت حلقہ کے سکریٹری دھرم ویر دھیر سیماب سلطانپوری نے کی۔ نشست کے آغاز میں ابھرتی ہوئی شاعرہ سیما شرما میرٹھی کے دیوناگری رسم الخط میں شائع شعری مجموعہ 'پھول خوشبو اور میں' کا رسم اجرا بھی عمل میں آیا۔ تقریب رونمائی میں شامل صدر ڈاکٹر الیاس نوید گنوری وناظم سیماب سلطانپوری کے ساتھ شاعرہ سیما شرما، ان کے شریک سفر روبندر کمار شرما، ادیب وصحافی حبیب سیفی، آشیش سنہا قاصد، ہدایت بدایونی اور ساز دہلوی بھی شریک تھے۔ شاعری کے تناظر میں گفتگو کرتے ہوئے سیما شرما میرٹھی کے استاذ ڈاکٹر الیاس نوید گنوری نے کہا میں ادب میں تذکیر وتانیث یا کسی بیجا موازنے کا قائل نہیں، لیکن یہ کہنے کا حق ہے کہ سیما شرما کی نسوانی شاعری نے اپنا ایک مقام بنالیا ہے، ان کی شاعری میں فنی عیوب مشکل سے ملیں گے۔ سیماب سلطانپوری نے کہا کہ آپ کو غزل کا روایتی پیرہن زیادہ پسند ہے اور اپنی غزل کو نفاست سے سنوارا ہے۔ اس موقع پر دیگر شرکا نے بھی سیما شرما کو مبارکباد پیش کی۔ نشست میں ڈاکٹر الیاس نوید گنوری، سیماب سلطانپوری، شکیل شفائی، حبیب سیفی، ڈاکٹر رانا گنوری، راجندر کلکل اور ہدایت بدایونی نے اپنا کلام پیش کیا۔

روزنامہ 'انقلاب'، 20 دسمبر 2022

جہاں دیدہ

بارہ بنکی: 'خیال فاؤنڈیشن' کے زیر اہتمام بارہ بنکی کے معروف شاعر صغیر نوری کی ساتویں کتاب 'جہاں دیدہ' کی رسم رونمائی کے کے اسپتال، واقع بڑیل نہر کے عالی شان ہال میں پورے تزک واحتشام کے ساتھ ہوئی۔ اس علمی وادبی تقریب کی صدارت ضلع کے بزرگ استاد شاعر رہبر تابانی نے کی جب کہ بحیثیت مہمان خصوصی خانقاہ شاہ عبدالرحمٰن کے سجادہ صوفی سید اظہار علی اور بطور مہمان اعزازی الحاج نصیر انصاری اور ہاشم علی ہاشم شریک ہوئے۔ مہمانان ذی وقار میں عالمی شہرت یافتہ شاعر واصف فاروقی، ڈاکٹر مخمور کاکوروی، راجا (ممبر اترپردیش اردو اکادمی)، پرویز احمد، محمد موسیٰ خاں اشانت، طارق جیلانی، ڈاکٹر ایس ایم حیدر، محمد خالد صدیقی صبرحدی اور حافظ عبدالسمیع بنارس کے اسمائے گرامی قابل ذکر ہیں۔ نظامت کے فرائض خوش فکر شاعر شکیل گیاوی نے انجام دیے۔ تقریب کے دولہا صغیر نوری، نیز صدر اور مہمان خصوصی کے علاوہ واصف فاروقی اور امیر حمزہ اعظمی نے بھی خطاب کیا۔ اس موقع پر ڈاکٹر انور حسین خاں نے اپنے گراں قدر مقالہ میں صغیر نوری کی پوری علمی و ادبی شخصیت کا احاطہ کیا۔ صدر تقریب رہبر تابانی نے کہا کہ ضلع بارہ بنکی کے علم و ادب کا ماضی جتنا شاندار تھا حال بھی اتنا ہی تابناک ہے۔ ماضی میں قاسم شاہ بینا، سرور بارہ بنکوی، قرار بارہ بنکوی، چودھری معین الدین عارف سے عزیز بارہ بنکوی، پنڈت ہنومان پرساد عاجز تک جو ادبی کہکشاں بکھری پڑی ہے اسی روشنی کو صغیر نوری آگے بڑھا رہے ہیں۔ ان کا شعری مجموعہ کلام 'جہاں دیدہ' ان کی بہترین شاعری کا عکاس ہے

جس سے اہل علم و دانش ضرور مستفید ہوں گے۔ مہمان خصوصی سید اظہار علی نے کہا کہ صغیر نوری کوئی عام شاعر نہیں ہیں۔ سماج کی عمومی آئینہ داری کے ساتھ تصوف کے امتزاج نے ان کی شاعری کو مختلف بنا دیا۔ ان کی ساتویں تخلیق پر میں انھیں مبارکباد پیش کرتا ہوں۔

روزنامہ 'صحافت' دہلی، 13 دسمبر 2022

نوبل انعام یافتہ کیلاش ستیارتھی کی کتاب کا اجرا

نئی دهلی: نامور فلمی اداکار انوپم کھیر نے امن کے نوبل انعام یافتہ کیلاش ستیارتھی کی غلامی اور اذیت میں قید 12 بچوں کی سچی کہانیوں پر مبنی کتاب کا اجرا کیا اور کہا کہ یہ کہانیاں اندھیرے، مایوسی، ناانصافی، ظلم اور انسانیت کے خلاف لوگوں کو انسانیت کی فتح کا یقین دلائیں گی۔ مسٹر کھیر نے کانسٹی ٹیوشن کلب میں منعقدہ ایک تقریب میں اس کتاب کا اجرا کیا۔ مسٹر کھیر نے بچپن بچاؤ مہم کے معروف کارکن مسٹر ستیارتھی کو مہاتما گاندھی کی طرح ایک سادہ اور متاثر کن شخصیت قرار دیتے ہوئے کہا کہ انھوں نے ہمارے سماج کے حقیقی ہیرو پیدا کیے ہیں اور اس کتاب میں درج ہر کہانی کے ذریعے سماج کو روشن کیا۔ اس کتاب کا اجرا راج کمل پرکاشن اور انڈیا فار چلڈرن کے مشترکہ زیر اہتمام کانسٹی ٹیوشن کلب آف انڈیا میں کیا گیا۔ پروگرام سے ٹھیک پہلے بچوں کے گروپ گیت ہم نکل پڑے ہیں اور نعروں نے ماحول کو جوش وخروش سے بھر دیا۔ اس دوران بچوں نے ہر بچے کا حق ہے، روٹی کھیل پڑھائی پیار کا نعرہ بلند کیا۔ اس کے بعد نامور اداکار انوپم کھیر، مسٹر ستیارتھی، مسٹر سومیدھا کیلاش، راج کمل پرکاش کے مینیجنگ ڈائرکٹر اشوک مہیشوری اور کتاب کے مرکزی کردار اور سابق چائلڈ مزدوروں نے کتاب کا اجرا کیا۔

روزنامہ 'اخبار مشرق' دہلی، 9 دسمبر 2022

اردو جرنل کے تازہ شمارے کا اجرا

پٹنہ: شعبۂ اردو پٹنہ یونیورسٹی سے شائع ہونے والا ریسرچ جرنل یونیورسٹی کا اہم ترین جریدہ ہے، اس کی ترقی، معیار اور شہرت کو محفوظ رکھنا ضروری ہے۔ ان

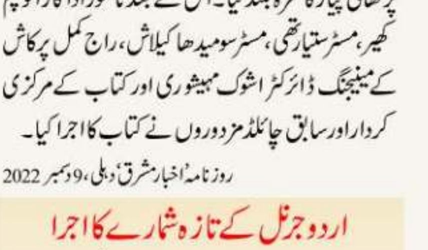

خیالات کا اظہار پٹنہ یونیورسٹی کے وائس چانسلر پروفیسر گریش کمار چودھری نے اردو جرنل کے تازہ شمارے کی رسم اجرا انجام دیتے ہوئے کیا۔ انھوں نے شعبۂ اردو کے صدر ڈاکٹر شہاب ظفر اعظمی سے جرنل کے معیار میں اضافہ کے لیے اسے بین الاقوامی سطح پر متعارف کرانے کی گزارش کی اور کہا کہ اس کے ادارتی بورڈ میں دیگر ممالک کے اردو دانشوروں کو بھی شامل کرنے کی کوشش کی جائے۔ واضح ہو کہ شعبۂ اردو پٹنہ یونیورسٹی سے گذشتہ بارہ سال سے شائع ہونے والے سالانہ تحقیقی جریدہ 'اردو جرنل' کے تازہ شمارے کی رسم اجرا انجام دی گئی جس میں وائس چانسلر پٹنہ یونیورسٹی کے علاوہ جرنل کے مدیر ڈاکٹر شہاب ظفر اعظمی، آئی کیو اے سی کے ڈائرکٹر پروفیسر بریندر پرساد، شعبۂ اردو مگدھ مہیلا کالج کے صدر ڈاکٹر سورج دیو سنگھ اور صدر شعبۂ اردو پٹنہ کالج ڈاکٹر بالمیکی رام نے شرکت کی۔ پروفیسر بریندر پرساد نے جرنل کے تازہ شمارے کا استقبال کرتے ہوئے اس کی یو جی سی کیئر لسٹ میں شمولیت کو ایک اہم قدم بتایا اور دوسرے شعبوں کو بھی اپنے جرنل کی اشاعت اور یو جی سی سے منظور کروانے کی ترغیب دی۔

اردو جرنل کے مدیر اور صدر شعبۂ اردو پٹنہ یونیورسٹی ڈاکٹر شہاب ظفر اعظمی نے بتایا کہ اردو جرنل کا تازہ شمارہ اردو صحافت کے خصوصی گوشے کے ساتھ شائع ہوا ہے جب کہ ایک مختصر گوشہ آزادی کے امرت مہوتسو میں شرکت کی علامت کے طور پر بھی محفوظ کیا گیا ہے۔ طلبہ اساتذہ اور ریسرچ اسکالرز کے لیے مختلف تحقیقی وتنقیدی مضامین بھی اس شمارے کی زینت ہیں۔ تقریباً تین سو صفحات پر مشتمل یہ شمارہ اس لیے بھی خاص ہے کہ اب اردو جرنل کو یو جی سی کی منظور شدہ کیئر لسٹ میں بھی شامل کر لیا گیا ہے، لہٰذا اس کی اہمیت خصوصی طور پر اردو اساتذہ اور ریسرچ اسکالرز کے لیے بہت زیادہ ہے۔

شہاب ظفر اعظمی، شعبۂ اردو پٹنہ یونیورسٹی، 8 دسمبر 2022

سیما

علی گڑھ: انجمن محبان اردو علی گڑھ کے زیر اہتمام خیابانِ ادب ثمر ہاؤس دھرا علی گڑھ میں سہ ماہی 'سیما' (جنوری تا مارچ) علی گڑھ کے تازہ شمارے کا اجرا عمل میں آیا۔ اس موقعے پر سہ ماہی 'سیما' کے مدیر اور معروف تنقید نگار سابق صدر شعبۂ اردو علی گڑھ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ پروفیسر صغیر افراہیم نے کہا کہ یہ مجلّہ مسلسل ادب کے حوالے سے خدمات انجام دے رہا ہے اس سلسلے سے ہماری کوشش ہمیشہ یہ رہتی ہے کہ ہم اس کو عصر حاضر کے ادب سے زیادہ سے زیادہ جوڑے رکھیں۔ اسی لیے ہم اس میں عصر حاضر کے معروف قلمکاروں کو جگہ دینے کے ساتھ ساتھ نئے لکھنے والوں کی بھی حوصلہ افزائی کرتے ہیں اور ان کی بہترین اور معیاری تخلیقات کو اپنے پرچے میں جگہ دیتے ہیں جن میں شاعری، ناول، افسانے کے کالم کو ہم تخلیقی ادب کے عنوان سے شائع کرتے ہیں۔ اس کے علاوہ اس رسالے میں ترجمہ، انٹرویو اور سائنسی مضامین، رپورتاژ، خاکے، انشائیے، سفرنامے بھی شامل ہوتے ہیں۔ ساتھ ہی اس میں تحقیقی وتنقیدی مضامین بھی رہتے ہیں۔ اس شمارے کی خصوصیت یہ ہے کہ ہم نے اس میں معروف ناول نگار اور جے سی بی ایوارڈ یافتہ پروفیسر خالد جاوید کا گوشہ شامل کیا ہے جس میں ان کے مشہور ناول نعمت خانہ پر سیر حاصل گفتگو کی گئی ہے۔ اس موقعے پر الہدایہ کالج کے ڈائرکٹر پروفیسر کنور آصف نے کہا کہ یوں تو میرا میدان کیمسٹری ہے لیکن میرے خانوادے کا ہر فرد اردو سے محبت کرتا ہے۔ مجھے اس رسالے نے بہت متاثر کیا ہے۔ اس پروگرام میں ڈاکٹر وصی بیگ بلال، محمد عادل فراز، ذوالفقار زلفی، محمد افضل، ثنا فاطمہ نے بھی اپنے خیالات کا اظہار کیا اور شعری تخلیقات بھی پیش کیں۔

روزنامہ 'میرا وطن'، دہلی، 2 جنوری 2022

منتشر افکار

نئی دهلی: غالب اکیڈمی نئی دہلی میں نارنگ ساقی کی کتاب 'منتشر افکار' کا اجرا اہم ترین ادبی شخصیات کے ہاتھوں عمل میں آیا۔ کنور مہندر سنگھ بیدی ٹرسٹ کی جانب

سے منعقدہ اس تقریب میں کتاب کا اجرا کرتے ہوئے پروفیسر اختر الواسع نے کہا کہ میں نے بہت خاموشی سے کے ایل نارنگ ساقی کو پڑھا ہے۔ انھوں نے تقسیم ہند کو دیکھا ہی نہیں جھیلا ہے۔ وہ کسی گروہ سے وابستہ نہیں ہوئے، بلکہ وہ سب کے ہیں سب ان کے ہیں۔ چندر بھان خیال نے اظہار خیال کرتے ہوئے کہا کہ نارنگ ساقی کا کردار اردو کا ہی کردار ہے، وہ مخلص انسان ہیں۔ وہ شاعر نہیں ہیں مگر سیکڑوں شعرا پر بھاری ہیں۔ پروفیسر شہزاد انجم نے کہا کہ نارنگ ساقی دہلی کی تمام ادبی محفلوں میں شرکت کرتے ہیں، ان کا پورا معاملہ عشق کا ہے۔ کنور مہندر سنگھ بیدی پر ان کے مضامین عشق کی داستان ہیں۔ ان کی زبان بہت اچھی ہے، ادب کا صاف ستھرا ذوق رکھتے ہیں۔ ڈاکٹر خالد علوی نے کہا کہ نارنگ ساقی نے

منتشر افکار شمس الرحمٰن فاروقی اور گوپی چند نارنگ دونوں کے نام معنون کیا ہے۔ نارنگ ساقی کے تعلق سب سے تھے۔ منتشر افکار کے مضامین میں تحقیق اور تنقید دونوں کا عنصر ہے۔ جب وہ مزاح نگاروں کی فہرست تیار کرتے ہیں تو اس میں کوئی قلم نہیں لگا سکتا۔ معصوم مرادآبادی نے کہا کہ ادیبوں کی خوش کلامیاں نارنگ ساقی کا بڑا کارنامہ ہے، وہ ہند و پاک دونوں جگہ مقبول ہیں۔ سہیل انجم نے کہا کہ وہ ادب نواز ہی نہیں خود ادیب بھی ہیں۔ رہنمائے تعلیم جدید کے بند ہونے کی نوبت آئی تو نارنگ نے بڑھ کر اسے تھام لیا اور اس کے جاری رہنے کا بندوبست کیا۔ اسد رضا نے کہا کہ نارنگ ساقی اردو کا پکارنگ ہیں۔ عازم کوہلی نے کہا کہ نارنگ ساقی ادب نواز بھی ہیں اور ادیب نواز بھی ہیں۔ صدارت کرتے ہوئے شاہد مہدی نے کہا کہ نارنگ ساقی نے اپنی کتاب میں کم معروف لوگوں پر لکھا ہے جو بڑی بات ہے۔ ڈاکٹر عقیل احمد نے کہا کہ نارنگ ساقی نے طالب علمی کے زمانے میں ایک پرچہ ساقی کے نام سے نکالا تھا۔ پرچہ تو جلد ہی بند ہوگیا لیکن نارنگ صاحب نے اسے اپنے نام کا جز بنالیا؟ کرشن لال نارنگ ساقی ان کا پورا نام ہوگیا۔ دہلی میں شاعروں اور ادیبوں کی مہمان نوازی کی وجہ سے ساقی کے اصل مفہوم میں پہچانے گئے، لیکن صحافت کے دامن کو چھوڑ نہیں سکے۔ آج بھی رہنمائے تعلیم جدید کے اعزازی مدیر ہیں۔ اس موقعے پر نارنگ ساقی کے اہل خانہ کے ساتھ بڑی تعداد میں دہلی کے صحافی و ادیب موجود تھے، جن میں معین شاداب، یامین انصاری، شمس الہدیٰ، سرفراز فراز، احترام صدیقی، نعمان خان، شفا کجگانوی، چشمہ فاروقی، نسیم بیگم نسیم، عزیزہ مرزا، ٹی این بھارتی، کیلاش وششٹھ، انمیش شرما، رؤف رامش کے اسمائے گرامی شامل ہیں۔ آخر میں نارنگ ساقی نے شکریہ ادا کیا۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 3 جنوری 2022

روح کے زخم

رامپور: رضا لائبریری کے میٹنگ ہال میں منعقدہ ایک خصوصی تقریب کے دوران ڈاکٹر ارشاد ندوی المعروف ندا نوگانوی کے شعری مجموعہ روح کے زخم کی رسم اجرا عمل میں آئی۔ ڈاکٹر شریف احمد قریشی سابق صدر شعبہ اردو گورنمنٹ رضا پی جی کالج رامپور کے زیر صدارت منعقدہ رسم اجرا تقریب میں مہمان خصوصی کی حیثیت سے شعبہ اردو دہلی یونیورسٹی کے پروفیسر ڈاکٹر ظہیر رحمتی نے شرکت کی جب کہ نظامت کے فرائض ڈاکٹر تبسم صابر نے بحسن وخوبی انجام دیے۔ اس موقعے پر تقریب کے مہمان خصوصی ڈاکٹر ظہیر رحمتی نے کہا کہ ڈاکٹر ارشاد ندوی المعروف ندا نوگانوی کی شاعری میں رس و دھونی کے عمل جلوہ گر ہیں۔ وہ جذبات کو شاعری میں ڈھالنے کا سلیقہ جانتے ہیں۔ ڈاکٹر شریف احمد قریشی نے اپنے صدارتی خطاب میں ڈاکٹر ندا نوگانوی کے شعری مجموعہ روح کے زخم پر گفتگو کرتے ہوئے کہا کہ ان کی روح کے زخم سخت کوشی اور صبر آزما مراحل کے عطا کردہ ہیں۔ ان کے نئے پرانے زخم تیر و خنجر کے نہیں بلکہ اپنوں کی بے اعتنائی اور ناکامی عشق کی مرہون منت ہیں۔ ان کی شاعری سماجی ناانصافی، بدعنوانی، سیاسی پراگندگی، استحصال اور عدم تحفظ کے اعتبار سے بھی قابل غور وفکر اور صالح معاشرہ کی تشکیل کے لحاظ سے بھی قابل توجہ ہے۔ اس سے قبل عتیق جیلانی سالک ریٹائرڈ لائبریری اسسٹنٹ رضا لائبریری نے اپنا مقالہ ندا نوگانوی اپنی شاعری کے آئینے میں پیش کرتے ہوئے کہا کہ وہ اپنے دل کی بھٹی میں شعری جذبات کو آتشیں سیال میں ڈھالتے رہتے ہیں اور پھر جب ان کے احساسات کو زبان مل جاتی ہے تو ہر شعر سے شرارے اٹھتے نظر آتے ہیں۔ اس میں محبت کی زیریں لہریں مل کر ایک نیا انداز قاری کے سامنے پیش کردیتی ہیں۔ لائبریری کارکن شازیہ حسن نے روح کے زخم ایک مطالعہ کے عنوان سے اپنا پرمغز تحقیقی مقالہ پیش کیا۔

روزنامہ 'اخبار مشرق' دہلی، 3 جنوری 2023

احمد رضا ہاشمی کی کہانیوں کے دو مجموعے 'دریچہ' اور 'ایسا کیوں' کا اجرا

احمد رضا ہاشمی کی کہانیوں کے دو مجموعے 'دریچہ' اور 'ایسا کیوں' کا اجرا

پٹنہ: جواں سال صحافی احمد رضا ہاشمی کی کہانیوں کے دو مجموعے 'دریچہ' (اردو) اور ایسا کیوں؟ (ہندی) کی رسم اجرا قومی تنظیم کے مدیر اور اردو ایکشن کمیٹی کے صدر ایس ایم اشرف فرید، مشہور افسانہ نگار اور بہار اردو اکیڈمی کے سابق سکریٹری مشتاق احمد نوری، اور ہندی کے ادیب اور صحافی ڈاکٹر دھرو کمار نے مشترکہ طور پر انجام دی۔ رضا کار سماجی ادارے سورانجلی کے زیر اہتمام منعقدہ تقریب کی نظامت کا فریضہ سینئر صحافی ڈاکٹر ریحان غنی نے انجام دیا۔ اپنی صدارتی تقریر میں ایس ایم اشرف فرید نے کہا کہ احمد رضا ہاشمی نے اپنی کہانیوں کے دونوں مجموعوں میں موجودہ حالات کی عکاسی کی ہے۔ مشتاق احمد نوری نے کہا کہ ہاشمی نے اپنی کہانیوں میں بہت اعتماد کے ساتھ افسانے لکھے ہیں اور سماج کی سچائی کو اجاگر کیا ہے۔ احمد رضا ہاشمی نے بھی اپنی کہانیوں میں جو سچائیاں پیش کی ہیں وہ قابل غور ہیں۔ ڈاکٹر دھرو کمار نے کہا کہ احمد رضا ہاشمی نے جو دیکھا اور محسوس کیا اس کو انھوں نے کہانیوں کا جامہ پہنایا۔ نقیب کے مدیر اور مشہور عالم دین مفتی محمد ثناء الہدیٰ قاسمی نے کہا کہ احمد رضا ہاشمی نے اپنی کہانیوں میں بکھرتے سماجی تانے بانے کو جوڑنے کی کوشش کی ہے۔ جے پرکاش یونیورسٹی چھپرہ کی صدر شعبۂ ہندی ڈاکٹر انیتا راکیش نے کہا کہ احمد رضا ہاشمی کی کہانیاں دل و دماغ کے دریچے کھولتی ہیں۔ جیسس اور میری اکیڈمی کی پرنسپل پوجا این شرما نے کہا کہ ہاشمی صاحب کی کہانیوں کو بچوں کو بھی پڑھانا چاہیے کیونکہ یہ کہانیاں ذہن پر مضبوط نقش چھوڑتی ہیں۔ اس سے قبل اپنے استقبالیہ کلمات میں اپنی کہانیوں کے دونوں مجموعوں کے مصنف احمد رضا ہاشمی نے کہا کہ نئی قومی تعلیمی پالیسی کے تحت اخلاقی قدروں کو فروغ دینے کے لیے اسکول کے نصاب میں شامل کرنے کی ضرورت ہے۔ تقریب کا اختتام سرفراز عالم کے اظہار تشکر پر ہوا۔

روزنامہ 'ہندوستان ایکسپریس' دہلی، 12 دسمبر 2022

وفیات

پروفیسر رحمٰن راہی

سرینگر: کشمیری زبان کے معروف شاعر، مترجم، نقاد اور درجنوں کتابوں کے مصنف پروفیسر رحمٰن راہی 9 جنوری 2023 کو انتقال کرگئے۔

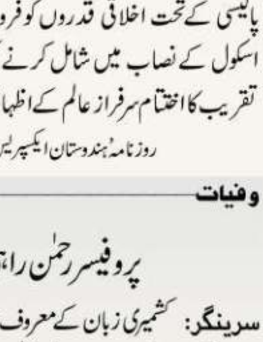

98 سالہ راہی ایک طویل عرصے سے علیل تھے۔ انھوں نے سرینگر کے وڑار ناگ علاقے میں اپنے گھر پر اپنی آخری سانس لی۔ گیان پیٹھ ایوارڈ یافتہ شخصیت پروفیسر راہی کو علم وادب

کے شعبے میں غیر معمولی خدمات انجام دینے کی وجہ سے کشمیری معاشرے میں عزت وتکریم کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا۔ ان کی خدمات کے عوض انھیں مختلف حکومتوں اور سرکاری و غیر سرکاری اداروں کی طرف سے درجنوں اعزازات سے نوازا گیا ہے، جن میں سب سے بڑا اعزاز گیان پیٹھ تھا، جو انھیں سال 2008 میں اس وقت کے وزیر اعظم ڈاکٹر منموہن سنگھ کے ہاتھوں سے دیا گیا۔ وہ پہلے اور اب تک کے آخری کشمیری ادیب تھے، جنھیں ادب کے شعبے میں اپنی خدمات کے عوض ملک کا یہ سب سے بڑا اعزاز ملا ہے۔ راہی کو 1961 میں ان کے شعری مجموعے 'نوروز صبا' کے لیے ساہتیہ اکادمی ایوارڈ اور سال 2000 میں پدم شری ملا۔

راہی نے گزشتہ نصف صدی کے دوران درجنوں کتابیں لکھیں اور درجنوں کتابوں کے ترجمے کیے ہیں۔ اس کے علاوہ انھوں نے بطور مدرس اپنی زندگی میں سیکڑوں طلبہ و طالبات اور اسکالرز کی رہنمائی کی ہے۔ پروفیسر رحمٰن راہی سال 1925 میں سرینگر کے ایک متوسط گھرانے میں پیدا ہوئے تھے اور انھوں نے اپنے کیریئر کی شروعات 1948 میں ایک سرکاری محکمے میں بطور کلرک ملازمت کرتے ہوئے کی۔ اس زمانے میں وہ وادی سے شائع ہونے والے ایک معروف اردو روزنامے 'خدمت' میں بطور سب ایڈیٹر بھی کام کرتے رہے۔ اسی زمانے میں پروفیسر رحمٰن راہی وادی میں ترقی پسند مصنّفین کی ایسوسی ایشن کے عہدیدار بھی رہے۔ وہ 1953 سے 1955 تک دہلی میں اردو روز.نامہ آجکل کے ادارتی بورڈ میں رہے۔ بعد ازاں 1950 کی دہائی میں راہی نے فارسی اور انگریزی زبانوں میں ماسٹرز کیا اور کشمیر یونیورسٹی میں بطور استاد تعینات ہوئے۔ وہ طلبہ و طالبات کو فارسی پڑھاتے تھے اور بعد ازاں اسی یونیورسٹی کے 'شعبۂ کشمیری' کے سربراہ کی حیثیت سے ریٹائرڈ ہوگئے۔ انھوں نے کشمیری زبان کے رسم الخط کے گرامر میں جدید زمانے کے تناظر میں ترمیم و اضافہ کرنے کے حوالے سے بھی کافی کام کیا ہے۔ وہ پہلے کشمیری استاد ہیں جنھیں کشمیر یونیورسٹی نے پروفیسر ایمریٹس کا درجہ دیا۔ پروفیسر راہی ادبی تقریبات اور شعر و شاعری کی محفلوں میں اپنے مخصوص اور جاندار لب و لہجے کی وجہ سے سب کو متوجہ کرتے تھے۔ پروفیسر عبدالرحمٰن راہی کے پسماندگان میں تین بیٹے اور ایک بیٹی ہیں۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 10 جنوری 2022

شموئل احمد

پٹنہ: مشہور افسانہ و ناول نگار شموئل احمد کا نوئیڈا میں 25 دسمبر کو انتقال ہوگیا۔ وہ ایک عرصے سے بیمار تھے۔ ان کی عمر تقریباً 77 برس تھی۔ پسماندگان میں ایک بیٹی اور دو

بیٹے ہیں۔ ذرائع کے مطابق اپنے انداز کے نرالے اور بے باک افسانہ نگار شموئل احمد نے صبح نوئیڈا میں آخری سانس لی۔ شموئل احمد 4 مئی 1945 کو بھاگلپور میں پیدا ہوئے تھے۔ سول انجینئرنگ کی ڈگری حاصل کی اور حکومت بہار کے شعبہ پبلک ہیلتھ انجینئرنگ میں چیف انجینئر کے عہدے سے ریٹائر ہوئے۔ انھیں بہترین فکشن نگاری کے لیے عالمی فروغ اردو ادب دوحہ، قطر 2012 کے انعام سے نوازا گیا تھا۔ انھیں بچپن ہی سے ادبی ذوق رہا۔ چھٹی ساتویں جماعت ہی سے طبع آزمائی کرنے لگے تھے لیکن باضابطہ اشاعت کا سلسلہ 1970 کے آس پاس شروع ہوا جو چار پانچ سال تک چلتا رہا اس کے بعد چار پانچ سال تک خاموشی رہی، اس کے بعد پھر لکھنا شروع کیا جو ہنوز جاری تھا۔ اب تک ان کی تمیں کہانیاں شائع ہوچکی ہیں۔ وہ اردو کے علاوہ ہندی میں بھی کہانیاں لکھتے تھے۔ 'سنگھاردان' جیسی کہانی کے خالق شموئل احمد اپنے منفرد اسلوب اور بے باک لہجے کے لیے جانے جاتے تھے۔ ان کے ہر افسانے میں ایک نیا تجربہ اور نئی حسیت کارفرما نظر آتی ہے۔ شموئل احمد کے افسانوں کا ترجمہ انگریزی کے علاوہ ہندوستان کی دوسری زبانوں میں بھی ہوچکا ہے۔ پنجابی میں ان کے نمائندہ افسانوں کا انتخاب 'مرگ ترشنا' شائع ہوا۔ شموئل احمد ٹیلی اسکرپٹ بھی لکھتے تھے۔

روزنامہ 'میرا وطن' دہلی، 26 دسمبر 2022

نعیم کوثر

ممبرا: اردو کے ممتاز سینئر کہانی کار 87 سالہ نعیم کوثر 6 جنوری 2023 کی صبح بھوپال کے ایک ہسپتال میں انتقال کر گئے۔ نعیم کوثر 15 دسمبر 1936 کو مدھیہ پردیش کے بیگم گنج (ضلع رائے سین) میں اپنے وقت کے مشہور

افسانہ نگار کوثر چاند پوری کے ہاں پیدا ہوئے تھے، جن کا نام سید محی الدین اختر رکھا گیا جو بعد میں قلمی نام 'نعیم کوثر' سے معروف و مشہور ہوئے۔

نعیم کوثر نے 1957 میں آگرہ یونیورسٹی سے بی کام کیا تھا اور مدھیہ پردیش ہاؤسنگ بورڈ کے ایڈمنسٹریٹیو افسر کے عہدے سے 1994 میں سبکدوش (ریٹائر) ہوئے۔ نعیم کوثر نے 1941 میں بچوں کے لیے کہانیاں لکھیں جو اس وقت کے بچوں کے رسائل میں چھپیں، انھوں نے بچوں کے لیے ایک ناولٹ 'ہونہار شہزادہ' بھی لکھا تھا جو 1949 میں حیدرآباد کے ہاشمی پبلشنگ ہاؤس نے شائع کیا تھا، مرحوم نے 'بچوں کی تقریریں' بھی رقم کیں اور بچوں ہی کے لیے بھوپال سے 'جگنو' نامی 1959 میں ایک رسالہ بھی جاری کیا تھا۔

نعیم کوثر کی پہلی کہانی 'تشنگی' دہلی کے ماہنامہ 'جمالستان' میں شائع ہوئی تھی۔ نعیم کوثر کے والدِ محترم کوثر چاند پوری اپنے زمانے کے مشہور طبیب اور فکشن نگار تھے، کہانی کا فن نعیم کوثر کو ورثے میں ملا تھا، انھوں نے چھ سَو سے زائد کہانیاں لکھیں اور اردو کے اکثر ممتاز رسائل میں ان کی تخلیقات شائع ہوتی رہیں، ان کی کہانیوں کا پہلا مجموعہ 'خوابوں کا مسیحا' 1999 میں منظر عام پر آیا۔ انھوں نے بھوپال سے ایک پندرہ روزہ اخبار 'صدائے اُردو' بھی جاری کیا تھا۔

اِدھر ایک عرصے سے ضیق النفس (دمہ) میں مبتلا تھے۔ گزشتہ دنوں انھیں فالج جیسے موذی مرض نے آدبوچا تو بھوپال کے ایک ہسپتال میں موصوف کو داخل کیا گیا جہاں انھیں وینٹی لیٹر پر رکھا گیا بالآخر ایک عشرے بعد نعیم کوثر نے آخری سانس لی۔ ان کے پسماندگان میں بیوہ کے ساتھ دو بیٹیاں اور ایک بیٹا ہے، شکر ربی ان کی تینوں اولادیں اعلا تعلیم یافتہ ہیں۔ ایک بیٹی اپنے دادا کی طرح طِب سے وابستہ ہے جو ماہر چشم ڈاکٹر ہے اور بڑی بیٹی ایم ایس سی ہے اور لکچرار ہے جبکہ بیٹا نوید کوثر بینکنگ کے شعبے میں ایک اچھی ملازمت سے متعلق ہے۔

نعیم کوثر کی کہانیوں کے کوئی سات مجموعے طبع ہوکر مقبول ہوئے جن کے نام اس طرح ہیں: خوابوں کا مسیحا، کال کوٹھری، رگِ جاں کا لہو، اقرار نامہ، اگنی پرکشا، آخری بات اور کہرے کا چاند۔ آخرالذکر مجموعہ مدھیہ

پردیش اردو اکادمی نے شائع کیا تھا۔ نعیم کوثر کو مدھیہ پردیش گورنمنٹ کا موقر ترین ایوارڈ 'شکھر سمان' بھی دیا گیا۔ وہ ہندی اُردو دونوں زبانوں کے ادب کے شائقین میں عزت و وقار کی نگاہ سے دیکھے جاتے تھے۔

نعیم کوثر کا آبائی وطن تو مغربی یوپی کا چاند پور (بجنور) تھا مگر ان کی زبان اور لب و لہجے، حرکات و سکنات (باڈی لینگویج) میں بھوپالی رنگ و ڈھنگ رچا بسا نہیں۔ بلکہ ایک طرح سے فطری تھا۔ بعد نمازِ ظہر بھوپال کے سیفیہ کالج قبرستان میں اُن کے جسدِ خاکی کو سپردِ لحد کیا گیا۔ اس موقع پر بھوپال کے اکثر اہل علم اور ادب دوستوں کے ساتھ تمام شعبۂ حیات کے عام و خاص اشخاص موجود تھے۔

بشکریہ: ندیم صدیقی، ممبئی، 7 جنوری 2023

خراج عقیدت

ڈاکٹر احمد علی برقی اعظمی کو خراج عقیدت

نئی دهلی: ڈاکٹر احمد علی برقی اعظمی کے انتقال پر ملال پر غالب اکیڈمی میں ایک تعزیتی جلسے کا انعقاد کیا گیا جس کی صدارت ڈاکٹر جی آر کنول نے کی۔ انھوں نے اظہار تعزیت کرتے ہوئے کہا کہ برقی صاحب کی موت میرے لیے خبر نہیں صدمہ تھا۔ وہ خاندانی شاعر تھے۔ ان کا مزاج سیکولر تھا۔ انھوں نے تمام مذہب کے رہنماؤں پر لکھا، ان کے یہاں کسی قسم کا لالچ نہیں تھا۔ انھوں نے اردو کے فروغ کے لیے شاعری کی۔ اس موقعے پر معین شاداب نے اظہار خیال کرتے ہوئے کہا کہ وہ معصوم آدمی تھے۔ سب کا خیال کرتے تھے۔ وہ ایک کردار تھے، زود گوئی بسیار گوئی ان کی کمزوری نہیں خوبی تھی۔ اردو میں اب کوئی برقی پیدا نہیں ہوگا۔ ادیبوں اور شاعروں کی موت پر لکھے گئے ان کے اشعار پوری دنیا میں حوالے کے طور پر پیش کیے جاتے ہیں۔ فاروق ارگلی نے خراجِ عقیدت پیش کرتے ہوئے کہا کہ برقی اعظمی بہت لکھتے تھے۔ ہر طرح کی شاعری کرتے تھے، مشکل بھی اور آسان بھی، ایک ردیف کئی شاعر میں ان کا کلام قابل رشک ہے، ان کی زود گوئی عیب نہیں ہنر تھا وہ فن کے ماہر تھے، ان کی کلاسیکی شاعری کا جواب نہیں، موضوعاتی شاعری

کرنے والا اب ہند و پاک میں کوئی دوسرا نظر نہیں آتا۔ یامین انصاری نے کہا کہ برقی صاحب بے لوث انسان تھے۔ ان سے میری زیادہ ملاقات نہیں تھی لیکن میری کتاب کے اجرا کے موقعے پر شاندار نظم پیش کی۔ اس موقعے پر سہیل انجم نے کہا کہ وہ جس قدر قابل اور باصلاحیت تھے اسی قدر منکسر المزاج بھی تھے۔ وہ جیسے باہر تھے ویسے ہی اندر بھی تھے۔ پروفیسر ابن کنول نے اظہار تعزیت کرتے ہوئے کہا کہ فیس بک سے ان کے انتقال کی خبر ملی یقین نہیں ہوا۔ کچھ دیر پہلے ان کی پوسٹ پر مبارکباد دی کا میسج بھیجا تھا۔ انتقال کی پوسٹ دیکھ کر حیرت ہوئی۔ ڈاکٹر ابرار رحمانی، شعیب رضا وارثی، ذہینہ صدیقی، اسلم جاوید، محمد خلیل، انا دہلوی نے بھی اظہار تعزیت کیا۔ اس موقعے پر متین امروہوی، شفا کجگاؤنوی اور زاہد علی خاں اثر نے تعزیتی اشعار پیش کیے۔

روزنامہ 'صحافت' دہلی، 12 دسمبر 2022

Subscription Form "Urdu Duniya"

سالانہ خریداری فارم

میں 'اردو دنیا' کا رکی سالانہ خریدار بننا چاہتا رچاہتی ہوں۔

150 روپے کا ڈرافٹ/ منی آرڈر............................ بتاریخ.. بنام National Council for Promotion of Urdu Language منسلک ہے۔

میں نے زرِتعاون سالانہ -/150 روپے A/C: 90092010045326، IFSC: CNRB0019009 میں جمع کروادیا ہے۔

آپ 'اردو دنیا' ایک سال کے لیے اس پتے پر بھجوائیں:

نام : ....

....

پتہ : ....

....

دستخط

اس فارم کو درج ذیل پتے پر بھیج دیں:

Sales Department: NCPUL, West Block 8, Wing7, RK Puram, New Delhi - 110066

فون: 011-26109746 فیکس: 011-26108159, E-mail.: magazines@ncpul.in

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کی چند مطبوعات

کلیات رشید احمد صدیقی جلد 8 (مضامین)

ترتیب وتدوین: ابوالکلام قاسمی

پہلی اشاعت: 2022

صفحات: 510

قیمت: 235 روپے

عہدِ وسطیٰ کا ہندوستان (حصہ اول)

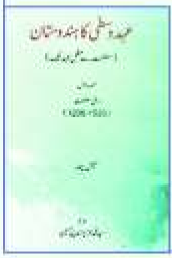

مصنف: ستیش چندر

مترجم: سید محمد عزیز الدین حسین

دوسری طباعت: 2022

صفحات: 348، قیمت: 170 روپے

حالی کی نظمیں

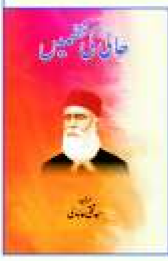

مرتب: سید تقی عابدی

پہلی اشاعت: 2022

صفحات: 66+262

قیمت: 160 روپے

کلیات راجندر سنگھ بیدی (جلد اول)

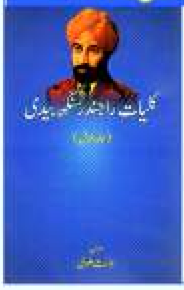

مرتب: وارث علوی

دوسری اشاعت: 2022

صفحات: 970

قیمت: 425 روپے

اردو ڈراما: تاریخ وتجزیہ

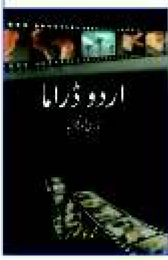

مصنف: محمد کاظم

پہلی اشاعت: : 2022

صفحات: 686

قیمت: 300 روپے

نظری تنقید: مسائل ومباحث

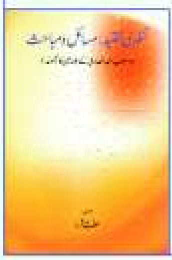

مرتبہ: عفت آرا

دوسری اشاعت: 2022

صفحات: 233

قیمت: 125 روپے

تشریح البدن (جلد دوم)

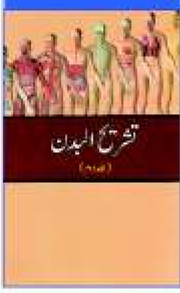

پہلی اشاعت: 2022

صفحات: 460

قیمت: 215 روپے

تاریخ طب یونانی (جلد اول)

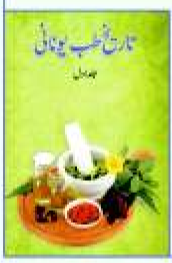

پہلی اشاعت: 2022

صفحات: 448

قیمت: 220 روپے

شعبۂ فروخت: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، ویسٹ بلاک 8، ونگ 7، آر کے پورم، نئی دہلی-110066

فون: 011-26109746 فیکس: 011-26108159، E-mail: books@ncpul.in

उर्दू दुनिया, मासिक, फरवरी-२०२३,वर्ष:२५, अंक:०२

URDU DUNIYA Monthly, February-2023, Vol.25, Issue:02

National Council for Promotion of Urdu Language

Ministry of Education, Department of Higher Education, Government of India

RNI NO. 70323/99

DL (S) - 01/3394/2023-25

ISSN 2249 - 0639

Date of Publication:**24/01/2023**

Date of Dispatch : 25 & 26 of advance month

Total Pages:100

سوچھ بھارت

ایک قدم صفائی کی جانب

اردو زبان میں علم و آگہی کا معتبر ادبی جریدہ

قومی اردو کونسل کی منفرد پیشکش

اردو زبان وادب سے متعلق اہم تنقیدی و تحقیقی موضوعات پر فکر انگیز اور تلاش و جستجو کو صحیح سمت دینے والے مواد کے ساتھ ہر تین ماہ بعد منظرِ عام پر آنے والا نہایت سنجیدہ علمی مجلّہ خود بھی پڑھیں اور دوسروں کو بھی پڑھنے کا مشورہ دیں!

ہندستانی خریداروں کے لیے سالانہ قیمت: 100 روپے، فی شمارہ: 25 روپے

بنام NCPUL اکاؤنٹ نمبر: A/C: 90092010045326، IFSC: CNRB0019009 میں جمع کریں۔

شعبۂ فروخت: قومی کونسل برائے فروغِ اردو زبان، ویسٹ بلاک 8، وِنگ 7، آر کے پورم، نئی دہلی-110066

فون: 011-26109746، فیکس: 011-26108159، E-mail : sales@ncpul.in

شاخ : 110-7-22، تھرڈ فلور، ساجد یار جنگ کمپلکس بلاک نمبر 5-1، پتھر گٹی، حیدرآباد-500002 فون: 24415194 - 040

(قومی اردو کونسل کی ویب سائٹ، http://www.urducouncil.nic.in پر بھی دستیاب)

Printed and Published by Dr. Aquil Ahmad, Director NCPUL, on behalf of National Council for Promotion of Urdu Language, and printed at S.Narayan and sons, B-88 Okhla Indl. Area Phase II. New Delhi-110020
And Published at Farogh-E-Urdu Bhawan FC-33/9 institutional Area Jasola New Delhi-110025

LPC DELHI,DELHI PSO,DELHI RMS,DELHI-6